

خانقاہ حرمکے نام پر

خانقاہوں میں تعلیم کے لیے ایک مفید کتاب

فہم التصوف



مؤلف

حضرت شیخ سید شبیر احمد کا خیل صاحب

مستر شہ حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی

مجاز بیعت حضرت شیخ صوفی محمد اقبال صاحب و دیگر اکابر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فہم التصوف

مؤلف

حضرت شیخ شہیر احمد کا کا خیل صاحب

مسترشد

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی

خليفة مجاز

حضرت صوفی محمد اقبال

حضرت احمد عبدالرحمن صدیقی

حضرت سید تنظیم الحق حلیمی

حضرت سید میاں بشیر کا کا خیل

حضرت ڈاکٹر فردا محمد

حضرت مولانا عبدالغفار

حضرت حاجی عبدالمنان

حضرت میاں جمل قادری

حضرت مولانا سید فی رفاعی جیلانی ندوی

خانقاہ رحکارہ لہلہ، مکان نمبر 1/1991-CB گلی نمبر 4 نزد آشیانہ چوک

بلدقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ اشرف لین اللہ آباد، ویسٹرنج 3، راوہلپنڈی

خانقاہ رحکارہ لہلہ کی فون نمبر: 051-5470582، 0332 5289274

انتساب

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام بالخصوص اور تمام مجددین رحمۃ اللہ علیہم کے نام بالعموم، جن کی کوششوں سے تصوف، جو کہ اصلاحِ نفس، قلب و عقل ہے اور جس کے ذرائع وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ ان مقاصد کے لیے ایک مؤثر نظام تربیت ثابت ہوا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ اس صدی کے مجدد ہیں اس لیے ان کی کتابوں سے اس میں زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہزار سال پر محیط اثر ہمیشہ اس سلسلے میں تابندہ رہے گا۔

اللہ تعالیٰ سارے اکابر رحمۃ اللہ علیہم کے مرقدوں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

نام کتاب: فہم التصوف

مؤلف: حضرت شیخ سید شبیر احمد کا کاخیل صاحب مدظلہ العالی

صفحات: 364

اشاعت دوم: (ربیع الاول، 1446 ہجری، بمطابق تبوک، 1402 شمسی ہجری،

بمطابق ستمبر، 2024 عیسوی)

کتاب ملنے کا پتہ:



خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ:

مکان نمبر: CB1991/1: چوہڑ چکی سٹاپ نزد آشینہ چوک، گلی نمبر 4 بالمقابل
جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ، اللہ آباد، ویسٹریج 3، راولپنڈی

فون نمبر: (0332-5289274) - (051-5470582)

صفحہ نمبر	فہرست موضوعات
5	تقریظ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب سورتی مدظلہ
6	تقریظ حضرت شیخ ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ
7	تقریظ حضرت شیخ حاجی عبدالمنان کی صاحب مدظلہ
8	تقریظ حضرت مولانا سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی ندوی مدظلہ
9	تقریظ حضرت مولانا عبدالرؤف لاجپوری صاحب مدظلہ
10	تقریظ شیخ الحدیث حضرت مفتی سید جاوید حسین صاحب نور اللہ مرقدہ
11	تقریظ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد طاہر وادی صاحب مدظلہ
12	تقریظ مفتی اعظم جنوبی افریقہ شیخ الحدیث حضرت مفتی رضاء الحق صاحب دست برکاتہم
14	دیباچہ
18	تصوف کا ایک مختصر تعارف
19	ثبوت
22	تصوف کا بنیادی مقصد
23	تصوف کی ایک علیحدہ فن کے طور پر ضرورت
25	تصوف متنازعہ کیوں ہے؟
26	علمی اشکالات کا جواب
29	غالی صوفیا کو جواب
31	تصوف کی چند مفید اصطلاحات
55	تربیت کا انحصار تین چیزوں کی اصلاح پر
55	مقامات سلوک
58	ایک اہم بات
58	صرف نفس کی اصلاح پر نظر رکھنا
58	اگر صرف دل کی اصلاح ہو تو!

99	حاصلِ مطالعہ	59	اگر صرف عقل کی اصلاح ہو تو!
100	سالمک کے لیے مفید کتب	60	سلوک کا مجاہدہ
102	فقیر سے متعلق حضرات کے لیے ابتدائی ہدایات	62	صحبتِ صالحین کے فائدے
104	اعمال	64	ضرورتِ شیخ
104	اخلاق	65	مشائخ سے کیا پوچھنا چاہیے؟
114	سلبی اعمال (اخلاقِ رزیلہ)	67	شیخِ کامل کی پہچان
115	حبِ دنیا	69	مناسبتِ شیخ
119	حُبِ جاہ	69	شیخِ کامل کی صحبت کے فائدے
121	حبِ باہ	71	بیعتِ طریقت
123	حبِ مال	72	تمام سلسلوں کا ادب
124	اخلاقِ رزیلہ کی قسمیں اور ان کا علاج	73	حقیقتِ بیعت
125	حرص	74	بیعت کرنے کا طریقہ
127	شہوت	75	بیعت کے وقت تعلیم
129	غصہ	76	فنا فی الشیخ ہونا
132	جھوٹ	81	دو طرح کا فنا فی الشیخ
133	غیبت	82	مرشد کے حقوق
135	حسد	83	شیخ اور مرید کا تعلق
137	بخل	84	شیخ کا مقام
139	ریا	85	تصوف کے سلسلے
141	عُجب	88	چاروں سلسلوں کے مشائخ کے اسمائے گرامی
143	خود رائی	88	شجرہ اور اس کی اہمیت
144	تکبر	88	بندہ کی نسبت
151	توحید	93	امورِ تصوف

220	عبدیتِ کاملہ	153	اخلاص
224	رضائے الہی	156	توبہ
229	غیر مقصود	160	محبت
229	ذرائع	164	شوق
229	منصوص ذرائع	166	انس
231	غیر منصوص ذرائع	166	خوف
233	مجاہدہ	169	رجا
261	فاعلہ	170	زُہد
261	ذکر	172	توکل
295	شغل	174	تقاعدت
302	مراقبات	174	حلم
312	انوارات اور ان کی علامات	175	صبر
319	تصورِ شیخ	178	شکر
321	عشقِ مجازی	181	صدق
323	سماع	183	تواضع
326	تواضع یعنی احوال (Side effects) کا بیان	184	تفویض
327	وہ احوال جن میں نقصان کا اندیشہ نہیں	186	رضا
327	اجابتِ دعا	188	فنا
328	الہام	189	دُعا
328	رویائے صالحہ	196	خشوع
330	فراستِ صادقہ	204	تبلیغ
331	فنا	212	حکمر
332	بقا	214	تقویٰ
332	وجد	220	اعمال کے ثمرات (نتائج)

		334	شکر کے بغیر وحدۃ الوجود
		335	جن احوال میں نقصان کا اندیشہ ہے
		335	استغراق
		336	تصرف و تاثیر المعروف بہ توجہ
		337	شکر
		340	مشاہدہ
		341	کرامت
		342	کشفِ الہی
		342	کشفِ کونی
		343	وحدۃ الوجود شکر کے ساتھ
		343	موانع
		343	تصنع
		345	تعمیل
		347	حُسن پرستی
		350	مخالفتِ سنت
		352	مخالفتِ شیخ
		354	خواطر (خیالات)
		361	ہاجس
		361	خاطر
		362	حدیثِ نفس
		362	ہم
		362	عزم
		363	اجازت
		363	شرائطِ اجازت

تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب سورتی صاحب مدظلہ

استاد الحدیث دارالعلوم لسٹر، خلیفہ مجاز محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہر دوئی رحمۃ اللہ علیہ

بِسْمِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى شَأْنُهُ

بخدمت محترم المقام جناب الحاج الشاہ شبیر احمد صاحب آدامَ اللہُ فِیْ وَضَعِکُمْ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بعد سلام مسنون۔ طالب خیر مع الخیر ہے۔

ایک ہفتہ قبل آپ کی کتاب ”فہم التصوف“ بندہ کو موصول ہوئی۔ بندہ تو آپ کو
کئی برس قبل ”فہم الفلکیات“ سے جانتا تھا اور اس کی وجہ سے آپ کے علمی ذوق کا قائل
تھا۔ پھر ایک سال قبل آپ کی کئی کتابیں سلوک و تصوف، تزکیہ و احسان کے موضوع
پر پڑھ کر نہ صرف واقف ہوا بلکہ اپنے ناقص خیال میں آپ کو طریق باطن کا شہسوار
پایا اور اب ماشاء اللہ ”فہم التصوف“ تو میرے نزدیک اس موضوع پر انتہائی شافی اور
کافی مجموعہ ہے۔ کوئی شک نہیں آپ نے بہت تفصیل اور عمدگی سے مسائل تصوف و
سلوک کو بیان کیا ہے اور ان شاء اللہ طالب حق کے لیے یہ کتاب اکسیر ثابت ہوگی۔
اللہ تعالیٰ آپ کو بہت جزائے خیر دے، اس علمی روحانی شاہکار کو قبولیت سے مالامال
فرمائے اور طالبین کو اس سے خوب منتفع فرمائے۔

میں یقیناً اس کتاب پر کسی قسم کی تقریظ کہنے کا نہ اہل ہوں، نہ صلاحیت رکھتا ہوں۔
اس طریق کی الف با سے بھی واقف نہیں ہوں، صرف بزرگوں کی نسبت کا سہارا ہے
اور حدیث شریف کا ایک طالب علم ہوں۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مجھے اخلاص عطا فرمائے
اور اپنی رضا سے مالامال فرمائے۔

مطالعہ میں کہیں کہیں چند معمولی غلطیاں کمپیوٹر پر کمپوزنگ کی نظر آئی ہیں۔
حاشیہ پر نشان لگا دیا ہے۔ معافی کی درخواست ہے۔ والسلام

محتاج دعا

محمد ایوب سورتی عَفِیْ عَنِّہُ

از مجلس دعوة الحق لسٹر، یو کے

یکم ربیع الاول 1439ھ دو شنبہ

تقریظ: حضرت شیخ ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ

خلیفہ مجاز حضرت اقدس شیخ مولانا محمد اشرف خان سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر پر اللہ کا احسان ہے کہ ہزار صدی کے بعد مقام مجددیت کے لیے یہ خطہ قبول ہوا۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہزار صدی کے بعد مجدد الف ثانی کے عظیم خطاب کے ساتھ امت محمدیہ کے سامنے آئے اور ان کا فیض پوری دنیائے اسلام میں پھیلا۔ بارہویں صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہوئے۔ جب کہ تیرہویں صدی سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی۔ چودھویں صدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے آباد ہوئی۔ ان سارے حضرات نے اسلامی تعلیمات کو اپنے اپنے ادوار میں بیان فرما کر امت محمدیہ پر عظیم احسان فرمایا۔ فارسی کے ناپید ہونے کے بعد اور آج کے دور کی کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد انگریزی ایسی چھا گئی کہ اردو کی استعداد بہت کمزور ہو گئی۔ اس دور کے لیے حضرات اکابرین کی تعلیمات کو نئے سرے سے آسان زبان میں جدید مثالوں اور اصطلاحات کے ساتھ بیان کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ الحمد للہ شبیر صاحب نے اسی طرز پر ان علوم کو بیان کر کے نئی نسل پر احسان کیا ہے۔ مجموعہ ”فہم التصوف“ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب کو قبول فرمائے اور اس کو ہمارے بزرگوں کے فیوض و برکات کے پھیلنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین

تقریظ: حضرت حاجی عبد المنان صاحب مکی مدظلہ

خلیفہ مجاز حضرت اقدس شیخ مولانا محمد اشرف خان سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و حضرت مولانا قمر زمان الہ آبادی دامت برکاتہم

نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِكَ الْكَرِيمِ: اللہ تعالیٰ ہمارے عزیز بھائی شبیر کا کاخیل کو جزائے خیر دے، انہوں نے تین آئمہ تصوف کی بہت باریک باتوں کو عام فہم انداز میں آگے بڑھایا ہے اور جس کی ضرورت بھی تھی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے تھے کہ لوگوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ جو اس میں علم ہے وہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے کہ ان کی کتاب کو انہوں نے آگے بڑھایا ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا اونچا مقام ہے جو ہمارے اکابرین دیوبند میں ہیں۔ ہماری ساری سندیں ان لوگوں سے چلتی ہیں حدیث کی بھی اور تصوف میں بھی ان کا بہت اونچا مقام تھا اور پھر ہمارے دور میں ان دونوں کے شارح ہیں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں حضرات کی تعلیمات کو خوب حکیمانہ انداز میں شرح کر کے عام فہم انداز میں پہنچایا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید تفصیلات کی یقیناً ضرورت رہتی ہے۔ اللہ ہمارے عزیز کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اس کوشش کو قبولیت عام عطا فرمائے اور لوگوں کے لیے نافع بنائے اور ہم سب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

بمقام بیت اللہ شریف مکہ مکرمہ

25 ذوالحجہ 1438

تقریظ: حضرت مولانا سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی ندوی مدظلہ

خلیفہ مجاز

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نور اللہ مرقدہ
و مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید شبیر احمد کا کاخیل دامت برکاتہم کی تصنیف ”فہم التصوف“
علم تصوف کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ بطور خاص سالکینِ طریقت کے لیے اس کا مطالعہ
ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والادامت برکاتہم کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

طالب دعا

شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی
جیلانی

(سجادہ خانوادہ قادریہ رفاعیہ ہند)

محررہ، مسجد نبوی، مدینہ منورہ

۱۲ رمضان المبارک، ۱۴۴۲ھ

تقریظ: حضرت مولانا عبد الرؤف لاجپوری صاحب مدظلہ

خلیفہ مجاز حضرت مسیح الامہ مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ

محترم و مکرم الحاج سید شبیر احمد صاحب مدظلہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اللہ تعالیٰ شانہ سے آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔

بندہ (عبد الرؤف لاجپوری) کو آپ کی کتاب فہم التصوف موصول ہوئی، جزاکم

اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

کتاب میں تصوف کو آسان الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور تصوف کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تصوف کے ضروری ضروری امور کو شامل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً تصوف کا تعارف، اس کا ثبوت، اس کا بنیادی مقصد، مناسبت شیخ، شیخ کامل کی پہچان، شیخ کامل کی صحبت کے فائدے، حقیقت بیعت شیخ اور مرید کا تعلق وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ شانہ قبول فرمائے اور اس کے نفع کو عام اور تام فرمائے۔ آمین۔

بندہ (عبد الرؤف) کو اپنی دعاؤں میں یاد فرمائیں۔ والسلام

عبد الرؤف لاجپوری، باٹلی

۲ شعبان المعظم، 1444ھ

تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مفتی سید جاوید حسین شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ
شیخ الحدیث جامع عبیدیہ فیصل آباد

خلیفہ مجاز حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحبزادہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تَحْمَدًا وَنُصَبِّحُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ أَمَّا بَعْدُ: محترم و مکرم جناب سید شبیر احمد صاحب کاکانہیل دامت برکاتہم العالیہ کی دو کتابیں ”لطائف کی حقیقت“ اور ”فہم التصوف“ کا بعض مقامات سے سماع کیا ماشاء اللہ مفید پایا۔ دونوں کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ اکابر امت خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے مواد جمع کر کے تسہیل و اختصار کے ساتھ اچھے انداز میں دونوں کتابیں مرتب فرمائی ہیں۔ اس دور میں اس کی ضرورت بھی ہے کیونکہ لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ کچھ تو سرے سے تصوف کا انکار کرتے ہیں اور کچھ لوگوں نے غلو کرتے ہوئے اس کو شریعت سے ہی جدا کر دیا ہے حالانکہ تصوف عین شریعت ہے یعنی شریعت پر اخلاص سے عمل پیرا ہونا اور مرتبہ احسان تک پہنچنا، یہی تصوف ہے۔ مولف محترم نے اس مسئلہ کو احسن انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں کتابیں متلاشیانِ حق کے لیے نافع ہوں گی۔ اللہ پاک شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے فیوض و برکات کو عام و تمام فرمائے، ان کی جملہ مساعی جمیدہ کو قبول فرما کر اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے۔

أَمِينٌ بِجَاهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ عَلَىٰ آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

محتاج دعا جاوید حسین عفا اللہ عنہ

عبیدیہ فیصل آباد

9 جمادی الاولیٰ 1444ھ

تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مفتی صوفی محمد طاہر وادی صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث دارالعلوم العربیہ الاسلامیہ بری، انگلینڈ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى - اَمَّا بَعْدُ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے فرمایا کہ تصوف کی ابتدا اخلاص سے ہے اور اس کا منتہی احسان پر ہے۔ حضرت شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”ہمارا یہ طریق یعنی تصوف مستنبط ہے قرآن اور سنت سے“ بعض مشائخ نے فرمایا کہ ”تصوف کے پانچ اصول ہیں: (۱) اللہ سے ڈرنا ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ (۲) سنت کا اتباع اقوال اور افعال میں۔ (۳) اللہ پر توکل اور مخلوق کی طرف نظر نہ کرنا ہر کام میں۔ (۴) اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا ہر قلیل اور کثیر میں۔ (۵) اللہ کی طرف رجوع کرنا خوشحالی میں بھی اور بدحالی میں بھی“

تصوف کی اتنی اہمیت کے باوجود افسوس کہ بہت سے لوگ اس کے مقاصد اور اصطلاحات سے ناواقف ہیں۔ ہمارے محترم و مکرم حضرت سید شبیر کا کاخیل صاحب مدظلہ العالی نے تصوف اور اس کے مقاصد و اصطلاحات کے بارے میں آسان زبان میں مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کتاب ”فہم التصوف“ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس کتاب سے افادہ عام ہو اور ان کے فیوض و برکات کو عام و تمام فرمائے۔ آمین

والسلام محمد طاہر

(بلیکبرن، برطانیہ)

تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہ

مفتی اعظم جنوبی افریقہ، شیخ الحدیث دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ

خلیفہ مجاز حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّيْ عَلَى رَسُوْلِكَ الْكَرِيْمِ وَعَلَىٰ اٰلِهِ وَصَحْبِهِ۔ اَمَّا بَعْدُ:

جناب محترم سید شبیر احمد کاکاخیل سے بندہ عاجز کی شناسائی بہت پرانی ہے۔ بہت عرصہ پہلے یعنی جنوبی افریقہ جانے سے پہلے محترم موصوف کے ساتھ گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اسی زمانے میں مولانا موصوف فلکیات کے علم میں مشہور تھے اور نمازوں کے اوقات خصوصاً عشا اور فجر صادق کے سلسلہ میں جناب محترم سے علما و طلباء استفادہ کرتے رہتے۔ حضرت محترم فجر صادق میں 18 درجہ زیر افق کے قائل تھے اور ہم بھی اسی نظریے کے حامل تھے۔ جنوبی افریقہ جانے کے بعد حضرت موصوف سے ملاقات یاد نہیں۔ 33 سال مجھے جنوبی افریقہ میں ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان آنا جانا بھی بکثرت ہوتا ہے۔ اس طویل عرصہ میں ہمارا اور ان کا حال ایسا ہے جو ایک فارسی شعر میں بیان ہو چکا ہے۔

ما و مجنوں ہم سبق
بودیم در دیوان عشق

او بصرہ رفت من
در کوچہ ہا رسوا شدم

اس طویل عرصہ میں حضرت محترم تصوف کے سلاسل کی صحرا انوردی فرما کر درجہ کمال تک پہنچ گئے اور ہم ایسے رہ گئے جیسے تھے۔ پھر بندہ عاجز کو اس پر تعجب ہوا کہ تصوف کے جن مسائل اور اصطلاحات کے سمجھنے میں علمائے کرام اور محققین حضرات سرگرداں و پریشان رہتے تھے اور ذہنی نارسائی کی وجہ سے ان کے چھونے سے ہاتھ بھی کتراتے ہیں۔ حضرت مؤلف نے ان مسائل اور مشکلات کی گتھیاں سلجھائیں۔ انہوں نے اپنے رسائل میں تحریر فرمایا اور زبانی بھی مجھے بتلایا کہ یہ سب کچھ غیبی اشارہ سے ہوا۔ جس کو دوسرے الفاظ میں ہم نور ولایت یا علم لدنی کہہ سکتے ہیں۔ علمائے کرام کہتے ہیں کہ علم کے 6 درجات ہیں۔ شعور، علم،

معرفت، تفقہ، حکمت، علم لدنی۔ اسی علم لدنی کا تو جواب نہیں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ اسماعیل شہید، شاہ ولی اللہ اور حضرت کا صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کے علوم اور اصطلاحات اور علم تصوف کے حقائق کی تشریح کے لیے محنت و جدوجہد کے علاوہ غیبی اشارات بھی درکار ہیں۔

پھر حضرت محترم کے سینہ میں جو معرفت کا چشمہ اہل رہا ہے اس کے اظہار کے لیے نثر کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی وسیع بنایا۔ پشتو شاعری کے بارے میں جو انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ پشتو نثر کے مشہور صاحب فن شاعر روغ لیونے کے ساتھ رہے ہیں۔ انہوں نے پشتو شاعری میں اپنے قارئین کو گہرائی اور دقت کے کرب میں مبتلا کرنے سے محفوظ کیا، لیکن اشعار کی نہر سے قارئین کو صاف شفاف معرفت کا پانی ضرور پہنچایا اور ان کو سیراب کیا۔

موصوف نے اردو شاعری میں اپنے مافی الضمیر کو خوب ادا فرمایا، البتہ بندہ عاجز کا مشورہ ہے کہ اردو اشعار کسی ماہر فن کی نظر سے گزر جائیں تاکہ اوزان کی اچھی طرح تصحیح ہو جائے۔ حضرت سید شبیر کا کاخیل حفظہ اللہ تعالیٰ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ متعدد مشائخ سے ان کو سلاسل کی اجازت حاصل ہے اور امام التصوف مفکر اسلام قائد انقلاب حضرت مولانا اشرف خان سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی استفادہ فرمایا اور ان کی دعائیں لوٹ لی ہیں۔ بندہ عاجز نے حضرت شبیر صاحب کے متعدد رسائل شاہراہ معرفت، حقیقت توحید و رسالت، حقیقت جذب و سلوک، فہم الفکیات، پیغام محبت وغیرہ سے استفادہ کیا اور ان کو مفید پایا۔ وحدۃ الوجود اور اس کے مقابلے میں وحدۃ الشہود کی تشریح بھی فرمائی جو بندہ عاجز کے الفاظ میں وحدت التوجہ الی اللہ ہے۔ مخلوق میں رہتے ہوئے اس کے وجود کو مانتے ہوئے التفات اور توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، یہ وحدۃ الشہود ہے۔ ایک مطلب وحدۃ الشہود کا یہ بھی ہے کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی قدرت پر شاہد اور گواہ ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے اور امت کے لیے نافع بنائے اور موصوف کو صحیح معنوں میں حضرت کا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کا شارح بنائے اور ان کے ذریعہ سے ان کے رفیع القدر خاندان کی عزت کو مزید بڑھائے۔

رضاء الحق

شاہ منصور صوابی

مدرس دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ

17 شوال، 1441 ہجری

رضوانہ علیہ السلام

دیباچہ

اَحْمَدُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْمُرْتَبِي الْكَرِيْمِ:
اَمَّا بَعْدُ، فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۱﴾ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبہ: 119]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔“

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت کے سچوں کے ساتھ بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تقویٰ بھی نصیب فرمائے۔ آمین

تصوف دین کا ایک ایسا شعبہ ہے کہ اس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے اس سے کوئی بھی دیندار مستغنی نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء کی سنت ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اس لیے ہر ایک پر لازم ہے کہ اس کے بنیادی مقاصد تک رسائی حاصل کرے۔ جہاں تک اس کے ذرائع کا تعلق ہے تو ان ذرائع سے جب تک اصل مقاصد پورے ہو رہے ہوں تب تک ان میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جب ان سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جن کا تصوف میں حاصل کرنا ضروری ہے۔ تو پھر ان ذرائع کے ساتھ چمٹنے میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔ ان کو ایسا بدلنا کہ ان سے مقصود حاصل ہو، ضروری ہو جاتا ہے۔

اس شعبے کا چونکہ باطن کے ساتھ تعلق ہے جس کا ہر ایک کو پتا نہیں چلتا، اس لیے اس میں دو طرح کے غیر پسندیدہ تغیرات اکثر و بیشتر وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جن کی پیش بندی اس فن کے ذمہ داروں کے ذمے لازمی ہوتی ہے۔ ان میں پہلا تغیر ان لوگوں کی وجہ سے آتا ہے جو جان بوجھ کر تصوف کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سفلی مقاصد اس بگاڑ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ لیکن اپنے سفلی مقاصد کی وجہ سے اس کا اقرار نہیں کرتے اور مخلوق خدا کو دین سے برگشتہ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ان لوگوں کی طرح ہیں جن کو قرآن میں ”الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ“ (وہ لوگ جن پر اللہ جل جلالہ کا غضب نازل ہوا) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی صحبت سے ہر مؤمن کو بچائے۔ کیونکہ

یہ ایمان کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اولیائے کرام کی باتوں کی غلط تعبیریں کرتے ہیں اور قرآن و سنت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ مثلاً: وحدت الوجود کے نام پر شرک اور معرفت کے نام پر الحاد پھیلا رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا تغیر ان لوگوں کی وجہ سے آتا ہے جو تصوف کے اصل مفہام سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ لوگ سنی سنائی باتوں کو بغیر تحقیق کیے پھیلاتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ مقاصد کو ذرائع اور ذرائع کو مقاصد بنا دیتے ہیں۔ اس طرح نظریاتی طور پر تصوف کو ”کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی“ کی عملی تصویر بنا دیتے ہیں اور عملی طور پر ”دعوے بڑے اور عمل کم“ کے مصداق بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کو قرآن کریم میں ”الضَّالِّیْنَ“ (گمراہ) کہا گیا۔ یہ لوگ قابلِ رحم ہیں کیونکہ یہ گمراہ ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ گمراہ ہیں۔ اگر ان کو کوئی ایسا ولی کامل مل جائے جن سے ان کو مناسبت ہو تو ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور خوش عقیدہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد اپنے مقصود تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پہلا گروہ ان کو بہت آسانی کے ساتھ اپنا آلہ کار بنا لیتا ہے۔

انہی دو گروہوں کے مقابلے میں ایک ایسا تیسرا گروہ بھی وجود میں آیا ہے جو اخلاص کے ساتھ تصوف کو خلافِ سنت سمجھ کر اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی قابلِ رحم ہیں۔ ان تک بھی تصوف کی صحیح تعبیر نہیں پہنچائی گئی ہے۔ اگر کوئی ان کو تصوف کے بارے میں صحیح بات ان کی زبان میں پہنچائے تو یہ بھی قابلِ اصلاح ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی گمراہ ہیں۔ کیونکہ یہ نبی ﷺ کے کاموں میں سے ایک کام کی اپنی غلط فہمی کی وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر ان کو بھی کسی طرح یہ سمجھا دیا جائے کہ اصل تصوف وہ نہیں ہے جس کو تم تصوف سمجھ بیٹھے ہو، یعنی جو ان پہلے دونوں گروہوں کا بیان کردہ ہے۔ بلکہ اصل تصوف تو عین شریعت بلکہ شریعت کی تکمیل یا روح ہے۔ اس طرح یہ لوگ اپنی مخالفت سے باز آسکتے ہیں اور اس طرح ان کو تصوف کی برکات حاصل ہو سکتی ہیں۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو تصوف کو جانتے ہیں کہ یہ عین حق ہے۔ وہ قرآنی آیات کی تشریحات بھی جانتے ہیں اور دل میں تصوف کی اصل اس کو مانتے ہیں۔ لیکن بعض دنیاوی مقاصد کی خاطر تصوف کی مخالفت پر کمر بستہ ہوتے ہیں۔ یہ گروہ بھی پہلے گروہ کی طرح ”الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ“ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس لیے اصل

میں یہ دونوں ایک ہیں۔ پہلا گروہ تصوف کے ذریعے اسلام میں بگاڑ پیدا کر رہا ہے اور یہ آخری گروہ تصوف کا انکار کر کے امت کو اس کی برکات سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ ان دونوں کے لیے تو دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل سے حب دنیا کو ختم کر کے ان کو ہدایت سے نواز دے۔ نہ انہوں نے دلائل سننے ہیں اور نہ ماننے ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ بحث ضیاع اوقات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ البتہ دوسرا اور تیسرا گروہ، جو کہ راستہ گم کر چکے ہیں۔ ان کو راستے پر لانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان کو جیسے ہی صحیح راستے کا پتا چلے گا وہ اس پر چل کر اپنی منزل مقصود کو پالیں گے۔

یہ کتاب ان ہی دو درمیانی گروہوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں یہ کوشش کی جائے گی کہ تصوف کی اصل کو واضح کیا جائے کہ یہ اصل میں کیا ہے۔ اس کا قرآن و حدیث کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ اس کی وہ اصطلاحات جن کے مفہیم کو لوگ بگاڑ کر حقیقت سے دور چلے جاتے ہیں۔ ان کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس میں مقاصد کیا ہیں اور ذرائع کیا ہیں اور ان کا آپس میں کیا ربط ہے؟

یہ کتاب گو کہ فقیر کے الفاظ میں ہے لیکن یہ یا تو ان بزرگوں کے ملفوظات سے ماخوذ ہے جن کی صحبت میں اس فقیر نے نبوی شعبے کی الف با سیکھی ہے یا پھر ان بابرکت ہستیوں کی تحریرات سے ماخوذ ہے جنہوں نے اس صدی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس نبوی شعبے کو پھر سے نکھار کر قابل عمل بنا دیا۔ اس میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت کا کا صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، قطب ارشاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ، علامۃ الدہر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، اپنے شیخ مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے محسن حضرت صوفی محمد اقبال مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ گاہے گاہے دوسرے حضرات کی تحریریں بھی زیر نظر رہی ہیں۔ لیکن غلبہ ان کو حاصل ہے۔

فقیر کی یہ خواہش تھی کہ اس فن کے تشنگان کی اصل چشموں سے براہ راست پیاس بجھے، اس لیے فقیر کی یہ عادت رہی ہے کہ جس کو بھی تھوڑا سا دین کی طرف مائل دیکھا، اس کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے متعارف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آج کل کے انگریزی ماحول نے اور عربی لٹریچر سے دوری نے عام قاری کے ان بابرکت

ہستیوں سے براہِ راست فیض یاب ہونے کا راستہ کافی حد تک بند کر دیا ہے۔ اس لیے تعارف کے طور پر یہ کتاب ان شاء اللہ کفایت کرے گی۔ باقی یہ کس کا دعویٰ ہے کہ اس فن کے ساتھ میں نے انصاف کیا ہے۔ ہر ایک کی ہمت اور قسمت ہے کہ اپنے آپ کو کہاں تک سیراب کرتا ہے۔ فقیر کا کام ہے منزل کا تعین کرنا۔ اس پر چلنا ہر ایک کے ظرف پر منحصر ہے۔ چند اکابر نے اس پر تقاریظ لکھی ہیں۔ اس پر میں ان کا ممنون ہوں کہ ان حضرات نے مجھ ناچیز پر اعتماد فرمایا۔ لیکن یہ چونکہ ضخیم کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے دوسرے اکابر سے تقاریظ لینے میں وقت لگ سکتا تھا۔ جب کہ دوست اس کے چھپوانے کا تقاضا فرما رہے تھے۔ جو حضرات اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں وہ اپنی رائے سے ضرور نوازیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو بھی شامل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو امت کے لیے بابرکت بنادے اور جس مقصد کے لیے یہ لکھی جا رہی ہے وہ مقصد پورا ہو۔ آمین ثم آمین۔

سید شبیر احمد عَفِیٰ عَزَّ

اَحْمَدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ النَّبِيِّنَ اَمَّا
 بَعْدُ، فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾
 ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ﴿۱۰﴾ [الش: 9-10]

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے اور نامراد وہ ہوگا
 جو اس کو (گناہ) میں دھنسا دے“

تصوف کا ایک مختصر تعارف

تصوف ایک متنازعہ لفظ ہے۔ لیکن اس کا متنازعہ ہونا حقیقی نہیں بلکہ بعض
 حضرات نے نا سمجھی میں اس کے معنی غلط سمجھ لیے، لہذا اس کی افادیت سے انکار
 کر بیٹھے۔ درحقیقت کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو ظاہراً کرنے کے ہوتے ہیں
 جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اور کچھ اعمال باطناً ہوتے ہیں جن کا پتہ کسی اور کو
 نہیں چلتا۔ اس کا پتہ صرف اللہ تعالیٰ کو یا کبھی کرنے والے کو ہوتا ہے اور ان
 ہی اعمال پر ظاہری اعمال منحصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے یہ باطنی اعمال درست
 نہ ہوں تو چاہے اس کے ظاہر کے اعمال کتنے ہی درست ہوں وہ قبولیت کا درجہ
 نہیں پاتے۔ یا بعض دفعہ یہ ظاہری اعمال ان باطنی اعمال کی خرابی کی وجہ سے
 ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان باطنی اعمال کا درست کرنا بھی ضروری بلکہ اشد
 ضروری ہوا۔ سارے ظاہری اور باطنی اعمال کا انحصار تین چیزوں پر ہے: نفس،
 دل اور عقل۔ ان میں اعتدال ہو تو اعمال اچھے ہیں۔ ورنہ جتنی بے اعتدالی
 ہوگی اتنی خرابی ہوگی۔ ان تینوں میں بے اعتدالی کو اعتدال پر لانا ہر شخص کے
 لیے ضروری ہے۔ وہ طور طریقے جن کے استعمال سے کسی شخص کے ظاہری اور
 باطنی اعمال درست ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو جائیں، یہ تصوف کہلاتا ہے۔
 شریعت کے طور طریقوں کو چونکہ فقہ بھی کہتے ہیں لہذا ان معنوں میں تصوف
 کو فقہ الباطن بھی کہا جاتا ہے۔

◆ ثبوت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب پیدا فرمایا تو اس کو اپنے ارادے کا مختار بنایا اور اس میں خیر و شر دونوں طرح کے مادے رکھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۚ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ [النس: 7-8]

ترجمہ: ”اور (قسم ہے) انسانی جان کی اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری کی ہے۔“

پس جب خیر کا مادہ استعمال ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس پر فرشتے بھی رشک کرنے لگتے ہیں اور جب اس میں شر کے مادے کا پلڑا بھاری ہو جائے تو مجسم شیطان کی صورت میں بھی آجاتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [النس: 9-10]

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے اور نامراد وہ ہو گا جو اس کو (گناہ) میں دھنسا دے۔“

یعنی مادے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں دونوں رکھے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے کا اختیار انسان کو دے دیا۔ لیکن چونکہ یہ امتحان کے لیے تھا اس لیے یہ ارشاد فرمایا کہ کامیاب تو وہ ہے جو خیر کے مادے سے کام لے کر امور خیر انجام دے اور اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچائے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا مبارک ارشاد ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۖ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ﴾ [القيامة: 20-21]

ترجمہ: ”خبردار (اے کافرو) اصل بات یہ ہے کہ تم فوری طور پر حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔“

(اگرچہ یہ خطاب کافروں کو ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے یہاں عام ہے کہ جو بھی فوری چیز کے لیے اس کے نتائج کو نظر انداز کرے گا وہ اس زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے کہ عاجلہ یعنی دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔) اس کے لیے

آپ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ ہر چیز کے لیے صفائی کا آلہ ہوتا ہے اور دلوں کے لیے صفائی کا آلہ ذکر اللہ ہے۔ اس طرح قرآن پاک میں عقل مندوں کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ذکر اور فکر کرتے ہیں۔ پس اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچانے کے لیے، دل سے دنیا کی مذموم محبت نکالنے کے لیے اور عقل کو آخرت پر یقین دلانے کے لیے جو طریقے اور معمولات استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان ہی کو تصوف کہتے ہیں۔

چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمیں بغیر رہنمائی کے نہیں چھوڑا۔ اس کے لیے انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ جاری فرمایا۔ ان کے جو فرائض منصبی تھے ان میں ایک اپنی امت کا تزکیہ بھی تھا۔ تزکیہ سے مراد یہی اپنے آپ کو نفس کے شر سے بچانا ہے۔ سب سے آخر میں ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت مبارک ہوئی، جن کو قرآن عطا ہوا، جس نے تمام ادیان کی تکمیل کی اور دوسری کتابیں جن کی حفاظت کا وعدہ نہیں تھا ان پر عمل منسوخ قرار دیا گیا اور قرآن کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دے کر اس پر عمل کا مطالبہ ہوا۔ آپ ﷺ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی اس پر عمل کے لیے تیار کیا۔ آپ ﷺ نے قرآن کے مطابق اپنے فرائض منصبی کا خوب حق ادا کیا، جس کی طرف اشارہ اس آیت مبارکہ میں ہے: ﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرہ: 151]

ترجمہ: ”(یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

اس میں آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو قرآن کی آیتوں کی تلاوت سے روشناس کیا، ان کے دلوں میں لہیت پیدا فرمائی اور ان کو کتاب و سنت کی تعلیم سے بہرہ ور فرمایا اور ان کو ایسے ان گنت علوم سے روشناس فرمایا جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے۔ ان امور میں سے پہلے

تلاوتِ قرآن کی تعلیم ہے جس کی ذمہ داری بعد میں قراء حضرات نے اٹھائی۔ اس کے بعد تعلیمِ لہیت ہے جس کا ذمہ تصوف کے ماہرین نے لیا اور اس کے ساتھ کتاب و سنت کی تعلیم ہے جس کی ذمہ داری علماء امت نے اٹھائی۔ پس اعمال کی دو قسمیں ہوں گی۔ جن میں ایک اعمالِ ظاہر یا اعمالِ جوارح ہیں اور دوسرے اعمالِ باطن ہیں۔ علمِ ظاہر میں تلاوتِ قرآن اور فقہ ظاہر کے علوم آئے اور علمِ باطن میں وہ علوم آئے جن کا تعلق قلب، نفس اور عقل کی باطنی حالت و کیفیت کے ساتھ ہے۔ گو ان تمام علوم کی تدوین بعد میں ہوئی ہے۔ لیکن یہ چونکہ اصل کارِ نبوت ہیں اس لیے ان کا سلسلہ آپ ﷺ تک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلاوتِ قرآن اور تلاوتِ یا ساعتِ احادیث کے سلسلوں کی طرح تصوف کے سلسلے بھی جاری ہوئے۔ اگرچہ اس کا معروف نام تصوف ہے لیکن حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق اس کا قرآنی نام تقویٰ ہے جو کہ تمام علومِ ہدایت کا دروازہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کے بارے میں قرآن ہی میں ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرہ: 2] ”اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس عظیم الشان کتاب میں کوئی شک نہیں اور یہ متقین کے لیے ہدایت ہے“ پس ضروری نہیں کہ غیر متقین اس قرآن سے ہدایت حاصل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر متقی اساتذہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسی قرآن کے اعلیٰ مضامین کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن خود ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیثِ احسان میں اس کا نام احسان ہے۔ اس کو کوئی زُہد کہہ دے یا تقویٰ، احسان کہہ دے یا تصوف۔ اس میں کام دلوں کی صفائی اور نفس کے تزکیہ کا کیا جاتا ہے۔ دل میں کان، زبان، ناک اور ذہن کے ذریعے ہر دم جو آلودگیاں آتی ہیں ان کا تدارک اور تلافی کی جاتی ہے۔ انسان کو انسان اور مسلمان کو مسلمان بنایا جاتا ہے۔ دلوں سے تکبر، عجب، حسد، کینہ، ریا، بدگمانی، خود پسندی وغیرہ کو نکال کر اس میں تواضع، مسکینی، اخلاص، نیک گمانی، تقویٰ، توکل اور خود احتسابی پیدا کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے دل کو مادہ پرستی سے نکال کر خدا پرستی کی طرف ڈالا جاتا ہے۔ اس کو ہر دم یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانا

ہے اور جہاں جانا ہے وہاں کیا ہو گا اور اس کے لیے کیا کرنا ہے اور اس کے راستے میں نفس جو روڑے اٹکاتا ہے۔ اس نفس کو شریعت پر مطمئن کیا جاتا ہے۔ بس کرنی تو وہی شریعت کی اتباع ہے کہ ہمیں اسی کے لیے تو پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن تصوف میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا ہے۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مختصر مگر جامع تعریف بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے:

”تصوف میں ساری ریاضتیں اور کوششیں اس لیے ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دائمی تعلق حاصل ہو جائے اور ہر کام فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہونے لگے۔“

◆ تصوف کا بنیادی مقصد

مندرجہ بالا جامع تعریف میں خط کشیدہ حصہ تصوف کا بنیادی مقصد ہے۔ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے۔ کیونکہ اسی پر قرآن میں ولایت کا وعدہ ہے:

﴿تَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرہ: 112]

جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا یعنی دل کا قبلہ درست کر لیا اور سب کام اللہ تعالیٰ کے لیے کرنے لگا اور تھانگی کرنے والا یعنی شریعت پر چلنے والا تھا۔ تو اس کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائیں گے اور نہ ان کو کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ نشانی ہے ولایت کی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ [یونس: 62-63]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ اولیاء اللہ کو نہ ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ مضمون سورہ اعراف میں اور بھی وضاحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿يَبْنَئِي أَدْمَرَ

إِنَّمَا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي لَّعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٣٥﴾ [اعراف: 35]

ترجمہ: ”اور اللہ نے انسان کو پیدا کرتے وقت ہی یہ تمہیں کر دی تھی کہ اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے کچھ پیغمبر آئیں جو تمہیں میری آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے اور اپنی اصلاح کر لیں گے، ان پر نہ کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ وہ ننگین ہوں گے۔“

◆ تصوف کی ایک علیحدہ فن کے طور پر ضرورت

جیسا کہ اعمالِ ظاہر میں بعض چیزیں فرض ہیں۔ بعض واجب، بعض سنت اور بعض مستحب۔ اسی طرح اعمالِ باطن میں بھی بعض چیزیں فرض ہیں۔ بعض واجب، بعض سنت اور بعض مستحب۔ دوسری طرف اعمالِ ظاہر میں بعض چیزیں حرام ہیں۔ بعض مکروہ تحریمی ہیں اور بعض مکروہ تنزیہی۔ اسی طرح اعمالِ باطن میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں۔ بعض مکروہ تحریمی اور بعض مکروہ تنزیہی۔ اس لیے ہر چیز کا اس کے مقام کے حساب سے مطالبہ ہو گا۔ جب بڑے بڑے لوگ اعمالِ باطن کے ایک حرام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جہنم جاتے ہوں تو پھر اس سے بچنا ضروری نہیں تو کیا ہے؟ سورہ ہود میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَتْهَا نُوفًا إِلَيْهِمْ أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٦﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلَّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾﴾ [ہود: 15-16]

جو شخص (اپنے اعمالِ خیر سے) محض حیاتِ دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے (جیسے شہرت و نیک نامی و جاہ اور ثوابِ آخرت حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو) تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی (یعنی دنیا ہی میں ان کے اعمال کے عوض ان کو نیک نامی اور صحت و فراغ، عیش و کثرت

اموال و اولاد عنایت کر دیے جاتے ہیں۔ جب کہ ان کے اعمال کا اثر ان کے اَضداد پر غالب ہو اور اگر اَضداد غالب ہوں تو پھر یہ اثر بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو دنیا میں ہوا۔ رہا آخرت میں! سو یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کاسب) ناکارہ (ثابت) ہو گا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے (بوجہ فسادِ نیت کے مگر صورت ظاہری کے اعتبار سے ثابت سمجھا جاتا ہے۔ آخرت میں یہ ثبوت بھی زائل ہو جائے گا۔

یہ ترجمہ بیان القرآن سے لیا گیا ہے اور اس میں تو سین میں تفسیری کلمات ہیں۔ بخاری شریف کی پہلی حدیث شریف ہے ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ یعنی ظاہر شریعت کے جتنے اعمال بھی کیے جائیں، ان کا نتیجہ اس پر موقوف ہو گا کہ وہ اعمال کس کے لیے کیے گئے۔ اسی طرح ترمذی شریف کی ایک طویل حدیث شریف کے مطابق تین آدمی جو اعلیٰ اعمال کو کرنے والے ہیں۔ ان میں ایک قاری ہے۔ ایک سخی ہے اور ایک شہید۔ لیکن چونکہ یہ اعمال انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کیے تھے نتیجتاً بجائے جنت کے جہنم پہنچ گئے۔ اس حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر اس کی روایت کے دوران بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی۔ مسلم شریف کی ایک حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کے دل میں اگر رائی برابر بھی تکبر ہو تو وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ ریا اور تکبر سے بچنا کتنا ضروری ہے۔ یہ دونوں باطنی اعمال ہی تو ہیں۔ پس اخلاقی حمیدہ کا حاصل کرنا اور اخلاقِ ذمیمہ سے چھٹکارا پانا روحانی صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے اور جس کو یہ صحت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا قلب، قلبِ سلیم اور نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ شعراء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾﴾ [الشعراء: 88-89]

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن مال اور بیٹے کوئی نفع نہیں دیں گے مگر سلیم دل جو لے کے آیا ہو، اس سے فائدہ ہو گا اور اس طرح ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا ﴿١٠١﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ﴿١٠٢﴾﴾ سے بھی یہی مستفاد ہے۔

پس ان آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ سے تصوف کی ضرورت خوب واضح ہو گئی۔ آگے ہر ایک کی مرضی ہے کیونکہ یہاں تو اختیار دیا گیا ہے اور اچھے بھلے کی تمیز سکھائی گئی ہے۔ ہر ایک کو اپنے ارادے کا پھل ملے گا۔ اعمال ظاہرہ توفیقہ کی صورت میں کتابوں میں مدوّن ہو گئے۔ ان کو کسی سے بھی سیکھ کر ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تشریح کسی بھی عالم سے پوچھی جاسکتی ہے۔ لیکن اپنے اپنے حالات میں اعمالِ قلبیہ پر کیسے عمل ہو، یہ آسان بات نہیں۔ مثلاً نماز کو لے لیا جائے، اس کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات پر اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کتاب کا بھی مطالعہ کر لیا جائے تو نماز کے مسائل معلوم ہو جائیں گے اور تھوڑی سی کوشش سے ان تمام امور کو سیکھا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی بڑے عالم کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بلکہ جس نے بھی نماز اچھی طرح سیکھی ہو اس سے یہ نماز آسانی کے ساتھ سیکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس میں اسے ہر ایک چیز نظر آرہی ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن نماز کے اندر اگر کسی میں خشوع یا اخلاص نہیں ہے تو اس کا پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ نہ تو یہ محض کتابوں سے سیکھنے کی چیزیں ہیں اور نہ ہی یہ آپ ہر ایک سے پوچھ پوچھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے باقاعدہ کسی کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا جو اس راستے سے گزرا ہو اور راستہ چو نکہ نازک ہے اس لیے اس میں کسی خطرے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رہنما اپنے فن میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ مستند بھی ہو۔ یعنی اس پر اعتماد کا سلسلہ حضور ﷺ تک پہنچتا ہو۔ اس کو سلسلہ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو میں اس کے بارے میں اتنا فکر مند نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ابھی اگر نمازی ہونے کی نیت کر لے تو ایک سیکنڈ میں نمازی ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی میں تکبر دیکھتا ہوں تو اس کے بارے میں ڈر جاتا ہوں کیونکہ اگر اس نے اپنی اصلاح کی نیت کر کے کام شروع بھی کیا تو تکبر کو نکلنے نکلنے کافی عرصہ لگ سکتا ہے۔

◆ تصوف متنازعہ کیوں ہے؟

یہ امر واقعی پریشان کن ہے کہ اتنا اہم اور مفید فن متنازعہ کیسے بنا؟ جب ہم اپنے اکابر کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمارے سارے اکابر نہ صرف اس فن کے قدردان نظر

آتے ہیں بلکہ ان میں بعض نے تو اس فن کی خدمت میں اپنی عمریں گزار دیں۔ لیکن آج ان ہی سے منسوب بعض حضرات اس فن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ جیسے یہ گمراہی کا ایک دروازہ ہو۔ اس کی جو وجہ اس عاجز کی سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جو تصوف کے مقاصد ہیں ان سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ لیکن جو ان مقاصد کے ذرائع ہیں ان پر بعض لوگ کلام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نا سمجھوں نے ان ذرائع کو مقاصد کے طور پر پیش کر کے تصوف کا حلیہ بگاڑ دیا۔ نا سمجھوں کا تو خیر علاج ممکن ہے کیونکہ وہ جہالت سے ایسا کرتے ہیں اس لیے اگر جہالت دور ہو جائے تو ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اپنے چند ذاتی مفادات کی خاطر ذرائع کو مقاصد قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں سے اصل چیز نخصت ہو جاتی ہے اور چند رسومات رہ جاتی ہیں۔ جن میں وقت کے ساتھ مزید شدت آتی جاتی ہے جیسا کہ بعض صحیح بزرگوں کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشینوں نے کیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ طریق قلندر میں فرماتے ہیں:

”تصوف کے اصول صحیحہ قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ غالی صوفیا کا بھی یہ خیال ہے اور خشک علما کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ مگر دونوں غلط سمجھتے ہیں۔ خشک علما تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں ہے سب واہیات ہیں۔ بس نماز، روزہ، قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اسی کو کرنا چاہیے۔ یہ صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے! گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں اور غالی صوفیا یہ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں۔ تصوف تو علم باطن ہے۔ ان کے نزدیک تصوف میں قرآن و حدیث ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض دونوں حضرات قرآن و حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں۔ پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور دوسرے نے قرآن و حدیث کو۔“

◈ علمی اشکالات کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن میں ﴿وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ﴾

﴿وَأَتُوا الزَّكَاةَ﴾ [البقرہ: 43] (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) موجود ہے اس طرح
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا﴾ [آل عمران: 200]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! صبر اختیار کرو“ اور ﴿وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ﴾ [البقرہ: 172]
ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو“ موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ﴾ [البقرہ: 183]

ترجمہ: ”تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں“ اور ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ
الْبَيْتِ﴾ [آل عمران: 97]

ترجمہ: ”اور لوگوں پر اللہ کے گھر کا حج کرنا فرض ہے“ پاؤ گے تو دوسرے مقام پر
﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ [المائدہ: 54]

ترجمہ: ”تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن سے وہ محبت کرتا ہو گا اور وہ اس سے
محبت کرتے ہوں گے“ اور ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرہ: 165]

ترجمہ: ”اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں“ بھی
دیکھو گے۔ جہاں ﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَى﴾ [النساء: 142]

ترجمہ: ”اور جب یہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسماتے ہوئے کھڑے
ہوتے ہیں“ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ﴿يُرْآءُونَ النَّاسَ﴾ [النساء: 142]

ترجمہ: ”لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں“ بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر تارکِ
صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر تکبر اور عجب کی برائی ہے۔

اسی طرح احادیث شریفہ کو دیکھیں جس طرح ابوابِ نماز و روزہ، بیع و شرا، نکاح
و طلاق پاؤ گے، ابوابِ ریا و کبر بھی دیکھو گے۔ اس بات سے کون سا مسلمان انکار کر
سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی ہیں۔ اس طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم
الہی ہیں۔ کیا ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ [البقرہ: 43] (اور نماز قائم کرو اور
زکوٰۃ ادا کرو) امر کا صیغہ ہے اور ﴿وَاصْبِرُوا﴾، ﴿وَأَشْكُرُوا﴾ امر کے صیغہ

نہیں؟ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ظاہری اعمال سب کے سب ہی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں اور باطن کی صفائی موجب نجات ہے اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾

[الشس: 9-10]

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے اور نامراد وہ ہو گا جو اس کو (گناہ میں) دھنسا دے“ یَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۱۰﴾ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ

بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۸﴾ [الشراء: 88-89]

ترجمہ: ”جس دن نہ کوئی مال کام آئے گا۔ نہ اولاد، ہاں جو شخص اللہ کے پاس سلامتی والادل لے کر آئے گا (اس کو نجات ملے گی)“ دیکھیں! پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلیم قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع فرمایا ہے۔ ایمان اور عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے۔ قلب ہی کے افعال ہیں اور ظاہر ہے کہ جتنے بھی اعمال ہیں سب ایمان کی تکمیل کے لیے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ جس سے انسان مقبول بارگاہ اور صاحب مدارج و مقام ہوتا ہے اور اسی کا نام اصطلاح و عرف میں تصوف ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستفسر کے جواب میں تحریر فرمایا:

”یہ فن سلوک نظری سے زیادہ عملی ہے۔ اس کے لیے ایسے کالمین کی ضرورت ہے جو اپنے حسن اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبوی پر ہوں۔ جو اپنے آداب، اخلاق، عادات اور اتباع اوامر و نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں۔ جن کی صحبت میں پر تو نبوی کا اثر ہو اور جن کا سلسلہ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تک منتہی ہو، جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے۔ جس طرح فن روایت میں اس کا نام سلسلہ ہے۔“

اس مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ

علم حدیث جس طرح حضور ﷺ کی روایت کا سلسلہ ہے۔ یہ سلوک حضور ﷺ کی صحبت کا سلسلہ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا سارا فیض صحبت نبوت کی تاثیر کا نتیجہ تھا۔ ان کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اٹھے اور تابعین کے فیض صحبت سے تبع تابعین کا ظہور ہوا۔ یہ تین دور ایسے ہیں جن میں پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہوئی۔ مگر ہر دور میں جماعت، تعداد اور کیفیت میں کم ہوتی چلی گئی۔ تبع تابعین کے بعد جب فتنوں کا ظہور ہوا تو تعداد بھی کم ہو گئی۔ چنانچہ اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی۔ اب اشخاص کا ملین کی صحبت سے اشخاص با استعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ شروع ہوا جس کا نام متاثرین نے ارادت یا پیری مریدی رکھ دیا۔ ورنہ قدام اور سلف صالحین کی اصطلاح ”صحبت“ ہی کی تھی۔ مرید کو صحبت یافتہ کہتے تھے جیسا امام محمد ﷺ اور قاضی ابو یوسف ﷺ کو صاحبان ابو حنیفہ کہتے ہیں۔ اس طرح حضرت شبلی ﷺ اور جنید ﷺ بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے۔ جیسے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص نے شبلی ﷺ کی صحبت اٹھائی ہے یا جنید ﷺ کی صحبت اٹھائی ہے۔

◆ غالی صوفیا کو جواب

صوفیو اپنے اکابر کے اقوال حجت ہیں اس لیے اگر غالی صوفیو تصوف کے مدعی ہیں تو ان کو اپنے اکابر کے اقوال سامنے رکھنے چاہیں جن میں سے چند پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی ﷺ فرماتے ہیں:

”اگر تم کسی کو کرامات والا دیکھو کہ ہوا میں اڑتا ہو، تو دھوکے میں نہ آجانا، جب تک یہ نہ دیکھو کہ وہ امر و نہی، حفظ حدود اور شریعت کی پابندی میں کیسا ہے۔“

حضرت جنید ﷺ کا ارشاد ہے:

”مخلوق پر سب راستے بند ہیں سوائے اس کے جو رسول اللہ ﷺ کے قدم بقدم چلے۔“

حضرت ابو الحسن نوری ﷺ فرماتے ہیں:

”جس کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کو حد

شرعی سے باہر کر دیتی ہے تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔“

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت قولاً، فعلاً و اراداً اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”جو آدمی شریعت پر قائم ہو اور جو کچھ احکام شرع کے ہیں۔ ان کو بجالایا اور سر مُتجاوز نہیں کیا تو اس کا مرتبہ آگے بڑھتا ہے یعنی تمام تر قیام اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔“

ایک بات جس کا سمجھنا ضروری ہے کہ بعض اوقات بزرگوں نے نااہلوں سے اپنے علوم کو چھپانے کے لیے ذومعنی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جو اہل تھے انہوں نے اس سے اصل مطلب لے لیے اور دوسروں نے اس کو اپنے اپنے مطالب پر منطبق کیا، جس سے مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اس لیے اہل حق صوفیوں نے بعد میں یہ قانون بنا لیا کہ صوفیا کے کلام کو قرآن و حدیث پر پیش کیا جائے، اگر اس کے مطابق ہے تو اس کو تو من و عن لے لیا جائے۔ اگر بظاہر قرآن و حدیث سے متضاد ہو تو اگر اس کی تاویل کی جا سکتی ہو تو تاویل کے ساتھ اس کا وہ مفہوم لیا جائے جو کہ قرآن و حدیث کے مطابق ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یا تو شطیحات میں سے ہو گا جس میں صوفی کو معذور سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کے قول کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ یا پھر اس کے کلام میں تحریف ہو چکی ہو گی جو کہ بعید نہیں۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث شریفہ میں اگر لوگ موضوع روایتیں شامل کر سکتے ہیں۔ جن کی نگرانی کے لیے اسماء الرجال کا عظیم فن موجود ہے۔ تو صوفیا کے اقوال میں تحریف کیوں نہیں ہو سکتی؟ جس کے لیے اس قسم کا کوئی فن معرض وجود میں نہیں آیا۔ اگر کوئی مدعی مثلاً حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ایسا قول پیش کرے جو شریعت سے متضاد ہو تو بجائے اس کے کہ ہم (نعوذ باللہ) قرآن و حدیث میں تحریف کے مرتکب ہوں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی کوئی ایسی

تاویل کریں جس سے یہ قول شریعت کے ساتھ متصادم نہ رہے اور اگر اس کی کوئی ایسی تاویل ممکن نہ ہو تو ہم اس کو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تحریف پر مبنی سمجھیں۔ کیونکہ لوگوں کے لیے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تحریف کرنا حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ اس کو اسماء الرجال کی کسوٹی پر پیش کرنا ممکن نہیں۔ جبکہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسا انتظام موجود ہے۔ اس سے نہ تو شریعت پر حرف آئے گا نہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پر کوئی تہمت آئے گی۔ اکابر امت نے اس طرح کے اُمور میں یہی کیا، جس پر تاویل پرستی کی پھبتی کسی گئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! ہمیں تو اپنا دین بچانے سے غرض ہے جو کہ کتاب اللہ اور رجال اللہ کی بیک وقت اتباع کا نام ہے۔ اس لیے نہ تو کتاب اللہ پر کوئی حرف آنا چاہیے اور نہ ہمیں رجال اللہ سے کٹنا چاہیے۔ خوارج نے اپنے زعم میں کتاب اللہ کے ساتھ تمسک کیا تھا۔ لیکن رجال اللہ کی ناقدری سے اتنے دور جا پڑے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گمراہی کی مستقل پیشگوئی فرمائی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے اس کارنامے پر فخر فرماتے تھے جو انہوں نے نہروان میں خوارج کو تہ تیغ کر کے کیا تھا۔ دوسری طرف باطنیین نے رجال اللہ کے نام پر معافی کو اتنا بدلا کہ قرآن و حدیث سے انکار کے مرتکب ہوئے۔ اس طرح نہ ان کے عقائد محفوظ رہے اور نہ ہی اعمال۔ امت کو بعد میں ایسے گمراہوں کو راہِ راست پر لانے اور لوگوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ قلعہ الموت اور فاطمین کے دور میں عقل مندوں کے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ تصوف کا آخری مقام خالص بندگی۔ فنائیت اور بقا عند اللہ ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ محبوبیت عند اللہ ہے۔ پس کسی کو اتنی بات اگر سمجھ آگئی تو اس کے لیے تصوف کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ ان غالی متصوفین کے کہنے سے جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے۔ گمراہ نہیں ہوں گے، بلکہ طریقت کو تکمیلِ شریعت سمجھیں گے۔ وہ خدا پرستی کے لبادے میں ان مادہ پرستوں کو بھی پہچان لیں گے جو دوسروں کو اکابر کے استغنا کی بڑی بڑی باتوں میں اس لیے مشغول کرتے ہیں کہ ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالیں۔ وہ فکر کے مصلحین کے جامے میں فکر کی گمراہی کو فروغ دینے والے

ان فلسفیوں کو بھی پہچان لیں گے جو اپنی کج بحثی کے ذریعے سیدھی سادھی طریقت کو چیستان بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے چونکہ خود تصوف کو فلسفہ کی عینک سے دیکھا ہوتا ہے۔ اس لیے دوسروں کو بھی یہ عینک لگانے پر مصر ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے محبوب پیغمبر ﷺ کی محبت میں بظاہر مرنے والے ان نفس پرستوں کو بھی پہچان لیں گے جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے دین میں نئے نئے طریقے وضع کیے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ”وَكُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2042] کو نہ صرف خود پس پشت ڈالا بلکہ اپنے متعلقین کو ان اللہ والوں کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے کہ مبادہ وہ ان کو آپ ﷺ کا یہ پیغام سنا دیں اور پھر وہ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہ بن سکیں۔ اگر کچھ کسر باقی ہو تو اس کے لیے حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف سلوک سلیمانی سے ”غیر شرعی یا عجمی تصوف“ کے عنوان پر مشتمل تحریر پڑھی جاسکتی ہے۔ جس کی تفصیل حضرت کی کتاب سلوک سلیمانی جلد اول میں ملے گی۔ جس سے ان شاء اللہ اچھی طرح تسلی ہو جائے گی۔

* ● ● ● *

تصوف کی چند مفید اصطلاحات

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق زندگی گزارے۔ اس کے لیے جن علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے وہ بھی فرض ہیں اور جن ذرائع پر یہ موقوف ہیں وہ بھی لازم ہیں اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ذریعہ فی نفسہ مقصود نہیں ہوتا لیکن اگر مقصد اس کے بغیر حاصل نہ ہوتا ہو تو وہ بھی لوازمات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ کتاب و سنت ہیں۔ جن کی ابتدائی تعلیم مجلس نبوی ﷺ میں دی جاتی تھی اور چونکہ وہ ابتدائی دور تھا۔ حلقہ بگوشانِ اسلام اپنے اصلی مرکز میں موجود تھے، جن کی تعداد بھی اس وقت اتنی زیادہ نہ تھی جتنی بعد میں ہو گئی۔ اس لیے نبوی درسگاہ میں ان ضروری تعلیمات کو حاصل کرنے کے لیے علم حدیث، علم فقہ، علم تفسیر اور علم تصوف کے نام گو کہ معروف نہیں تھے لیکن بعد میں جن تعلیمات سے یہ مدون ہوئے ان کے اصل کی تعلیم یکجادی جاتی تھی۔ کوئی الگ الگ شعبہ قائم نہ تھے۔ پس ان تمام علوم کے مقاصد آپ ﷺ کی نگرانی میں حاصل ہو رہے تھے اور ان سب مقاصد کو حاصل کرنے کا جو سب سے بڑا ذریعہ موجود تھا وہ آپ ﷺ کی صحبت تھی، جس کے ہوتے ہوئے کسی اور ذریعے کی حاجت نہیں تھی۔ اس نبوی درسگاہ میں ایک اقامتی شعبہ ایسا بھی موجود تھا جس میں مجاہدانِ خدا اور عاشقانِ رسول اللہ ﷺ تشرکیہ نفس و اصلاحِ باطن کی عملی تعلیم و تربیت کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے اور وہ اصحابِ صفہ کہلاتے تھے۔ بعد ازاں جب اسلام عالمگیر حیثیت اختیار کر گیا اور آپ ﷺ کی صحبت بھی موجود نہیں رہی اور نہ ہی ان کی صحبت میسر رہی جن کو براہِ راست آپ ﷺ کی صحبت حاصل رہی تھی۔ اس لیے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے علمائے دین نے الگ شعبہ قائم کیے۔ چنانچہ جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی وہ محدث کہلائے۔ جنہوں نے علم تفسیر کا کام سنبھالا وہ مفسر کہلائے۔ جو فقہ کا کام کرنے میں منہمک ہو گئے وہ فقیہ بن گئے اور جنہوں نے تشرکیہ نفس و اصلاحِ باطن کا شعبہ سنبھالا وہ مشائخ

اور صوفیا مشہور ہوئے۔ اسی لیے اکابر سلف میں سے کسی نے شریعت کو طریقت سے الگ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ طریقت کو شریعت کے تابع رکھا۔ درج ذیل صفحات میں چند ضروری اصطلاحات کا تعارف بیان کیا جاتا ہے جو فی الحقیقت تو بہت آسان ہیں۔ لیکن دکاندار پیروں نے ان کو باطل فلسفے کا ایسا گورکھ دھندہ بنایا ہوا ہے کہ بعض مخلصین ان اصطلاحات کے ناموں سے چڑنے لگے ہیں۔ اس لیے علم تصوف میں ان کے اصل مفاہیم کا سمجھنا سالک کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ کسی مرحلے پر کوئی اس کو دھوکہ نہ دے سکے۔ ایک بزرگ نے راقم سے فرمایا کہ اصطلاحات مبتدی کے لیے علم کی سیڑھی ہے اور منتہی کے لیے عیب ہے۔ کیونکہ مبتدی ان کے بغیر سیکھ نہیں سکتا اور منتہی کو ان کی حاجت نہیں ہوتی، وہ جس کے حسبِ حال جو مناسب سمجھتے ہیں ارشاد فرماتے ہیں۔ کیونکہ اس کو سمجھنا مقصود ہوتا ہے اصطلاحات مقصود نہیں ہوتیں۔ چند اہم اصطلاحات کا تعارف یہاں ضروری ہے تاکہ آگے کے ابواب آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکیں۔

◆ شریعت

شریعت احکام تکلیف یہ (جن احکام پر عمل کرنے کا ہمیں ذمہ دار بنایا گیا ہے) کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں اعمالِ ظاہرہ و باطنہ سب آگئے۔ زندگی گزارنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے لیے پسند فرمایا ہے اس کو شریعت کہتے ہیں۔ اس کو ہم تک پہنچانے کے لیے چونکہ نبی ﷺ کی ذات مبارک ذریعہ بنی ہے۔ اس لیے اس کو آپ ﷺ کا طریقہ یا سنت بھی کہتے ہیں اور آپ ﷺ کو شارع بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف اسی نسبت سے ہے ورنہ فی الحقیقت احکامات تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔

◆ فقہ

مفتد مین کی اصطلاح میں لفظ فقہ کو شریعت کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے فقہ کی تعریف ”مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالِهَا وَمَا عَلَيَّهَا“ منقول ہے۔ یعنی نفس کے نفع و نقصان کی چیزوں کو پہچانا۔ پھر متاخرین کی اصطلاح میں شریعت کے صرف اس جزو کا نام فقہ ہو گیا جو اعمالِ ظاہرہ سے متعلق ہے۔

◆ تصوف

شریعت کا وہ جزو جو اعمالِ باطنہ سے متعلق ہے۔ متاخرین کے نزدیک اس کا نام تصوف ہو گیا۔ یہ وہ فن ہے جس کے ذریعے دل، نفس اور عقل کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے دل، نفس اور عقل کی حالت کا پتا چلتا ہے اور بیمار دل، باغی نفس اور ہدایت سے محروم عقل کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسی کو حدیث شریف میں احسان کہا گیا ہے۔ قرآن میں لفظِ تقویٰ کا منہوم اس کے قریب تر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تقویٰ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جو مقصود فی الاعمال ہے اور نفس کی غلط خواہشات کی ضد ہے۔ تصوف اس کو بلکہ تمام اخلاقِ حمیدہ کو حاصل کرنے کا اور اس کے اضرار سے بچنے کا علم و فن ہے۔

◆ طریقت

ان اعمالِ باطنہ کے طریقوں (Procedures) کو طریقت کہتے ہیں جن سے اخلاقِ حمیدہ حاصل ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ سے چھٹکارہ حاصل کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ مقصد صحت ہے طریقہ نہیں ہے۔ پس جس وقت جن طریقوں سے روحانی اور قلبی صحت کا زیادہ امکان ہو اس وقت ان ہی طریقوں کو طریقت کہا جائے گا۔

◆ حقیقت

طریقت سے جب اعمال کی درستگی ہوتی ہے تو اس سے قلب میں صفائی اور ستھرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے دل پر بعض اعمال اور اشیاء بالخصوص اعمالِ حسنہ و سیدہ کے حقائق و لوازمات منکشف ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا ادراک ہوتا ہے۔ جس سے بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جیسا تعلق ہونا چاہیے اس کا ادراک ہوتا ہے۔ ان علوم و معارف تک سالک کی رسائی کو حقیقت کہتے ہیں۔

◆ شریعت، طریقت، حقیقت

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ان تینوں کے بارے میں درج ذیل ہے:

یہ بات جاننا چاہیے کہ جو شریعت پر دل سے چل رہا ہے اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ شریعت ہی کا مطالبہ ہے۔ اگر اس پر عمل ہو رہا ہے تو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیطان اور نفس انسان کو شریعت پر نہیں چلنے دیتے۔ شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے اور نفس شریعت کے اوامر و نواہی کی پروا نہیں کرتا اور عقل کو نفس و شیطان متاثر کر سکتے ہیں۔ اس لیے نفس و شیطان کے مکر و فریب کو سمجھنے کے لیے اور ان کے دام میں آنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کچھ طور طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان طور طریقوں کو طریقت کہتے ہیں۔ طریقت پر چلانے کے لیے مشائخ کو نفس و شیطان کے مکر و فریب کو جاننا ہوتا ہے اور جو عوامل اصلاح نفس، قلب اور عقل میں کار فرما ہوتے ہیں ان کو سمجھنا ہوتا ہے۔ اس کو حقیقت کہتے ہیں۔ پس ان حقائق کا جاننا ہر ایک کے لیے نہ ضروری ہے نہ مفید، البتہ جو ان کو حاصل کر سکتے ہیں ان کو اس کے دو فائدے ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ کسی وجہ سے اگر عقیدہ یا دین کے فہم کو کسی کی تقریر، تحریر یا عمل سے نقصان ہو سکتا ہو، تو اگر اس کی معرفت حاصل ہوگی تو دل مطمئن ہوگا۔ اپنی راہ سے نہیں ہٹے گا اور اگر کسی اور کو اس قسم کا مسئلہ ہوگا تو ان کو بھی اس کی زبان میں سمجھا سکے گا۔ ایسے لوگوں کو اس فن کے محقق کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ حقائق نامکمل صورت میں سامنے آجاتے ہیں یا جن و انس کے شیاطین کے وسوسے کی صورت میں لائے جاتے ہیں۔ ان حقائق کو جان کر نامکمل کی تکمیل ہو جائے گی اور جن و انس کے وسوسوں کا علاج بھی ہو جائے گا۔

◆ معرفت

بندے اور خدا کے درمیان اس تعلق کا ادراک ہی معرفت کہلاتا ہے کہ اس کے ذریعے سالک ہر وقت اپنے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مشائخ کا بہتر طریقے سے ادراک کر لیتا ہے۔ اس لیے اس صاحب انکشاف کو محقق اور عارف کہتے ہیں اور اس نعمت کو

معرفت کہتے ہیں۔ عارف چونکہ اپنے عجز و بے ثباتی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس لیے باوجود دوسروں سے بہتر جاننے کے اپنے آپ کو ہمیشہ قاصر سمجھتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعے کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

◆ نسبت

نسبت کے معنی تعلق کے ہیں۔ یہ تعلق جانسین سے ہوتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں نسبت سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا ایسا تعلق ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو حاضر اور جو ابدہ پاتا ہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو کسی نہ کسی صورت میں یاد کرتا ہے۔ اس سے اس کو طاعات اور عبادات کی طرف طبعی رغبت یا ایسی کامل عقلی رغبت ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور گناہوں سے اس کو ایسی نفرت ہو جاتی ہے جیسا کہ پیشاب پاخانے سے ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو ہمہ وقت اتباعِ سنت کی فکر ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو ایسا قرب حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا معصیتوں سے حفاظت کا انتظام ہو جاتا ہے اور طاعات کی توفیقات سے اس کو نوازا جاتا ہے جس پر رضائے الہی کا ترتب ہوتا ہے۔ اس کے آثار مختلف ہوتے ہیں جن میں خود بخود روحانی تربیت کے اسباب کا بننا، دینی کاموں کے لیے استعمال ہونا، اہل قلوب کے دلوں میں خود بخود اس کے لیے محبت کا پیدا ہونا اور اس کے پاس بیٹھنے سے اللہ تعالیٰ کا استحضار پیدا ہونا وغیرہ شامل ہیں۔

◆ نسبتِ انعکاسی

یہ نسبت سب سے کمزور اور وقتی ہوتی ہے۔ جب سالک شیخ کے سامنے ہوتا ہے تو شیخ کارنگ مرید میں منعکس ہو کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسا کہ سالک کو نسبت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن شیخ سے دوری کی صورت میں کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے۔

◆ نسبتِ القائی

شیخ کے دیے ہوئے معمولات اور رابطے کی برکت سے سالک کو جو نسبت القا ہو جاتی ہے وہ نسبتِ القائی ہے۔ اگر اپنی اصلاح کی کوشش جاری رکھے تو اصلاح کے بعد

یہ نسبتِ اصلاحی میں بدل سکتی ہے بصورتِ دیگر معمولات کی پابندی اور رابطے کے ذریعے باقی رہے گی۔ لیکن اس کی اپنی مستقل حیثیت نہیں ہوگی۔

◆ نسبتِ اصلاحی

یہ وہ اصل نسبت ہے جس کو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں سالک کے رذائل دور ہو کر فضائل میں بدل جاتے ہیں اور سیرالی اللہ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک پاکدار نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

◆ نسبتِ اتحادی

یہ بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اس میں شیخ کارنگ سالک پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ گویا وہ یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ نہ تو اس کی کوئی ریس کرے اور نہ اس کا انکار کرے۔ یہ ممکن ہے لیکن تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

◆ بیعت

بیعت تصوف کی اصطلاح میں شیخ اور مرید کے درمیان معاہدہ ہے کہ شیخ اس کو طریقِ تعلیم کرے گا اور مرید اس پر عمل کرے گا۔ اس کا مقصد اعمالِ ظاہری و باطنی کا اہتمام و التزام ہے جس کے لیے مرید شیخ کو اپنا نگرانِ دل سے تسلیم کر لیتا ہے اور شیخ اس کو اپنا سمجھ کر اپنی تعلیم اور دعا سے اس کی مدد کا قصد کرتا ہے۔ اس کو بیعتِ طریقت کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے ہاں بتواتر رائج ہے۔ اس کی شرعی حیثیت سنتِ مستحبہ کی ہے لیکن اس کی برکت سے فرائض، واجبات اور سنن پر عمل نصیب ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر بعض خوش نصیبوں کو نسبت حاصل ہو جاتی ہے جس کے سامنے دنیا کی کوئی بھی دوسری چیز کچھ بھی نہیں۔ نسبت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تربیت کروانا فرضِ عین ہے اور بیعت اس کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن سنتِ مستحبہ ہے۔

◆ شیخ

وہ عارف جو طابینِ طریقت (جن کو سالک یا مرید کہا جاتا ہے) کو تعلیم کرنے کا اہل ہو، شیخ کہلاتا ہے۔ شیخ کی پہچان کے بارے میں تفصیل سے آگے آ رہا ہے۔

◇ مرید

وہ طالب جو شیخ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اور اپنی اصلاح کے لیے (جو کہ فرضِ عین ہے) یہ عہد کرتا ہے کہ وہ شیخ کی ہر بات کو بلا چون و چرا مانے گا۔

◇ سلسلہ

اس سے مراد صحبت اور اعتماد کا وہ سلسلہ ہے جو موجودہ شیخ سے آنحضرت ﷺ تک جاتا ہے۔ ہند میں چار بڑے سلسلے چل رہے ہیں: چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ۔ جس شیخ سے آدمی بیعت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس کے سلسلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان سلسلوں کی مثال فقہ کے چار طریقوں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی یا طب کے مختلف طریقوں یعنی ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، اکیوپنچر اور یونانی حکمت وغیرہ سے دی جاتی ہے۔ ان کے اصولوں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے لیکن سب کا نتیجہ وہی روحانی صحت یعنی نسبت کا حاصل کرنا ہے۔

◇ تلوین

احوال کا بدلنا تلوین کہلاتا ہے۔ مرید کی جب تربیت ہوتی ہے تو اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہیں جس سے اس کے احوال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ ناپختگی کی علامت ہوتی ہے اس لیے سالک کے لیے یہ مطلوب حالت نہیں ہے اس کو تمکین کی طرف بڑھنا چاہیے۔ لیکن تمکین کے لیے تلوین لازمی ہے جیسا کہ منزل کے لیے راستے کا قطع کرنا۔ دورانِ تلوین مختلف احوال کا غلبہ ہوتا ہے جس میں سالک معذور ہوتا ہے۔ اس لیے ماخوذ نہیں ہوتا، لیکن اس حال میں وہ قابلِ تقلید بھی نہیں ہوتا، بلکہ ابھی راہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے مشائخ بھی سالکین کے لیے تمکین کے انتظار میں ہوتے ہیں۔

◇ تمکین

تربیت کے بعد حسبِ استعداد کسی حالتِ محمودہ پر کسی سالک کو جو استمرارِ نصیب ہو جاتا ہے اس کو تمکین کہتے ہیں۔ اس وقت تمام اشیاء کے حقوق خوب ادا ہوتے ہیں۔

اسی کو توسط اور اعتدال بھی کہتے ہیں۔ صاحبِ تمکین حق شناس ہوتا ہے اور اصل ہوتا ہے اس لیے قابلِ تقلید اور مقتدا بننے کا اہل ہوتا ہے۔

◆ سلوک

ایک ایک رذیلے کی اصلاح کو سلوک کہتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں دس مقامات یعنی توبہ، انابت، ریاضت، قناعت، تقویٰ، صبر، زہد، توکل، تسلیم اور رضا کو تفصیلی طور پر طے کرنا ہوتا ہے۔

◆ جذب

دل میں کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہو جانا اور دنیا کی محبت کا دبا جانا، گو عارضی ہو، جذب کہلاتا ہے۔ یہ اگر سلوک کی تکمیل کے لیے شوق پیدا کرنے کے لیے ابتداً توجہ، ذکر اذکار اور مراقبات کے ذریعے پیدا کیا جائے تو جذبِ مبتدی کہلاتا ہے اور اگر یہ سلوک کی تکمیل کے بعد منجانب اللہ خود عنایت ہو تو یہ جذبِ منتہی یا جذبِ وہبی کہلاتا ہے۔

◆ سالک مجذوب

سلوک کی تکمیل کے بعد جس کو جذبِ منتہی عطا ہو جائے اس کو سالکِ مجذوب کہتے ہیں۔ اکثر سلسلوں کی ترتیب یہی ہوتی ہے۔

◆ مجذوب سالک

جذبِ مبتدی کے بعد جو سلوک کی تکمیل کروا رہا ہو، وہ مجذوبِ سالک کہلاتا ہے۔ ایسے سالک کو بھی جذبِ منتہی جب عطا ہو جائے تو یہ مجذوبِ سالکِ مجذوب کہلاتا ہے۔ نقشبندی کا ملین حضرات کی یہی ترتیب ہوتی ہے۔

◆ مجذوب متمکن

اگر مجذوبِ جذبِ مبتدی کے بعد سلوک کی تکمیل یعنی تزکیہٴ نفس نہ کروائے اور اسی پر مطمئن ہو کر ٹھہر جائے، تو ایسے مجذوب کو مجذوبِ متمکن کہتے ہیں۔ یعنی حالتِ

جذب میں از خود تمکین جیسی حالت پیدا کرنے والا۔ ایسا شخص کامل نہیں ہوتا کیونکہ یہ مقام قلب میں ہوتا ہے جس میں نفس اور روح آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہیں۔ باغی نفس جذب کے مفید اثرات کو بار آور نہیں ہونے دیتا، لیکن جذب کی وجہ سے اس کی بعض علامات سے اس پر کامل ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص جب تک سلوک کی تمام منازل طے نہ کر لے، نہ خود منزل پر پہنچا ہوتا ہے نہ دوسرے کو پہنچا سکتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب نمبر 287 میں اس پر تفصیلی کلام فرمایا ہے۔



اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات: 56]

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں“ ”الَّا لِيَعْبُدُونِ“ کی تفسیر میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ جو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں ”أَيُّ لِيَعْبُدُونِ“ لکھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اور معرفت کے حاصل ہونے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیے بغیر یہ حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ان تمام رکاوٹوں کا ختم ہونا تب ممکن ہے۔ جب انسان اپنا سب کچھ محسوس اور غیر محسوس اللہ تعالیٰ پر قربان کرے۔ یعنی اس کا نفس، عقل اور قلب کوئی ایسا کام، جذبہ اور سوچ تحریک نہ کر سکے جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے مقابلے میں آسکے اور یہ تب ممکن ہے کہ انسان کو صرف وہی یاد ہو اور کچھ یاد نہ رہے۔ اس حالت کو فنا کہتے ہیں۔ اس کا مکمل تعین محال ہے کیونکہ اس کا ادراک فنا کے خلاف ہے اور بغیر ادراک کے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے یہ مقام حیرت و محویت محض ہے۔

جو ابتدائی جذب ہے اس میں دل کی قدرے اصلاح ہو چکی ہوتی ہے۔ اس میں انسان اپنے دل کے جذب کے زور پر سلوک کے بغیر بھی اپنی کچھ خواہشات کو دبانے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس قدر (یعنی قلبی طور پر) اس کو فنا حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا نفس اپنے مطلوبہ مقام پر نہیں آیا ہوتا۔ اس لیے عود کا خطرہ ہوتا ہے۔ تو یہ جو ابتدائی جوش و جذبہ ہے اس کے ماند پڑتے ہی چونکہ ابھی نفس و روح آپس میں ملے ہوئے ہیں اس لیے وہ ارادہ جو اس کو حاصل ہوا ہے۔ نفس کے ارادے

کے مقابلے میں ختم ہو جاتا ہے۔ سلوک کے ذریعے جو فنا حاصل ہوتی ہے تو چونکہ اس کا نفس روح سے علیحدہ ہو جاتا ہے لہذا ایک ایسے ارادے کی فنا حاصل ہو جاتی ہے جس میں نفس واپس پہلے والی حالت پر نہیں آسکتا، تو یہ فنائے کامل ہوتی ہے۔

مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک فنا ہوتی ہے جو ابتدائی جذب سے شروع میں حاصل ہوتی ہے جس میں ابھی نفس کی اصلاح نہیں ہوئی ہوتی، وہ فنائنا قص اور عارضی ہوتی ہے۔ اس پر بقا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن نفس کی اصلاح کے بعد جب نفس اپنی مطلوبہ جگہ پر آتا ہے تو اس کی وجہ سے انسان کو اسے دبانے کے لیے اپنے دل کے ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس وقت کامل فنا حاصل ہو جاتی ہے اس لیے پھر عود کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔

◆ بقا

اس حالت سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس کو احساس واپس لوٹا دے اور فنا کا اثر اتنا باقی رہے کہ اس کا ہر عمل درج بالا فنا کے خط کشیدہ حصے سے مستفاد ہو، تو یہ حالت بقا کہلاتی ہے۔ اس وقت سالک سب احکامات پر عمل کرتا ہے۔ لیکن اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا۔ یعنی عبدیت محض اس کا خاصہ بن جاتی ہے۔

انسان کو اللہ پاک کے احکام میں دوام حاصل ہو جائے اور اطمینان حاصل ہو جائے اور تمکین حاصل ہو جائے تو یہ بھی بقا ہے۔ یہ بھی اللہ پاک کا انعام ہی ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ پاک کی طرف سے قبولیت تامہ نصیب ہو جائے تو یہ بھی بقا کی ایک شکل ہے۔

◆ وحدت الوجود

اللہ تعالیٰ کی ذات کی محبت میں جب سالک خود کو اور سب کائنات کو بھول جائے، تو اس حالت کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ اس حالت میں ماسوی اللہ کا علم بالکل نہیں ہوتا اور سالک مغلوب الحال ہوتا ہے۔ اس کو پہلے وحدت الوجود بالسر کہتے تھے۔

◆ وحدت الشہود

سالک کو جب اس حالت سے افاقہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کے اپنے بارے میں اور کائنات کے بارے میں اس کا علم واپس آ جاتا ہے لیکن اس کا قلبی تعلق اللہ تعالیٰ کے

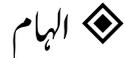
ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس حالت میں اس کو سب کچھ اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہر چیز کی حقیقت اپنی اپنی جگہ پر دیکھتے ہوئے ہر حال کی رعایت کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کو پہلے وحدت الوجود بغیر سُکر کے کہتے تھے۔



کتاب التعريفات لِعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الزَيْنِ الشَّرِيفِ الْحُرْجَانِيِّ
 کے مطابق ”السُّكْرُ هُوَ غَيْبَةٌ بِوَارِدٍ قَوِيٍّ وَهُوَ يُعْطَى الطَّرْبَ وَالْإِلْتِذَاذَ،
 وَهُوَ أَقْوَى مِنَ الْغَيْبَةِ وَأَتْمَمْنَهَا“ [التعريفات، ص: 159] یعنی قلب پر کسی واردات
 قوی کا غلبہ ہو جانے سے غیبت کا طاری ہو جانا، یہ خوشی اور لذت کی وجہ سے ہوتا ہے۔
 جبکہ سُکر غیبت سے قوی تر اور مکمل ترین ہوتا ہے۔



کتاب التعريفات لِعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الزَيْنِ الشَّرِيفِ الْحُرْجَانِيِّ
 کے مطابق ”الصَّحْوُ: هُوَ رُجُوعُ الْعَارِفِ إِلَى الْإِحْسَاسِ بَعْدَ غَيْبَتِهِ وَزَوَالِ
 الْإِحْسَاسِ“ [التعريفات، ص: 173] یعنی کسی عارف کا غیبت کے بعد وارداتِ قویہ کے سبب
 احساس کی طرف لوٹنے کو صحو کہتے ہیں۔



کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینے کو الہام کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ ایسی بات کے
 القا کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملائِے اعلیٰ کی جانب سے کسی کے دل
 میں ڈالی جاتی ہے۔ اللہ کی طرف سے انبیاء و اولیاء کو جو اطلاع یا ہدایت روحانی طور پر دی
 جاتی ہے اس کو الہام کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: جب اللہ
 عز و جل کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں فقیہ بنا دیتا ہے یعنی رشد
 و ہدایت الہام فرما دیتا ہے۔



حواسِ خمسہ کے بغیر کسی چیز کا نظر آنا، معلوم ہونا یا کسی چیز کا ادراک ہونا۔

◊ سیر الی اللہ

سالک جو ابتدا میں روحانی مریض ہوتا ہے۔ علاج کے لیے مرشدِ کامل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس میں اطلاع و اتباع کے ذریعے سالک کی روحانی بیماریاں آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ درجہ ضرورت میں سالک کا دل ان بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهُ﴾ [الشس: 9]

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اسے پاکیزہ بنائے“ اس کے ساتھ سالک کا قلب اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہوا یعنی اس میں تواضع، اخلاص، تفویض، حبِ الہی و حبِ رسول اور انابتِ الی اللہ کی صفات پیدا ہوئیں اور اس میں رسوخ حاصل ہوا۔ یعنی ان صفات نے قلب میں جگہ پکڑ لی اور ان کو حاصل کرنے کی تدابیر سے آگاہی ہوئی، تو کہا جاتا ہے کہ اس کی سیر الی اللہ کی تکمیل ہوئی۔ اس کے بعد سالک کو فنائے تام حاصل ہو جاتی ہے اور شیخ اس کو اکثر اجازت و خلافت دے دیتا ہے۔

◊ سیر فی اللہ

سیر الی اللہ جو کہ تین چیزوں نفس، قلب اور عقل کی اصلاح ہے مکمل ہونے کے بعد سالک خالص دین پر چلتا ہے۔ جس کو طریق صحابہ بھی کہتے ہیں۔ اس سے قلب کے اندر تزکیہ اور تقویٰ سے ایک خاص جلا اور نور پیدا ہوتا ہے اور سالک برابر قلب کو ماسوی اللہ سے فارغ کرتا رہتا ہے۔ نتیجتاً حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال نیز حقائقِ کونیہ اور حقائقِ اعمالِ شرعیہ سالک کے دل پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ جس سے اس کا خالق کے ساتھ قرب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ عین الیقین سے حق الیقین تک سفر کرتا رہتا ہے اس کو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ جس نے جتنا حصہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنی استعداد کے مطابق پایا وہ اس کا حصہ ہے۔ موت تک سالک کی یہ سیر جاری رہتی ہے اور تفرید اور تجرید کے ذریعے قرب میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ اس میں چاہے شیخ سے مرید بڑھ جائے، یہ بھی ممکن ہے۔ اس تمام تفصیل کی روشنی میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض کتابوں میں سیر فی اللہ کے بعد بھی دو سیر

لکھی گئی ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ سیر فی اللہ کا ہی حصہ ہیں۔ ان کو الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک شیخ کی نگرانی میں سالک کے سلوک طے کرنے کا تعلق ہے۔ تو وہ سیر الی اللہ ہے جس کا جاننا ضروری ہے۔ سیر فی اللہ سالک اور اللہ کے درمیان کا معاملہ ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے:

راز جو عاشق و معشوق کے درمیان میں ہے
کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں اس کی

چاہے کسی کو اپنے جمال کے مشاہدہ میں مستغرق کر دے جو کہ اصطلاح میں ”مُسْتَهْلِكِينَ“ کہلاتے ہیں یا ان کو مخلوق کی اصلاح پر مامور کر کے صفت بقا سے متصف کر دے جو کہ اصطلاح میں ”راجعین“ کہلاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے جو بھی فیصلہ فرمادے۔ راجعین کو مرشدین بھی کہتے ہیں۔ ان کے ظاہر کو عام مخلوق سے غلط ملط کر کے اُن کے ذریعے احکام شرعیہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

◆ علم الیقین

اس کی مثال ایسے ہے جیسے مستند طریقوں سے کسی کو پتا چلے کہ زہر سے آدمی مرتا ہے اور آگ اشیاء کو جلاتی ہے۔

◆ عین الیقین

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آگ سے جلتا ہوا دیکھتا ہے یا زہر سے مرتا ہوا دیکھتا ہے۔

◆ حق الیقین

اس کی مثال ایسے ہے جیسے خود پر کوئی چیز گزرتی ہے۔ جیسے آگ سے جلا یا زہر سے مرنے لگا تو اس کے لیے وہ حق الیقین ہے۔

◆ نفسِ بہیمی

یہ جانوروں کا نفس ہوتا ہے۔ جب کوئی انسان اپنی جبلت سے اتنا مغلوب ہو کہ شعور سے کام نہ لے، اس وقت اس کا نفس، نفسِ بہیمی کہلائے گا۔

◆ نفسِ انسانی

جب انسان کا شعور اس کی جبلت پر غالب آجائے اور وہ شعور سے کام لینے لگے، چاہے اچھا ہو یا برا، اس کے بعد وہ جو ارادے کے ساتھ کرے گا اس وقت اس کا نفس، نفسِ انسانی کہلاتا ہے۔

◆ مبدائے فیض

جہاں سے فیض کی ابتدا ہوتی ہے۔

◆ موردِ فیض

جہاں فیض کا ورود ہو رہا ہے۔

◆ تنزل

تزیہ سے تشبیہ کی طرف سفر۔

◆ تشبیہ

کسی چیز کو سمجھنے کے لیے کسی چیز کے ساتھ اس کی کسی صفت میں مشابہت کا ادراک۔

◆ جبلت

انسان کے وہ عام اور مشترکہ جذبات، خواہشات اور رجحانات جو اس کے اپنے تخلیق کردہ نہیں ہوتے یا جن کی نشوونما میں اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا، بلکہ غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر انسان کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

◆ قوتِ غضبیه

اپنی ناپسندیدہ چیزوں کو دفع کرنے کا جذبہ۔

◆ القائے رحمانی

دل میں رحمان کی طرف سے القا کا نظام جو عرفِ عام میں ضمیر کہلاتا ہے۔

◆ القائے شیطانی

دل میں شیطان کی طرف سے وساوس ڈالنے کا نظام۔

◆ لطائفِ ستہ

قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور نفس۔ ان لطائف پر روحانیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ نیز ان کے سرے یہاں (انسانی جسم میں) ہیں لیکن ان کی جڑیں عرش پر ہوتی ہیں۔

◆ لطائفِ خمسہ

قلب، نفس، عقل، روح اور سر، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ پانچ نظام ہیں۔ ان میں دل کا پورے جسم پر اثر ڈالنے کا اپنا نظام ہے۔ تاہم اس کا مرکز دل میں ہوتا ہے۔ نفس کا پورے جسم کو متاثر کرنے کا اپنا نظام ہے۔ تاہم اس کا مرکز جگر میں ہے اور عقل کا پورے جسم کو قابو کرنے کا اپنا نظام ہے۔ تاہم اس کا مرکز دماغ میں ہے۔ ان تینوں کی اصلاح کے بعد لطیفہ روح کا نظام بن جاتا ہے جو دل کو ملائے اعلیٰ کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ اس طرح لطیفہ سر کا نظام بھی بن جاتا ہے جو لطیفہ عقل کو ملائے اعلیٰ کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

◆ حال

یہ دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اول کسی عمل کارو حانی قوت سے لبریز ہونا اور دوسرا کوئی عارضی کیفیت۔

◆ کیفیت

کوئی شخص کسی وقت جیسا محسوس کرتا ہے۔

◆ مقام

وہ جو کسی طور پر ایک دیرپا باطنی حالت حاصل کی جاتی ہے۔

◆ مکتسب

جس کو کسی طور پر حاصل کیا جائے۔

◆ وہابی

اللہ تعالیٰ کے فضل سے عطا ہونے والی۔

◆ داعیہ

باطن میں کسی کام کے لیے محرک جذبہ۔

◆ دواعی

یہ داعیہ کی جمع ہے۔

◆ صدق

یہ ایک مقام ہے جس کے مطابق قولاً، فعلاً اور حالاً سالک سچ پر قائم ہو جائے۔

◆ وجد

کسی اچھے اندرونی جذبہ سے جو ارجح کا بے قابو ہو جانا۔

◆ صبر

کسی مطلوبہ حالت پر خود کو برقرار رکھنے کی استطاعت کا مقام۔

◆ توکل

اللہ تعالیٰ پر بھروسے کا مقام۔

◆ تقویٰ

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرنے کا مقام۔

◆ ہمت

اپنی توجہ سے کسی شاگرد یا مرید کو کسی مطلوب حال پر لانے کی استعداد۔

◆ تجلی

کسی شے کے دوسرے یا تیسرے یا چوتھے یا جہاں تک اللہ چاہے۔ اس مرتبے میں ظاہر ہونے کو تجلی کہتے ہیں۔

◆ تجلی صوری

جب سالک اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی موجودگی پر یقین

ہونے کی وجہ سے اس کا خیال اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ تو قوتِ مدرکہ اور قوتِ واہمہ ایک ایسی وہمی صورت تراشتی ہیں کہ جس میں شکل و رنگ اور جہت نہیں ہوتی، لیکن یقین کے لیے ایک صورت بناتی ہیں اور درست کرتی ہیں۔ تاکہ اس کی شرح و تفصیل پیش کریں۔ بعض اذہان میں یہ یقین صرف صورتِ خیالیہ کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ اس کو تجلی صوری کہتے ہیں۔

◆ قوتِ واہمہ

خیال کی قوت جس سے انسان تصور قائم کر سکتا ہے۔

◆ قوتِ مدرکہ

وہ قوت جس سے اشیاء و احوال کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔

◆ اعتبار

حقائق کے باہمی تعلق سے حقائق کا سمجھ میں آنا اعتبار کہلاتا ہے۔

◆ عالمِ مثال

یہ ایک عالم ہے جو عالمِ ارواح اور اجسام کے درمیان ہے۔ جو کچھ عالمِ اجسام میں موجود ہے اس کی نظیر عالمِ مثال میں موجود ہے۔

◆ حاسہ

جس ذریعہ سے کسی مدرکہ کا ادراک ہوتا ہے وہ اس کا حاسہ ہوتا ہے۔

◆ مستہلک

فانی۔

◆ لاہوت

مقامِ محویت یا مقامِ فنا، یہ جہات و حدود سے منزہ ہوتا ہے۔

◆ ناسوت

اجسام و محسوسات کی دنیا۔

◆ ملکوت

فرشتوں اور نفوس و ارواح کی دنیا۔

◆ جبروت

آسمانی دنیا ستاروں سے اوپر کا مقام۔

◆ ہمہ اوست

وحدت الوجود کی صورت۔

◆ خاطر

خیال جو دل پر چھا جائے۔

◆ ہاجس

دل میں گزرنے والا خیال۔

◆ احادیثِ نفس

نفس کی باتیں یعنی نفس کی خواہشات پر مبنی خیالات۔

◆ ہیئتِ وحدانی

تمام اطائفِ بجم پورا جسم ہیئتِ وحدانی کہلاتا ہے۔

* ● ● ● *

اصطلاحات نقشبندیہ

◆ رابطہ شیخ

نقشبندی طریقہ کے پرانے اسلوب کے تحت ہر وقت ہر جگہ قلب میں تصورِ شیخ کے ذریعے شیخِ طریقت سے اپنا رابطہ قائم رکھنا، رابطہ شیخ کہلاتا ہے۔ اس کو تصورِ شیخ بھی کہتے ہیں۔

ذیل میں دی گئی آٹھ اصطلاحات (ہوشِ دردم، نظرِ بر قدم، سفرِ در وطن، خلوتِ در انجمن، یادِ کرد، بازگشت، نگہداشت اور یادداشت) حضرت عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔ جبکہ انکے بعد تین اور اصطلاحات (وقوفِ زمانی، وقوفِ عددی اور وقوفِ قلبی) کا خواجہ خواجگان حضرت شاہ نقشبند بخاری قدس سرہ نے اضافہ فرمایا ہے۔ اس طرح اصطلاحات سلسلہ نقشبندیہ کی تعداد گیارہ ہے۔

◆ ہوشِ دردم

یہ اصل میں پاسِ انفاس ہی ہے۔ یعنی سالک کا ہر سانس حضور و آگاہی یعنی ہر دم ہوش میں ہوتا کہ کوئی سانسِ غفلت و معصیت میں نہ گزرے اور ہر وقت سانس کی حفاظت کرے تاکہ رابطہ ٹوٹنے نہ پائے اور وابستگی قائم رہے۔ حدیث شریف میں ہے: ”اَلْكَيْسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2459]

ترجمہ: ”ہوشیار وہ شخص ہے کہ جس نے اپنے نفس کو ڈرایا“

حضرت خواجہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کسی سانس کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یعنی سانس کے دخول و خروج اور خروج و دخول کے درمیان محافظت درکار ہے تاکہ کوئی سانسِ غفلت میں نہ گزرے۔ اگر غفلت محسوس کرے تو استغفار کرے اور آئندہ غفلت ترک کرنے کا ارادہ کرے۔ کیونکہ اسی غفلت کے سبب انسان معاصی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہوشِ دردم تفرقہ اندرونی کے دفعیہ (یعنی دور کرنے) کے لیے ہے۔

◆ نظر بر قدم

یعنی نظر کی حفاظت کرنا۔ اس کے لیے اپنی نگاہ اپنے پاؤں کی طرف رکھنا۔ کیونکہ نیچی نظر رکھنا سنتِ رسول ﷺ ہے اور اس میں دل کی حفاظت ہے کیونکہ نظر دل کا دروازہ ہے۔ غلط جگہ نظر پڑنے سے دل متاثر ہو سکتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ اپنے مبدائے فیض پر نظر رکھنا ہے۔

◆ سفر در وطن

سفر در وطن کے معنی ہیں ”اپنے باطن میں سفر کرنا۔“ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی بشری صفات سے ملکی صفات کی طرف بتدریج لوٹے اور روح جو بشریت کے جامے میں آکر صفاتِ ذمیمہ کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کو صفاتِ حمیدہ سے ہمکنار کرتا رہے۔ یعنی طلبِ جاہ، بغض، حسد، کینہ وغیرہ کو دل سے نکال باہر پھینک کر اور اپنے دل کو ان سے بالکل پاک کر کے صفاتِ حمیدہ کی طرف انتقال کرنا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو مجازیب متمکن کے سمجھنے کی ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ روح نفس کی وجہ سے صفاتِ ذمیمہ کا شکار ہو گئی ہے۔ پس نفس کا زور جب تک جاری رہے گا۔ صفاتِ ذمیمہ سے خلاصی کیسے ہوگی؟ جذب کی وجہ سے اگر کوئی مقامِ قلب میں آجائے تو اس کو اپنے محبوبِ اصلی کا پسندیدہ طریقہ نظر تو آئے گا لیکن اس محبوبِ اصلی کے عرفی وصال میں اخلاقِ ذمیمہ کا جو پہاڑ حائل ہے۔ اس کو سر کیے بغیر کامیابی کیسے ممکن ہے؟ اسی لیے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سلوک کے دس مقامات تفصیلی طے کرنا بتایا ہے۔ صرف قلبی اسباق سے ایسا حاصل ہونا کیسے ممکن ہے؟

◆ خلوت در انجمن

خلوت در انجمن کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل سے خدا کے ساتھ مشغول رہے۔ چاہے خلوت ہو چاہے جلوت اور اپنے تمام روزمرہ کے مشاغل مثلاً اکل و شرب، نشست و برخاست، معاملات اور فہم و ادراک وغیرہ پر اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق کو قائم رکھے۔ خواجہ خواجگان حضرت شاہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلوت در انجمن

ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب مخلوق میں حق کے لیے مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہونا ہو، اس وقت بھی دل حق کی طرف مکمل متوجہ ہو۔

◆ یاد کرد

یاد کرد ذکر اور گیان کے ہم معنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنے شیخ سے سیکھے ہوئے ذکر بروقت ادا کرنا۔ ذکر اس کثرت سے کرے کہ اللہ جل شانہ کی حضوری حاصل ہو جائے۔

◆ بازگشت

یعنی رجوع کرنا یا پھرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے ذکر کے بعد تین بار یا پانچ بار مناجات کی طرف رجوع کرے۔ حضرت شاہ نقشبند قدس سرہ کی یہ دعا تھی ”الہی مقصود من توئی و رضائے تو، محبت و مغفرت خود بدہ۔“ (اے اللہ میرا مقصود تو ہی ہے اور اپنی خوشنودی اپنی محبت اور مغفرت عطا کر) حضرت شاہ نقشبند قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ دیکھا سنا جائے اور جانا جائے وہ سب غیر خدا ہے۔ کلمہ طیبہ کی ”لا“ سے سب کی نفی کرنی چاہیے۔

◆ نگہداشت

اس سے یہ مراد ہے کہ ذکر اپنے قلب کے بارے میں خبر رکھے اور کمال ہوشمندی سے رہے اور دل میں غیر خدا کے جو وساوس و خیالات آئیں، اُن کا ابتدا ہی سے تدارک کرے۔ ورنہ طبیعت کے اس طرف مائل ہونے کا خطرہ ہے۔ پھر نجات مشکل ہو سکتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خطرہ کو ایک ساعت بھی دل میں نہ رکھنا چاہیے۔ بزرگوں کے نزدیک یہ بہت اہم ہے۔ اولیائے کاملین کو یہ دولت طویل عرصہ تک حاصل رہتی ہے۔

◆ یادداشت

یہ فکر اور دھیان کے ہم معنی ہے۔ اس سے مراد دوام آگاہی بحق سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ یہ نگہداشت کہ جس میں طالب اپنی کوشش سے اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے اور اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں سالک خود بخود اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول و مخاطب ہوتا ہے۔ یہ مقام منتہی کو فنا و بقا کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد چاہے جیسی بھی حالت ہو اس سے متاثر ہو کر سالک اپنے محبوب حقیقی سے غافل نہیں ہوتا۔

◆ وقوفِ زمانی

یہ نفس کے محاسبہ کے لیے ہے کہ دیکھا جائے کہ کس طرف جا رہا ہے۔ تاکہ اگر غلط سمت میں جا رہا ہو تو اس کو درست کرنے کی تدبیر فی الفور کی جائے۔ عام طور پر یہ متوسط کے لیے ہوتا ہے۔

◆ وقوفِ عددی

وقوفِ عددی سے مراد سالک کا اثنائے ذکر اس بات کا اہتمام کرنا ہے کہ طاق عدد پر کرے نہ کہ جفت عدد پر۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے: ”إِنَّ اللَّهَ وَتُرُجُّبُ الْوَتْرُ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6985]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے“ لیکن ذکرِ عددی کے ساتھ ذکرِ قلبی بھی ضروری ہے۔

◆ وقوفِ قلبی

اس سے مراد یہ ہے کہ سالک ہر وقت ہر لحظہ اپنے قلب کی طرف متوجہ رہے اور قلب خدا کی طرف متوجہ رہے۔ تاکہ سب طرف سے توجہ ٹوٹ کر معبودِ حقیقی کی طرف ہو جائے اور وساوس و خطراتِ دل میں داخل ہی نہ ہونے پائیں۔ خصوصاً جلسہ ذکر کے دوران اُس کا پورا خیال رکھے۔ یہاں زندگی کو پیش آنے والے مختلف مراحل میں خدا کے پسندیدہ و ناپسندیدہ کام کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ گویا ہر پیش آنے والے

امر پر یہ فیصلہ کرے کہ یہ کام خدا کو ناپسند ہے۔ اس لیے مجھے اس کا ترک کرنا ضروری ہے اور اس میں خدا کی پسندیدہ صورت وہی ہے جس پر کاربند ہونا میرے لیے لازمی ہے۔ بس اسی کا نام وقوفِ قلبی ہے۔ وقوفِ قلبی شاہ نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بہت ضروری ہے اور یہ رکنِ عظیم ہے۔ طریقہ سلسلہ نقشبندیہ کا دارومدار اسی پر ہے۔

◆ تربیت کا انحصار تین چیزوں کی اصلاح پر

انسان کے کردار کا انحصار تین چیزوں پر ہے: نفس، دل اور عقل۔ ان میں اعتدال ہو تو کردار اچھا ہے ورنہ جتنی بے اعتدالی ہوگی اتنی خرابی ہوگی۔ ان تینوں میں بے اعتدالی کو اعتدال پر لانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ وہ طور طریقے جن کے استعمال سے کسی شخص کا کردار اللہ تعالیٰ کا مقبول کردار بن جائے اسی کو طریقت کہتے ہیں۔

ان تینوں کی اصلاح کے لیے مختلف طریقے مختلف سلاسل میں رائج ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ بنیادی بات سلوک کا طے کرنا ہے۔ کچھ حضرات اس کو ابتدا ہی میں طے کراتے ہیں کچھ اس کے لیے پہلے جذب کسبی حاصل کرتے ہیں۔

◆ مقاماتِ سلوک

توبہ، انابت، ریاضت، قناعت، تقویٰ، زہد، صبر، توکل، تسلیم اور رضایہ وہ دس مقامات ہیں جن کا تفصیل کے ساتھ طے کرنا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر سالک کے لیے لازمی ہیں۔ اس میں توبہ تو رجوع الی اللہ کی ابتدا اور گناہوں سے رکننا ہے۔ انابت خیر کے اعمال کی طرف میلان کا بڑھانا ہے۔ اس کے لیے ریاضت سے جسم کو مشتقوں کا عادی بنانا ہے۔ یہ مقام ریاضت ہے۔ قناعت سے دنیا کی طرف میلان کم کرنا ہے جو مقام قناعت ہے۔ پھر زہد سے اس پر نفس کو عمل پہ لانا ہے۔ یہ مقام زہد ہے۔ تقویٰ ان سب کا لازمی نتیجہ ہے لیکن اس کا عملی نفاذ کرنا ایک الگ شعبہ اور مقام یعنی مقام تقویٰ ہے۔ تقویٰ جب حاصل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ آنہونی میں ہونا دکھاتا ہے۔ جس سے توکل کو فروغ ہوتا ہے جو مقام توکل ہے۔ اس کے بعد سالک سب کچھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریحی ہو یا تکوینی تسلیم کر لیتا ہے، اسی کو مقام تسلیم کہتے ہیں

جس کا لازمی نتیجہ صبر ہے جو پورے دین کی جان ہے اور یہی مقام صبر ہے۔ اس کے بعد انسان صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے قلباً قابلاً قالاً اور حالاً راضی ہوتا ہے جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بعد فی الحقیقت تو آخرت میں اور بشارتاً اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتے ہیں گویا کہ ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ اذْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّاتِي“ [سورۃ الفجر: 27-30]

اسی کو نفس مطمئنہ کا مقام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اصل مقامات کیا ہیں اور دعوے کیا ہیں۔ ان میں سے کونسی چیز ہے جو مراقبہ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے؟ مثلاً مقام رضا ہی کو لیجیے جو کہ آخری مقام ہے۔ اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی سوچ ہے اور ایک راضی ہونا ہے۔ یہ سوچ راضی ہونے کی اہمیت کے علم اور نفس کے اس پر راضی ہونے کے درمیان کی حالت ہے۔ یہ درمیان کی حالت تو بیشک کوئی مراقبہ کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے جو کہ جذب کسبی میں حاصل ہو جاتی ہے لیکن نفس کا اس پر راضی ہونا نفس کی تربیت و اصلاح کے بعد ہی ممکن ہے جس کے لیے سلوک کا طے کرنا لازم ہے۔ اسی پر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب نمبر 287 میں زور دیا ہے۔ جب یہ دس مقامات طے ہو جائیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ نفس نے ماننا سیکھ لیا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور عقل کو بات سمجھ آگئی۔

جب یہ تین چیزیں یعنی نفس، قلب اور عقل درست ہو جائیں تو سیر الی اللہ مکمل ہو جاتی ہے اور سیر فی اللہ شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے نفس نے روح کو جکڑا ہوتا ہے اور نفسانی خواہشات انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں بلکہ اپنے میں مگن رکھتی ہیں، اس لیے جیسے ہی نفس سے روح آزاد ہو جاتی ہے تو یہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور روح ملائے اعلیٰ جا کر اللہ تعالیٰ کا روحانی مشاہدہ شروع کر لیتی ہے۔ یہ کیفیت احسان کا ابتدائی درجہ ہوتا ہے۔ سالک جتنا جتنا اپنے ارادے سے غیر سے اپنے

آپ کو جتنا جتنا یکسو کرتا رہتا ہے اتنی اتنی اس کی کیفیت احسان میں ترقی ہوتی ہے۔ اس وقت قلب روح کے ذریعے لیتا ہے اور نفس مطمئنہ کے ذریعے اپنے آپ پر نافرمان کرتا ہے اور عبادت میں نفس کو مشغول کر دیتا ہے اور باقی اوقات میں اس سے کیفیت حضوری حاصل ہوتی ہے۔ جس وقت عقل قلب کی ایمانی کیفیت سے منور اور ایمانی اخبار سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اس کا بھی عالم بالا کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس تعلق کی بنیاد پر اس کے مناسب حقائق چلتے ہیں اور مکاشفات ہوتے ہیں اس وقت یہ سر کہلاتا ہے۔ جس کے ذریعے اس کی عقل سر بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے حقیقت اور فقہت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے جس سے ہدایت اور معرفت کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ پس اسی سے تقویٰ میں ترقی ہو رہی ہوتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ پھر جیسے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جس کے دل کی صفائی زیادہ ہو وہ صدیقین میں ہو جاتا ہے اور جس کی عقل میں صفائی زیادہ ہو وہ علمائے را سخن میں ہو جاتا ہے اور جس کے نفس میں صفائی زیادہ ہوتی ہے وہ زُہاد میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سب حضرات گو منتہی کہلاتے ہیں لیکن ان کی تشکیل اپنی اپنی ہوتی ہے۔

اس درجے میں پختگی کی حالت میں مجاہدہ اور مشاہدہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایسے حضرات میں بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر لمحہ مجاہدہ بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہوتا ہے کیونکہ ان کے نفس کی جو رکاوٹ ہوتی ہے وہ بالکل ختم ہو چکی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے اعمال تو نفس کے ذریعے ہوتے ہیں اور نفس کی جو اپنی فطرت ہے کہ وہ آرام ہی چاہتا ہے تو جس قدر بھی مجاہدہ ہو رہا ہوتا ہے اسی لمحے ان کا اتنا ہی مشاہدہ بھی ہو رہا ہوتا ہے تو یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں البتہ جو ناپختہ لوگ ہوتے ہیں ان میں ہو سکتا ہے کہ دو طرح کے لوگ ہوں ایک یہ کہ جس میں مجاہدہ ہی نہ ہو اور دوسرا وہ جس میں مجاہدہ ہو لیکن مشاہدہ نہ ہو اور وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جو نفس ہے اس میں سے اعمال کا کچھ حصہ اپنے لیے رکھ لیتا ہے یا اپنے اوپر نظر چلی جاتی ہے تو جو کیفیتِ لہیت ہے جو اس کے ساتھ مقصود ہے وہ نہیں ہوتی ہے اس وجہ سے مجاہدے کا کچھ حصہ بغیر مشاہدے کے ضائع ہو جاتا ہے تو اس میں یہ کافی باریک نکتہ ہے۔

◆ ایک اہم بات

اس نظامِ تربیت میں یہ بات سب سے اہم ہے کہ ان تینوں (قلب، عقل اور نفس) کی اصلاح ہو تو سب کی اصلاح مکمل ہوگی ورنہ کسی کی بھی نہیں ہوگی۔

◆ صرف نفس کی اصلاح پر نظر رکھنا

اگر صرف نفس کی اصلاح پر نظر ہو اور اس کے علاج کے لیے مجاہدات جو اس کا قدرتی علاج ہے کرتے ہوئے دل اور عقل کی اصلاح سے غفلت ہو جائے تو یہ مجاہدات جوگ کاروپ دھار لیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو جوگی کی صورت میں بزرگی کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ لوگ بھی ان کی محنت شاقہ کو دیکھ کر ان کے معتقد ہوتے ہیں۔ عقل کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے غلط فلسفے بھی جھاڑنا شروع کر لیتا ہے۔ شیطان اس کے دل پر قبضہ کر لیتا ہے اور بعض دفعہ ایمان کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ کسی ایک دینی لائن میں مجاہدہ کی صورت میں اس لائن کی اہمیت ذہن میں ضرورت سے زیادہ بیٹھ جاتی ہے اور صرف اسی کے ہو کر باقی دینی کاموں کی مخالفت بھی شروع کر لیتا ہے۔ چونکہ عقل پہلے سے ہی گمراہ ہوتی ہے اس لیے اپنی گمراہی کے لیے جو مستدل و ضعیف روایتیں ملیں چاہے ضعیف احادیث ہوں، چاہے خواب ہوں، چاہے کشف، ان کی بنیاد پر قرآن اور سنت کے روشن دلائل کو پس پشت رکھ کر جیتا جاگتا فتنہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے سب کو امان میں رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مندرجہ بالا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

◆ اگر صرف دل کی اصلاح ہو تو؟

اس صورت میں جب سالک کافی آگے چلا جاتا ہے تو نفس کی اصلاح بالکل بھول جاتا ہے۔ اپنے نفس کی اصلاح بھی ذکر، اذکار اور مراقبات کے ذریعے کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ان کی افادیت سے تو انکار نہیں لیکن ہر چیز کا اپنا دائرہ کار ہوتا ہے اس کی اپنے دائرہ کار میں افادیت کو دیکھ کر اگر اس کو کسی دوسرے دائرہ کار میں استعمال کیا جائے تو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ یہ ایسا ہوگا جیسے آنکھ سے کوئی سننے کی کوشش کرے۔ یہ جو علاجی فاعلات ہیں یہ تو دل بیدار کرنے کے لیے ہیں اور دل جب بیدار ہو جائے تو اس کے

ذریعے نفس کو اصلاح کے لیے آمادہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت وہ آسانی کے ساتھ آمادہ ہو سکتا ہے اور جب وہ اپنی اصلاح کے ڈگر پر چلنے لگتا ہے یعنی سلوک کے دس مقامات طے کرنے پر تو نفس کی اصلاح ہونے لگتی ہے۔ اس میں ہر مقام دوسرے مقام کے لیے بنیاد بنتا ہے۔ اگرچہ صلاحیتیں اور احوال ہر سالک کے مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کی ضرورت کا درجہ ہر ایک کے لیے مختلف ہوتا ہے لیکن گزرنا سارے مقامات سے ضروری ہے تاکہ نفس کی رکاوٹ پر قابو پایا جاسکے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور دل کی اصلاح کو ہی کافی سمجھ لے تو ایسے حضرات کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مجذب متمکن فرماتے ہیں اور مزید یہ فرماتے ہیں کہ نہ یہ خود پہنچے ہیں نہ ہی دوسروں کو پہنچا سکتے ہیں۔

◆ اگر صرف عقل کی اصلاح ہو تو؟

اگرچہ اہل حق کے ہاں سلوک طے کرنے میں اس کا کوئی ذکر ایسا نہیں آیا ہے کہ کوئی صرف عقل کی اصلاح کرتا ہو لیکن فلسفیانہ تصوف جس کو بعض حضرات صحیح تصوف سمجھتے ہیں ان کے ہاں یہی ہوتا ہے۔ ایسے حضرات باقی سب لوگوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور خود کو عقل کل۔ ان کے کچھ نام نہاد مراقبات ہوتے ہیں جس میں اپنے اوہام اور خیالات کو پالتے رہتے ہیں۔ ان پر پہلے فلسفہ کا رنگ چڑھا ہوتا تھا اب آج کل سائنس کا دم بھرتے ہیں حالانکہ یہ بات طے ہے کہ سائنس ایک تدریجی ترقی پذیر علم ہے اور قرآن و سنت خالق حقیقی کی طرف سے بھیجا گیا علم ہے۔ اس لیے سائنس بتدریج ان چیزوں کو ثابت کرتی رہے گی جو مذہب نے سکھائی ہیں لیکن جہاں تک نہیں پہنچی اس میں اس سے رہنمائی لینے میں خسارے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا رول ایک خادم کا ہے۔ اس کو جو دین کا مخدوم بنائے گا اس نے نہ دین کو سمجھانے سائنس کو۔ اس لیے صرف عقل کی اصلاح کا دم بھرنے والے چونکہ اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور صرف گہری گہری باتیں کرنے کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آج کل ایک اس قسم کے متفکر کی بات میں نے سنی کہ تقریر کر رہے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ترجیح نہیں دو گے اس وقت تک مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس پر دلائل پر زور جاری تھے، لیکن خود کلین شیو تھا اور اس کے

جسم پر شریعت کی اتباع کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ نماز کی پروا نہیں۔ عملیات کا بازار گرم اور یہی بات اکثر لوگ جانتے ہیں۔ لوگ نفس کی آزادی چاہتے ہیں۔ باتوں کی حد تک بعض ہندو بھی آپ ﷺ کی محبت میں نعتیں لکھتے ہیں لیکن کیا اس سے ان کی آخرت میں نجات ہوگی؟

◆ سلوک کا مجاہدہ

سلوک میں مقامات کے طے کرنے میں مجاہدہ کی ضرورت تو پڑتی ہے کیونکہ نفس نے روح کو باندھا ہوتا ہے۔ نفس سے روح خود بخود آزاد نہیں ہو سکتی الا ماشاء اللہ۔ شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کافی مشہور ہے وہ جسمانی مجاہدہ تھا لیکن مجاہدے کی کئی قسمیں ہیں۔ اس میں ایک قسم نفسیاتی مجاہدے کی ہے جو جسمانی مجاہدے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے جیسا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا جو واقعہ ہے کہ آپ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کو فصوص الحکم کا درس دے رہے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا نسخہ پرانا تھا تو خواجہ صاحب کی زبان سے نکلا حضرت میرے پاس ایک نیا نسخہ آیا ہے تو کیا میں وہ نیا نسخہ لے آؤں یہ پرانا ہو چکا ہے۔ تو حضرت نے ذرا بے دھیانی سے فرمادیا، ہاں آپ کا نسخہ تو اچھا ہی ہوتا ہے۔ بس اس طرح فرمادیا اور آگے درس جاری رکھا۔ تو حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے سمجھ گئے کیونکہ وہ تو مزاج شناس تھے تو انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب کچھ پتہ ہے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ خواجہ صاحب نے کہا: نہیں۔۔۔ صاحبزادے نے فرمایا: یہ حضرت کے ناگواری کے الفاظ ہیں۔ اب خواجہ صاحب کو احساس ہو گیا سمجھ میں بات آگئی کہ ان سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ انہوں نے فوراً معافی مانگ لی پھر بھی کام نہیں ہوا۔ پھر معافی مانگی پھر بھی کام نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ہوتے ہوتے رونا شروع کر لیا پھر بھی کام نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ان کے جوتے سر پر رکھ کر رونا شروع کر لیا معافیاں مانگی پھر بھی کام نہیں ہوا جب بہت زیادہ رونا شروع کر لیا اور خوار و نچل ہو گئے تو صاحبزادے نے سفارش کی کہ حضرت اب تو میرے خیال میں ان کو معاف کر دینا چاہیے کوئی بات نہیں تو معافی ہو گئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی سفارش پر معاف کر دیا اور ساتھ ہی اجازت بھی دے دی اور فرمایا یہ آپ کی تکمیل کے

لیے تھا۔ مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آخری دن اُن کی اتنی دھنائی ہوئی اتنی دھنائی ہوئی باتوں باتوں میں اور یہ حالت ہوئی کہ کہتے ہیں مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی اور میں سمجھا کہ مجھ سے تو یہ کیرے بھی اچھے ہیں۔ میری کیا حالت ہے اور اپنے آپ سے مجھے گھن آنے لگی۔ تو کہتے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد حضرت کا خادم آیا کہ حضرت آپ کو بلا رہے ہیں کہتے ہیں یہ سن کر میری توجان نکل گئی کہ اب پتا نہیں کیا ہوگا۔ تو ڈرتے ڈرتے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے اپنے مشائخ سے جو اجازت پہنچی ہے۔ جو امانت پہنچی ہے۔ میں اللہ پر توکل کر کے آپ کو اجازت دیتا ہوں تو کہتے ہیں میرے پیروں سے جان نکل گئی کہ یا وہ حالت یا یہ حالت تو ظاہر ہے وہ مجاہدہ تھا تو مجاہدہ کی قسمیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے ہر ایک کا ایک جیسا مجاہدہ تو نہیں ہوتا بلکہ جس کو آپ مجاہدہ سمجھتے ہوں وہ مجاہدہ ہی نہیں ہوگا۔ اس قسم کے جو طریقے ہوتے ہیں وہ ہمارے مشائخ نے بہت ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ بہت سارے طریقے مجاہدے کے ہیں جس سے وہ سلوک طے کر دیتے ہیں لہذا اس کی detail (تفصیل) میں نہیں جانا چاہیے نہ اس پر زیادہ بحث کرنا چاہیے یہ ہمارا میدان نہیں ہے یہ شیخ کی صوابدید پر ہے۔ بہر حال سلوک طے کرنا لازم ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کا سلوک طے کرادے۔ آمین

* * * * *

حاصل تصوف

حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی محسوس ہو، سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے اور جس گناہ کا تقاضا ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، جس کو یہ بات حاصل ہو گئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔“

◆ صحبتِ صالحین کے فائدے

سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے جو دعائیں فرمائی ہیں اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ [الفاتحہ: 5-7]

اس میں ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ عنایت فرما۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہے نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غصہ ہے اور نہ ان کا جو گمراہ ہو چکے ہیں۔ انعام کن لوگوں پر ہو چکا ہے ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو انبیا ہیں۔ صدیقین ہیں۔ شہدا ہیں اور صالحین ہیں۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور باقی تینوں ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [البقرہ: 119] یعنی صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ اس آیت مبارکہ میں صادقین کے ساتھ ہونے کا چونکہ حکم الہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت تک صادقین پیدا کرتے رہیں گے۔ شہدا بھی ہر دور میں ہیں اور صالحین بھی۔ صرف کتاب کے ذریعے حق اور باطل کا واضح ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ اگر یہ واضح ہو بھی جائے تو اکثر و بیشتر عمل کی توفیق تب ہی ملتی ہے جب صالحین کی صحبت میسر ہو۔ کیونکہ انسان پر صحبت کا اثر لازماً ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف ہے کہ

بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر والدین اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اس لیے صالحین کی صحبت کے حاصل کرنے پر بہت زور ہے اور اس کے بالمقابل صحبتِ بد سے بچنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ بقول مولانا روم:

یک ساعت در صحبتے باولیا
بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

صد سالہ بے ریا کی جو طاعت ہے ، سے بہتر
صحبت میں اولیا کی ایک ساعت بنے اکثر

صحبتِ صالح کی مثال عطار کی دی گئی ہے کہ اور کچھ نہ ہو تو بھی عطر کی خوشبو تو نصیب ہو ہی جاتی ہے اور صحبتِ بد کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے کہ اور کچھ نہ بھی ہو تو دھواں تو پریشان کرتا ہی ہے۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ اپنی صحبت کا خیال رکھنا چاہیے نہیں تو نتیجہ بہت خراب ہو سکتا ہے۔ بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ:

صحبتِ صالح ترا صالح کند

صحبتِ طالح ترا طالح کند

صحبتِ صالح سے تو صالح بنے

صحبتِ طالح سے تو طالح بنے

جو شخص خدا تعالیٰ کی ہم نشینی کا طالب ہو، اس کو اولیا کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے۔ صحبتِ نیکوں کے متعلق یہ غزل بہت عجیب اور مناسب ہے جو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور قطعہ ”گلے خوشبوئے در حمام روزے“ کا ترجمہ ہے۔

اک دن ملی حمام میں مٹی اک خوشبودار

محبوب کے ہاتھوں سے نرم نرم مزیدار

پوچھا کہ کیا تو مٹک ہے عنبر ہے بتا دے
 خوشبو سے تری دل مرا بس مست ہے سرشار
 وہ کہہ اٹھی ناپیجز ہوں مٹی ہی ہوں فقط
 مدت سے ایک پھول کی صحبت ہے اختیار
 مٹی ہی ہوں کچھ بھی نہیں جو بھی ہوں وہی ہو
 ہیں مجھ پہ ہم نشین کے جمال کے آثار
 شبیر نے صحبتِ صالحین کے لیے یہ
 سعدی کے بیاض سے ہیں چن لیے کیا خوب اشعار

◆ ضرورتِ شیخ

جیسا کہ بتایا گیا کہ نیک ہونے کے لیے نیکوں کی صحبت ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی عام بات ہے جس کو ہر ایک جانتا ہے۔ لیکن باقاعدہ تربیت کے لیے کسی ایک نیک شخص کے ساتھ تعلق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس کو تربیت کا فن بھی آتا ہو اور اس کی صحبت میں برکت بھی ہو۔ عادت اللہیوں ہی جاری ہے کہ کوئی کمال استاد سے سیکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ پس جب اس راہِ طریقت میں آنے کی توفیق ہو تو استادِ طریقت کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔ جس کے فیض، تعلیم، برکت و صحبت سے مقصودِ حقیقی تک پہنچے گا۔

سفرِ عشق پہ جانا نہیں رہبر کے بغیر
 جو چلا عمر گزاری عشق کے اثر کے بغیر

چنانچہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”جھلازری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کے بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جاسکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کش دیکھے ہرگز کوئی

خوش نویس نہیں بن سکتا۔ ایسی ہستی اگر کسی کو میسر ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر ان سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اسی ہستی کو طریقت میں شیخ کہتے ہیں۔ ویسے تو شیخ عربی میں بوڑھے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس سے مراد رہبر کامل ہے جس کا ہاتھ پکڑنے سے مقصود حاصل ہونے کی قوی امید ہوتی ہے۔“

◆ مشائخ سے کیا پوچھنا چاہیے؟

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کتابوں میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اختیاری امور کے لیے ہمت سے کام لینا چاہیے اور جو امور اختیار میں نہیں ہیں ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ نیز مقصود اور غیر مقصود کا پتا بھی لگ گیا تو پھر شیخ کی کس لیے ضرورت ہے؟ یا ان کی صحبت مفید تو ہے لیکن ان سے کن چیزوں کے بارے میں پوچھنا چاہیے؟ ایک طالب کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریر فرمایا ہے۔ اس کا لب لباب یہاں دیا جاتا ہے۔ حضرت کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ مقاصد یعنی جن چیزوں کے کرنے کا حکم ہے یا جن سے رکنے کا حکم ہے۔ وہ سب اختیاری اعمال ہیں۔ باوجود اس کے سمجھ جانے کے، سالک سے کچھ ایسی غلطیاں ہو سکتی ہیں کہ اصل مقصود حاصل نہیں ہو پاتا۔ مثلاً کبھی تو کوئی مقام حاصل ہو چکا ہوتا ہے اس کو غیر حاصل سمجھتا ہے۔ مثلاً کسی کو مجاہدے سے خشوع کا مقصود درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کو غیر اختیاری وساوس پیش آرہے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ ابھی مجھے خشوع حاصل نہیں ہوا۔ لہذا اس کے غم میں گڑھ رہا ہے۔ دوسری طرف بعض اوقات جو مقام حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ بد پرہیزی کی وجہ سے باقی نہیں رہتا، لیکن غفلت کی وجہ سے یہ اس کا ادراک نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے اس کو خشوع کا مقصود درجہ حاصل تھا۔ لیکن اب یہ وساوس سے متاثر ہو کر اس میں اپنا ارادہ بھی شامل کرتا ہے جس سے وساوس غیر اختیاری نہیں رہتے بلکہ اختیاری بن جاتے ہیں۔ لیکن سالک ان کو غیر اختیاری سمجھ رہا ہوتا ہے۔ کبھی سالک کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس نے کسی رزیلے پر قابو پا لیا ہے لہذا وہ اس سے بے فکر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ موقع پر پتا چل جاتا

ہے کہ ایسا نہ تھا۔ مثلاً دو چار خفیف حادثوں میں رضا بالقضا کا احساس ہو جس سے وہ یہ سمجھا کہ مجھے رضا کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ پھر کوئی بڑا حادثہ ہو اور اس میں رضا نہیں ہوئی، یا درجہ مقصود تک نہیں ہوئی، مگر یہ اسی دھوکے میں رہا کہ مطلوبہ رضا حاصل ہے۔ اس طرح حاصل کو غیر حاصل سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ مایوس ہو کر سالک کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ حاصل کردہ نعمت بھی سچ مچ زائل ہو جاتی ہے اور غیر حاصل کو حاصل سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتا اور محروم رہتا ہے۔ غیر راسخ کو راسخ سمجھنے میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ سالک تکمیل کا اہتمام ترک کر دیتا ہے اور راسخ کو غیر راسخ سمجھنے کا نتیجہ پریشانی اور تعطل ہوتا ہے۔ مثلاً شہوتِ حرام کا مقابلہ کیا اور نئے نئے ذکر کی وجہ سے عالم شوق میں شہوتِ حرام کا تقاضا ایسا دب گیا کہ اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر ان آثار کا جوش و خروش کم ہونے سے طبعی التفات گو درجہ ضعیفہ میں سہی، لیکن ہونے لگا۔ یہ شخص سمجھا کہ سارا مجاہدہ بے کار گیا پھر اصلاح سے مایوس ہو کر سچ مچ شہوتِ حرام میں مبتلا ہو گیا۔ ہزار ہا مثالیں دی جاسکتی ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ محض معلومات سے عمل حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نظامِ اصلاح کی ایک عملی ترتیب ہوا کرتی ہے۔ جس پر عمل اس وقت ہو سکتا ہے جب سالک کسی شیخ کی نگرانی میں ہو۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ مرید کو شیخ سے اپنی اصلاح کے لیے کیسے رابطہ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ مرید کو اپنا حال، جو کچھ بھی ہے بلا کم و کاست اچھا ہے یا برا، شیخ کو بتانا چاہیے۔ سالک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی چیز پر اچھے یا برے کا حکم لگائے۔ یہ کام شیخ کا ہے کہ واقعات اور احوال کے تسلسل میں اس کو کیا سمجھتا ہے؟ وہ چاہے مرید کو اس کے بارے میں بتائے یا بغیر بتائے اس کو ایسا طریقہ بتادے کہ اس پر عمل کرنے سے اس کی بری حالت اچھی میں بدل جائے یا اچھی حالت میں مزید ترقی ہو۔ بعض دفعہ سالک کو علم تو ہوتا ہے لیکن تجربہ نہیں ہوتا اور اصلاح میں تجربہ کی افادیت سے کون منکر ہے؟ بعض دفعہ سالک اپنے لیے کوئی اچھی چیز تجویز بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے نسخے پر عمل سے اس کو اطمینان نہیں ہوتا، تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ شیخ سے جو

بات معلوم ہوتی ہے اس سے تشویش ختم ہو جاتی ہے۔ جو کہ یکسوئی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ نیز طالب اگر مخلص ہے تو شیخ کی عدم موجودگی میں اپنے لیے مشکل طریقہ پسند کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ جلد اصلاح چاہے گا۔ جس کے لیے مجاہدہ زیادہ کرنا ہوگا۔ حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی برداشت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر مجاہدہ کر کے اور اس میں ناکام ہو کر ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائے۔ جبکہ تجربہ کار شیخ راستے کی مشکلات کو جانتے ہوئے اس کی استعداد اور حالات کے مطابق زیادہ آسان طریقہ تعلیم کرے گا۔ جس سے مقصود میں کامیابی ہوگی اور بشاشت حاصل کر کے مزید ترقی کا بھی اہل ہوگا۔ جب کوئی سالک کام شروع کر کے شیخ کو اپنے احوال کی بالالتزام اطلاع کرتا رہے اور اس کے مشورہ کی اتباع کرتا رہے تو اس وقت اس کو محسوس ہوگا کہ شیخ کے بغیر مقصود تک رسائی عادتاً تقریباً ناممکن ہے اور یہ اتباع کامل اس وقت ہو سکتی ہے جب اس پر اعتماد ہو اور اس شیخ کی بات کے ماننے کا خود کو پابند کرے۔

◆ شیخ کامل کی پہچان

شیخ کے بارے میں جب معلوم ہوا کہ اس کی صحبت کتنی آسیر ہے اور بغیر اس کی رہبری کے مقصود پانا بہت مشکل ہے۔ تو یہ بھی لازم ہو گیا کہ شیخ کامل کی پہچان ہو۔ کیونکہ خدا نخواستہ کسی دنیادار یا ناٹھی شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو اس کی مثال یوں ہوگی کہ کوئی اپنی گاڑی کے لیے اناڑی ڈرائیور یا کسی ڈاکو کا انتخاب کر لے۔ الحمد للہ بزرگوں نے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شیخ کامل کی پہچان کی نشانیاں کھول کھول کر بیان کی ہیں جو یہاں درج کی جاتی ہیں۔ شیخ وہ ہے جو امراض باطنہ اور اخلاق رزیلہ و حمیدہ سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور سالک سے جو غلطیاں ہو سکتی ہوں، ان کو بھی جانتا ہو اور ایسے غلطی کرنے والوں کی اصلاح بھی کر سکتا ہو۔ نیز سلوک کے مختلف مراحل میں عروج و نزول سے واقف ہو اور نفس و شیطان کے اثرات اور ملکوتی اور ربانی تصرفات کی پوری واقفیت رکھتا ہو کہ ان کے درمیان تمیز کر سکے۔ اس لیے شیخ کا صاحب فن اور صاحب ذوق اور مجتہد ہونا ضروری ہے۔ اگر طریق کو محض کتب تصوف دیکھ کر یا لوگوں سے سن کر حاصل کیا ہو اور تربیت کرنے کے لیے بیٹھ گیا ہو، تو وہ

مرید کے لیے مہلک ہے۔ اس لیے کہ وہ طالب اور سالک کے حالات اور واردات و تغیر حالات کو نہیں سمجھتا، جس کو ابن عربی نے شیخ کی علامات میں مختصر آئین چیزوں پر موقوف کیا ہے۔ یعنی یہ کہ شیخ میں:

(1) دین انبیا کا سا ہو (2) تدبیر اطبا کی سی ہو (3) سیاست بادشاہوں کی سی ہو۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

(1) شیخ کا عقیدہ صحیح ہو یعنی صحابہ کرام کے عقیدے اس کے عقیدے ہوں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَإِنْ أَمِنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ [البقرہ: 137]

ترجمہ: ”اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہ راست پر آجائیں گے اور اگر یہ منہ موڑ لیں تو درحقیقت وہ دشمنی میں پڑ گئے ہیں۔ اب اللہ تمہاری حمایت میں عنقریب ان سے نمٹ لے گا اور وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔“

(2) اس کے پاس ”طَلَبَ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 224] کے مطابق فرض عین علم ہو۔

(3) اس پر عمل کرتا ہو۔

(4) اس کی صحبت کا سلسلہ آپ ﷺ کی صحبت تک پہنچتا ہو۔

(5) اس کو کسی بھی شیخ کامل سے تربیت کی اجازت ہو۔

(6) اس کا فیض جاری ہو یعنی سب کو محسوس ہوتا ہو۔

(7) وہ اصلاح کرتا ہو، مروت نہیں۔

(8) اس کی مجلس میں حسب الہی پیدا ہوتی ہو اور دنیا کی محبت سے دل سرد ہو رہا ہو۔ جس میں یہ علامات موجود ہوں اور اس کے ساتھ مناسبت بھی ہو، اس کی صحبت

کو اپنے لیے اکسیر اعظم سمجھے۔ وہ شخص اس قابل ہے کہ اس کو شیخ بنایا جائے اور اس کی زیارت و خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھے۔ ان کمالات و علامات کے بعد پھر شیخ کامل میں کشف و کرامات، تصرف و خوارق وغیرہ کو ہرگز نہ دیکھے کیونکہ ان کا ہونا شیخ کامل کے لیے ضروری نہیں۔

◆ مناسبتِ شیخ

یہ امر تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوضِ باطنی کے لیے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ کیونکہ نفع عادتاً الفت پر موقوف ہے۔ جو مناسبتِ فطری کی حقیقت ہے۔ یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخِ طالب کو اپنے پاس سے بعض دفعہ دوسرے شیخ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ مناسبتِ ظن یا کشف سے معلوم ہو۔ کیونکہ اس طریق میں مصلح کے ساتھ مناسبت ہونا بڑی ضروری چیز ہے۔ مناسبت کے بغیر طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبتِ شیخ جو فیض لینے اور دینے کا مدار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیخ سے مرید کو اس قدر انس ہو کہ شیخ کے کسی قول و فعل سے مرید کے دل میں طبعی نکیر پیدا نہ ہو، گو عقلی پیدا ہو۔ یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور شیخ کو مرید سے انقباض نہ ہو اور یہی مناسبتِ بیعت کے لیے شرط ہے۔ لہذا پہلے مناسبت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک یہ نہ ہو مجاہدات، ریاضت، مراقبات و مکاشفات سب بیکار ہیں۔ ان سے کوئی نفع نہ ہو گا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی پیدا کر لی جائے، اس پر نفع موقوف ہے۔ اس لیے جب تک پوری مناسبت نہ ہو بیعت نہیں کرنی چاہیے۔

◆ شیخِ کامل کی صحبت کے فائدے

- (1) شیخ کے اندر جو چیز ہو وہ آہستہ آہستہ مرید کے اندر آجاتی ہے۔
- (2) اصلاحِ کامل نہ بھی ہو تو کم از کم اپنے عیوب نظر آجائیں گے جو اصلاح کی کنجی ہے۔
- (3) آہستہ آہستہ مرید پر شیخ کا رنگ چڑھتا جاتا ہے جس سے وہ شیخ کے اخلاق و عادات میں اس کی اتباع کرنے لگتا ہے۔ شیخ کی صحبت میں جو افادات زبانی سننے

میں آتے ہیں وہ یا تو شیخ کی عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے جس کا مفید ہونا ظاہر ہے یا شیخ کے قلب پر مریدین کے لیے ان کے مناسب مضامین القا کیے جاتے ہیں جو تیر بہدف ثابت ہوتے ہیں۔

(4) شیخ کے سامنے اپنا بیچ ہونا مکشوف ہو جاتا ہے جو تواضع کی کنجی ہے۔

(5) اہل محبت کی صحبت سے مرید کے دل میں بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

(6) مشائخِ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے بابرکت ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تعلیم میں برکت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں خود کتابیں دیکھ کر علاج کرنا مفید نہیں ہوتا۔

(7) مقبولینِ الہی کی صحبت میں اگر آدمی اخلاص کے ساتھ رہ رہا ہو تو یا تو اس کی حالت اچھی ہوگی یا بری۔ اگر اچھی ہوگی تو اس سے یہ حضرات خوش ہوں گے اور دل سے ان کے لیے دعا گو ہوں گے۔ جس سے ان کو مزید ترقی حاصل ہوگی اور اگر مرید کی حالت بری ہے تو شیخ کو اس پر شفقت ہوگی اور وہ تعلیم سے اور دعا سے اس کی اصلاح کریں گے۔ اس لیے صحبت سے ہر صورت فائدہ ہوا۔

(8) مرید جب شیخ کی صحبت میں ہوتا ہے تو شیخ کے کمالات اس پر ظاہر ہوتے ہیں اور دین پر چلنے کا جو سلیقہ ان کو عطا ہوتا ہے وہ مرید کو بھی صحبت سے آہستہ آہستہ ملنے لگتا ہے۔ دوسری طرف شیخ پر مرید کے عیوب مکشف ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ مرید کے بارے میں بہتر سے بہتر رائے قائم کر لیتے ہیں جس سے مرید کی اصلاح کافی تیز ہو جاتی ہے۔

(9) ان حضرات کے دل خدا کی یاد سے روشن ہوتے ہیں۔ ان کے پاس رہنے سے وہ نور آہستہ آہستہ مرید کے دل میں بھی آجاتا ہے۔ جب یہ نور آتا ہے تو ظلمت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے مرید پر اپنی حیثیت اور اللہ تعالیٰ کی عظمت مکشف ہونے لگتی ہے۔ جس سے اس کی قلبی بیماریوں کی اصلاح خود بخود ہونے لگتی ہے اور اس کے اشکالات حل ہونے لگتے ہیں۔

10) شیخ کی خدمت میں رہ کر بزرگوں کی خدمت کا موقع مل جاتا ہے۔ بعض دفعہ قبولیت کی کوئی ایسی گھڑی مل جاتی ہے جس میں شیخ کے دل میں اس کے لیے ایسے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے یہ بہت جلدی واصل ہو جاتا ہے۔ اسی کو بعض حضرات توجہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

◆ غور طلب

شیخ کی صحبت کو حاصل کرنے پر حریص ہونا اچھی بات ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ لیکن یہ اس صورت میں فائدہ مند ہوتی ہے جب اس سے شیخ کو تکلیف نہ دی جائے اور اس کے مزاج کے مطابق ان مواقع میں صحبت حاصل کی جائے جو مواقع شیخ نے مریدین کے لیے کسی ضابطے کے مطابق مقرر کیے ہیں۔ ورنہ مریدین کے لیے شیخ کی صحبت کو حاصل کرنے کی وہ کوششیں سخت مضر ہیں جن سے شیخ کو تکلیف ہو۔ اس لیے شیخ کے مزاج کی اچھی طرح تحقیق کی جائے کہ وہ مریدین کو اپنی صحبت کس طرح میسر کرنا چاہتے ہیں۔ بس اسی طرح اس کو حاصل کیا جائے۔ ان میں جو اوقات میسر ہوں، اس وقت اگر ممکن ہو تو اپنے تقاضوں کو آگے پیچھے کر کے شیخ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کی جائے۔

◆ بیعت طریقت

جب کسی شیخ کامل کا پتا چل جائے اور ان کے بارے میں اطمینان ہو جائے اور وہ شیخ بھی تربیت کرنے پر آمادگی کا اظہار فرمائے تو اس کے لیے ایک معاہدہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جس کو بیعت ہونا کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس باشرع صاحب سلسلہ شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کیا جائے کہ اپنی تربیت کے لیے صرف اسی شیخ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا اور شیخ اس کی تربیت کا ارادہ کرے۔ یہ سنت مستحبہ ہے۔ اس کے ذریعے اکثر وہ نعمت عظیمہ حاصل ہو جاتی ہے جس کو نسبت کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مخاطب فرما کر علاوہ بیعت جہاد و بیعت اسلام کے التزام احکام و اہتمام اعمال کے لیے بیعت فرمایا ہے۔ یہ متعدد احادیث شریفہ سے ثابت ہے۔ جیسا کہ عوف بن مالک کی یہ حدیث ہے:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِسْعَةً أَوْ ثَمَانِيَةً أَوْ سَبْعَةً فَقَالَ: أَلَا تُبَايِعُونَ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: فَبَسَطْنَا أَيْدِيَنَا وَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَعَلَّامَ نُبَايَعُكَ؟ (فَعَلَى أَبِي شَيْءٍ نُبَايَعُكَ؟) قَالَ: عَلَى أَنْ تَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَالصَّلَاةَ وَالْحَمْسَ وَتَطْيِئُوا [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2450]

ترجمہ: ”یعنی حضرت عوف ابن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ نو آدمی تھے یا آٹھ یا سات۔ ارشاد فرمایا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا کہ کس امر پر آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بیعت کریں یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان امور پر کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو۔“

اس بیعت میں آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو خطاب کیا کہ یہ نہ بیعت اسلامی تھی نہ بیعت جہادی۔ لہذا اس حدیث میں مشائخ کے ہاں مروج بیعت کا صریح ثبوت ہے۔ جس طرح فقہ میں بہت سارے مجتہدین تھے لیکن ان میں چار اپنے شاگردوں کے ذریعے زیادہ معروف ہوئے اور ان کی فقہ محفوظ ہوئی۔ ان پر چلنے والے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہلائے۔ اسی طرح فن تصوف میں بھی بہت سارے سلسلے رائج ہوئے، ان میں چار سلسلے چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کو پاک و ہند میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جس صاحب کو جس سلسلہ کے ساتھ بھی مناسبت ہو اس کے ذریعے اس کو نسبت حاصل ہو سکتی ہے۔ کافی تو ایک ہی سلسلہ ہوتا ہے لیکن ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت فرماتے ہیں تاکہ سب کا ادب ملحوظ رہے اور سلسلوں کے تقابل سے بھی محفوظ رہے۔ جیسا کہ بعض مغلوب الحال لوگ کرتے ہیں۔

تمام سلسلوں کا ادب

سلسلوں کی مثال طب کی مختلف قسموں کی ہے۔ جیسے ایلو پیتھی، ہو میو پیتھی، طب

یونانی اور آکوپنچر وغیرہ۔ مطلوب صحت ہوتی ہے نہ کہ صحت حاصل کرنے کا طریقہ۔ اس لیے جس کو جس طریقے سے شفا حاصل ہو جائے، وہ اس کا اگر ممنون ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کو دوسری قسموں کو ناقص کہنے کا حق نہیں ہوگا۔ کیونکہ جس طرح مختلف لوگوں کے مزاج مختلف ہیں اس طرح ان کی شفا کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ لہذا جس کو جس قسم سے زیادہ مناسبت ہے اس سے علاج کرے گا تو جلدی صحت یاب ہوگا۔ اسی طرح روحانی صحت بھی مطلوب ہے۔ لیکن اس کو حاصل کرنے کے طریقوں میں آزادی ہے۔ جس سے جس کو مناسبت ہو وہ اس سے استفادہ کرے، لیکن باقی لوگوں کو جن کو دوسرے سلسلوں کے ساتھ مناسبت ہو، ان کو اپنے طریقے پر مجبور نہ کریں۔ جس طرح ہم ایک امام کی تقلید کر کے باقی اماموں کو بھی اولیا سمجھتے ہیں اور ان کی تقلید کرنے والوں کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کرتے، اسی طرح تصوف میں بھی کسی بھی طریقے کے ساتھ مناسبت ہو تو اس سے استفادہ کریں، لیکن دوسرے سلسلوں کو ناقص نہ سمجھیں۔

◆ حقیقتِ بیعت

بیعت جس کے اندر بیع کی صورت ہے۔ یہ شیخ کے ہاتھ بک جانا ہے۔ گویا اس میں اپنے آپ کو شیخ کے ہاتھ احکام ظاہرہ و باطنہ کے التزام کے واسطے بیچ دیا ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ طالب کو اپنے شیخ پر پورا اعتقاد اور کلی اعتماد ہو کہ یہ میرا خیر خواہ ہے۔ جو بھی مشورہ دے گا وہ میرے لیے نہایت نافع ہوگا۔ اس پر پورا اطمینان ہو۔ اس کی تجویز و تشخیص میں دخل نہ دے۔ یوں یقین رکھے کہ دنیا بھر میں میری جستجو اور میری تلاش میں میرے نفع کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اس کو اصطلاح تصوف میں وحدتِ مطلب کہا جاتا ہے۔ اس کے بغیر بیعت ہونا نافع نہیں۔ کیونکہ اصلاحِ نفس کے لیے شیخ سے مناسبت شرط ہے اور مناسبت کی پہچان یہی ہے کہ اس کی تعظیم اور قول و فعل اور حال پر قلب میں اعتراض نہ ہو۔ بالفرض اگر قلب میں اعتراض آئے تو اس سے رنجیدہ ہو اور گھٹن محسوس کرے۔ عوام کے لیے بیعت کی صورت البتہ نافع ہوتی ہے۔ بیعت سے ان کے قلب پر شیخ کی عظمت اور ایک شان طاری ہو جاتی ہے۔ جس

کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے قول کو با وقعت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواص کے لیے کچھ مدت کے بعد بیعت نافع ہوتی ہے۔ بیعت سے ہر دو جانب ایک خلوص اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ شیخ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ ہمارا ہے اور مرید سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے ہیں۔ ڈانواں ڈول حالت نہیں رہتی۔

◆ بیعت کرنے کا طریقہ

شیخ مرید کے داہنے ہاتھ کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرتا ہے اور کثیر مجمع کو بذریعہ رومال، چادر وغیرہ بیعت کیا جاتا ہے اور مستورات کو پردہ کے پیچھے جہاں ان کا کوئی محرم بھی ہو، رومال وغیرہ سے بیعت کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: لَا وَاللَّهِ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ غَيْرَ أَنَّهُ يُبَايِعُهُنَّ بِالْكَلامِ۔“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4983]

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا بلکہ نبی ﷺ ان کے ساتھ بات کر کے بیعت کرتے تھے۔“

اس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بغیر ان کو بیعت فرماتے تھے اور پھر فرماتے: میں نے تم کو بیعت کر لیا ہے۔ اسی لیے مشائخ میں عورتوں کو بغیر ہاتھ میں ہاتھ لیے زبانی طور پر یا کسی کپڑے وغیرہ سے بیعت کرنا معمول ہے۔ یہ بیان تو شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے کا ہے اور جو شخص شیخ کی خدمت میں نہ پہنچ سکے، وہ وہیں سے بذریعہ خط و کتابت، ٹیلی فون یا بواسطہ شخص معتبر بیعت ہو سکتا ہے۔ اس کو بیعت عثمانی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے بموقع بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں اپنے بائیں ہاتھ پر دائیں دست مبارک کو رکھ کر فرمایا کہ میں نے عثمان کو بیعت کر لیا۔

◆ بیعت کے وقت تعلیم

مریدین کو یہ بتانا چاہیے کہ:

- (1) ہر وقت اللہ تعالیٰ پر نظر ہو، عبادت صرف اس کی ہو، مانگنا صرف اس سے ہو، اسی کو راضی کرنے کے لیے تمام کوششیں ہوں اور ہر حال میں اس سے راضی ہوں۔
- (2) خوشی، غمی یعنی ہر حال میں سنت کی تلاش اور اس پر عمل ہو۔ جس پر عمل نہ ہو سکے اس پر دل سے ندامت اور استغفار ہو۔ اپنی ہر رائے کو سنت کے مقابلے میں بودی اور نکمی سمجھنا اور سنت پر عمل کرنے اور اس کو پھیلانے کا عزم ہی اپنا شیوہ ہو۔
- (3) تمام عبادات میں سنت طریقے کو جاننے کی اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش ہو۔ معاملات کی صفائی کا خیال اور اہتمام ہو۔ اپنی معاشرت کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کا عزم ہو اور دل کے روحانی امراض مثلاً تکبر، عجب اور حسد وغیرہ کا علاج کر کے روحانی فضائل مثل تواضع، تفویض اور اخلاص وغیرہ سے مزین کرنے کی نیت ہو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہو۔ نیز ہر وقت اپنی اصلاح کی دھن اور اپنے رب کا دھیان ہو۔
- (4) شریعت اور طریقت کو ایک سمجھا جائے۔ شریعت پر چلنے کے عزم کے ساتھ وقتی طور پر ماحول کی مشکلات کے پیش نظر اور شریعت پر چلنے کی منصوبہ بندی کی خاطر کچھ شرعی ضروریات کو آگے پیچھے کرنا پڑے تو اس کے لیے شیخ سے رابطے کی کوشش کی جائے تاکہ اس سلسلے میں رہنمائی حاصل ہو سکے کیونکہ یہ کام بہت نازک ہے۔
- (5) شیخ کے بتائے ہوئے ذکر کی پوری پابندی کی جائے اور اگر اس میں کوئی مسئلہ یا مشکل پیش آرہی ہو تو شیخ کو اس کی اطلاع کی جائے۔
- (6) نمازوں کی قضا اس طرح کرنا کہ ہر وقت کی نماز کے ساتھ نماز سے پہلے یا بعد اسی وقت کی قضا کے صرف فرض ادا کرنا اور عشا میں وتر بھی اور فرصت اور ہمت کے

ساتھ یا ایک دن میں کئی کئی وقت یا کئی کئی دن کی نمازوں کو ادا کر لینا۔ اس طرح قضا شدہ روزوں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔ حج فرض ہو تو اس کی تیاری کرنا۔

(7) کسی کا مالی حق اپنے ذمے ہو تو اس کو ادا کرنا یا معاف کرانا۔

(8) بد نظری سے ایسے بچنا جیسے سانپ بچھو سے۔ جن اخبارات، رسائل اور موبائل میں تصویریں ہوں کوشش کی جائے کہ ان کو نہ پڑھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے پڑھنا پڑ جائے تو اس کا خیال رکھا جائے کہ تصویریں نہ دیکھیں۔ اسی طرح گانا سننے سے سخت پرہیز کیا جائے۔ اگر روکنے پر قادر نہ ہوں تو ”يَا هَادِي، يَا نُورُ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“ پڑھیں تاکہ اس کے شیاطین آپ کے اوپر حاوی نہ ہوں۔

(9) ہر قسم کے حرام مال سے بچنا۔ سوال اور اشرفِ نفس، نمود و نمائش، شرمیہ اور بدعتی رسومات، بے صبری اور ناشکری سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں جن میں ان چیزوں کی مذمت مؤثر انداز میں کی گئی ہو۔

(10) والدین کے تمام جائز حقوق کو پورا کرنے کی کوشش کرنا۔ ان کی ناجائز باتوں سے اگر کسی کو تکلیف ہو رہی ہو تو ان کو نہ ماننا چاہیے لیکن ادب اور خدمت کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر کوئی مشکل صورت ہو تو شیخ کے ساتھ مشورہ کرنا چاہیے، اس کے علاوہ شیخ جو بھی تعلیم فرمائے اس پر عمل کرنا، اپنے احوال سے شیخ کو وقت پر ان کے پسندیدہ طریقے پر آگاہ کرنا اور اس کے مطابق پھر عمل کرنا، یعنی اطلاع اور اتباع کا سلسلہ تا اصلاح جاری رہنا چاہیے۔

◆ فَنَانِي الشَّيْخِ هُونَا

از روئے حدیث: ”حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ“ [مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 5213]

ترجمہ: ”دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے۔“ یہی دنیا کی محبت ہے جس کی وجہ سے سب

روحانی بیماریاں ہیں اور یہی دنیا کی محبت ہے جو اس کے علاج میں رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت ساری سعادتوں کا منبع ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد مبارک ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرة: 165]

ترجمہ: ”اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے“ لیکن کیا بات ہے کہ ایمان کے باوجود اللہ تعالیٰ کی محبت کا وہ مظاہرہ نظر نہیں آتا جو ہونا چاہیے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراہ ہے۔ اس لیے طبیعت قریبی چیزوں کے اثر کی وجہ سے اس کا اثر نہیں لیتی جیسا کہ مد و جزر چاند کی وجہ سے زیادہ ہے اور سورج کی وجہ سے کم۔ حالانکہ چاند سورج کا کروڑواں حصہ ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ زمین کے قریب ہے۔ آپ ﷺ زماناً دور ہیں لیکن چونکہ آپ ﷺ کی تعلیمات اور سیرت موجود ہے۔ اس لیے اس کا اثر طبعاً زیادہ ہے اور شیخ چونکہ سامنے ہوتا ہے۔ اس لیے طبعاً اس کا اثر کافی زیادہ ہوتا ہے۔ اب ہم اگر اس اثر کو تربیت کے لیے استعمال کر لیں تو تربیت بہت آسان ہو جاتی ہے۔ پس اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جس کا واحد راستہ اتباع رسول ﷺ ہے۔ اس کو صحیح معنوں میں اپنانے کے لیے اپنے آپ کو شیخ کی تربیت میں دینا ہے۔ آگے دو چیزوں کی ضرورت رہتی ہے: ایک تو شیخ کے ساتھ مناسبت جو شیخ کو چننے سے پہلے ہے اور دوسرا اس کا قلباً قابلاً مناسب قرب۔ یہ جو قلباً قرب ہے یہ فنایت کہلاتی ہے یعنی یہ دل کے اتنے قریب ہو جائے کہ اپنی بات اس کے سامنے بھول جائے اور اس کی بات یاد رہے۔ ایسی حالت کو فنا فی الشیخ کہتے ہیں۔ قابلاً قرب سے مراد شیخ کی صحبت ہے بشرطیکہ اجازت شیخ ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

”الْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيسِ السُّوَاءِ، وَاجْلِيسِ الصَّالِحِ خَيْرٌ مِّنْ الْوَحْدَةِ“ [المترک علی الصحیحین للحاکم، حدیث نمبر: 5466]

ترجمہ: ”بری صحبت سے خلوت اچھی ہے اور اچھی صحبت خلوت سے اچھی ہے۔“ پھر شیخ سے زیادہ کس کی صحبت مرید کے لیے اچھی ہو سکتی ہے۔ فنا فی الشیخ جتنا قوی ہو گا اگر شیخ صحیح ہے تو اتنی ہی اتباع نبوی ﷺ زیادہ حاصل ہوگی اور اس میں سالک اتنا

ہی فنا ہو گا اور یہ فنا جتنی زیادہ حاصل ہوگی اتنا ہی سالک فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرے گا۔
 فنا فی الشیخ سے فنا فی الرسول اور اس سے پھر فنا فی اللہ حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ
 اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جو اتباع سنت میں مضمر ہے اور اس کے لیے جو موانع
 ہیں وہ فنا فی الشیخ سے دور ہو سکتے ہیں۔

فنا فی الشیخ

فنا فی الشیخ کا رتبہ اگر ہو
 تو شیخ کے قلب کا تجھ پر اثر ہو

پھر اس کا قلب تیرا رہنما ہو
 نہ یوں دنیا میں تو پھر در بدر ہو

تو جانے اس کو وہ بھی تجھ کو جانے
 میسر تجھ کو پھر اس کی نظر ہو

دعا میں اس کی شامل تو رہے پھر
 تجھے رستے کا نہ پھر خوف و ڈر ہو

پھر اس کا قلب تیرا مقتدا ہو
 وسیلہ تیرا پھر اس کا ہی در ہو

خدا ہی دیتا ہے سب کو یقیناً
ملانے کے لیے کوئی مگر ہو

یہ دل سے دل کو ملنے کا ہے رستہ
ترے سامنے اگر نور کا سفر ہو

نبی کے لفظ ہم تک جیسے پہنچے
تو اس میں زور سارا راوی پر ہو

نبی کا نورِ قلب بھی دل سے دل کو
ملا صحبت پہ ہی یہ منحصر ہو

شبیر اس نور کے پانے کے واسطے
فنا فی الشیخ رہو کہ خوب تر ہو

فنا فی الرسول

جو شیخ اتباع میں سنت کی مشغول ہو
اس کو ہی دیکھتے دیکھتے فنا فی الرسول ہو

یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا
سالک کا ہر عمل پھر خدا کو قبول ہو

محبوبیت خدا کی جب سنت میں ہے پنہاں
رحمت کا دل پہ اس سے نہ پھر کیوں نزول ہو
خوشنودیٰ خدا کا یہ رستہ جسے طے
اس کی نظر میں بدعتیں رستے کی دھول ہو

سنت میں جذب قبول کے درجے میں ہے موجود
اک جست میں باخدا بنے، شرک کا ذہول ہو

سنت کی اتباع کو کرو شیخ سے حاصل
تو اولیا کے گروہ میں تیرا شمول ہو

یہ جذب کو دعوت ہے تو اک جست میں شبیر
سالک کا طے اک آن میں رستے کا طول ہو

فنا فی اللہ

راستہ جس کو دوامی اگر سنت کا طے
بالآخر اس کو پھر مقام عبدیت کا طے

یہی فنا فی اللہ کا مقام ہی ہے
جو کہ سنت کے طریقے پہ سہولت سے طے

خدا نے ایک ہی رستہ رکھا تو باقی ہے
اسی کو پا کے ہی پھر راستہ جنت کا طے

یہی فنایت فی اللہ بقا باللہ ہے
 اسی سے مژدہ جانفزا محبت کا طے
 جو بندگی میں ہے آگے وہی محبوب زیادہ
 اسی کو آگے ہی مقام پھر قربت کا طے
 یہی وصول ہے یہ وصل ہے اور یہ ہی فلاح
 شبیر اس کو ہی تو نام پھر نسبت کا طے

◆ دو طرح کا فنا فی الشیخ

فنا فی اللہ کے دو ذریعے ہیں: فنا فی صفات اللہ اور فنا فی ذات اللہ۔ صفات میں فنا
 ہونا کافی نہیں ہوتا کیونکہ جن صفات میں فنا نہیں ہوا، وہی مانع بن جائیں گی۔ جس میں
 انسان کا اپنا وجود بھی ہے۔ اس لیے فنا فی اللہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو ذات
 میں فنا ہے وہ اصل فنا فی اللہ ہے اور اس میں خود کو واقعی فنا کر لیتا ہے۔ اس لیے
 اس میں عود کا خطرہ نہیں۔ فنا فی الشیخ میں بھی دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں جس
 طرح صفات میں فنا ہونے والے اور شیون میں فنا ہونے والے ہوتے ہیں۔ صفات
 والے شیخ کی کسی ایک صفت میں فنا ہوتے ہیں اور اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ذات
 والے شیخ کی ذات میں فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا شیخ کی صفات کی طرف دھیان نہیں
 رہتا۔ جس طرح آپ ﷺ کی ذات میں فنا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی صفات کی
 طرف دھیان نہیں رہتا تو یہ اصلی محبت ہے۔ عقلی یا غرضی محبت نہیں ہے۔ اس کا عقل
 اور دلیل سے واسطہ نہیں ہے اور جن کو یہ حاصل ہوتی ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی بھی خالص
 محبت حاصل ہو جاتی ہے۔ جن کی محبت شیخ کی کسی خاص صفت کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ
 کچی محبت ہے اور جس کو شیخ کی ذات کے ساتھ محبت ہو، وہی اصلی ہے۔

◆ مرشد کے حقوق

(1) مرید یہ اعتقاد رکھے کہ میرا مطلب اسی شیخ سے حاصل ہوگا۔ لہذا صرف اسی کی طرف متوجہ رہے اور اگر کسی اور سے جاگتے ہیں یا خواب میں فائدہ محسوس ہو تو اس کو بھی اپنے شیخ ہی کی برکت سمجھے۔

(2) اپنے شیخ کے ساتھ محبت کرے۔ کیونکہ شیخ کے ساتھ عقیدت بھی گو کہ کافی ہے۔ لیکن محبت اس سے زیادہ مفید ہے۔ اصلاح میں شیخ کی محبت کو بہت دخل ہے۔ کیونکہ محبوب کی بات میں کوئی عاشق بات نہیں نکالتا۔

(3) جو وظیفہ شیخ تعلیم کرے صرف اسے کرے۔ اگر کسی اور نے وظیفہ دیا ہو یا خود سے کوئی وظیفہ شروع کیا ہو تو اس پر شیخ کو مطلع کرے۔ اگر شیخ اجازت دے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بلا تکلف ان وظائف کو چھوڑ دے، صرف انہی وظائف کو کافی سمجھے جو شیخ نے دیے ہیں۔

(4) شیخ کی موجودگی میں ہمہ تن شیخ کی طرف متوجہ رہے۔ فرائض، واجبات اور سنتوں کے علاوہ نوافل شیخ کی تجویز سے ہی پڑھے۔ اگر وہ روکے تو بالکل رک جائے۔ اس میں اپنے دل کو سمجھائے کہ مریض کو بعض دفعہ ملائی سے بھی روکا جاتا ہے جو کہ صحت مندی کے لیے بہت مفید ہے۔

(5) جو کچھ مرشد کہے اس پر نہ اعتراض کرے نہ شیخ کے ساتھ مناظرہ کرے۔ دل میں پھر بھی تشویش ہو تو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ یاد کر لے۔

قلندر جو کہے دیکھ کر کہے ہے

(6) مرشد کی آواز پر آواز بلند نہ کرے، لیکن اتنی کم آواز سے بھی بات نہ کرے کہ سننے میں تکلیف ہو۔

(7) جو کچھ اپنا حال ہو بریا بھلا، بلا کم و کاست بیان کرے۔ اس پر شیخ جو تجویز کرے دل و جان سے قبول کرے۔

8) اس کے پاس بیٹھ کر کسی وظیفہ وغیرہ میں مشغول نہ ہو، الایہ کہ شیخ خود ہی وظیفہ کرنے کو فرمائے۔

9) کوئی بھی دینی خدمت کرنی ہو چاہے کتنا ہی اس کے ساتھ تعلق ہو یا اس کا شرح صدر ہو اگر شیخ اس سے روک دے تو بلا تکلف اس سے رک جائے کیونکہ شیخ کو مرید کے بارے میں زیادہ معلوم ہے کہ اس کو کس وقت کونسا کام کرنا چاہیے۔

◆ شیخ اور مرید کا تعلق

آج کل چونکہ اسی تعلق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طریق میں افراط اور تفریط کا بازار گرم ہے۔ اس لیے اس کو واضح کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ مرید کے لیے مرشد کی مثال ایک طبیب کی سی ہے یا ایک شفیق راہبر کی۔ شیخ مرید کو اپنی بصیرت کے مطابق طریقہ تعلیم کرتا ہے۔ یعنی مرید کو کچھ کرنے کو بتاتا ہے اور کچھ کرنے سے روکتا ہے۔ جس کے کرنے کے بارے میں بتاتا ہے اس میں کچھ کی مثال تو دوا کی سی ہوتی ہے کہ اس پر اگر عمل نہ ہو تو بیماری کا علاج نہیں ہو گا اور مرض بڑھے گا اور کچھ کی مثال غذا کی سی ہے جس سے روحانی قوت حاصل ہوتی ہے اور جن سے روکتا ہے ان کی مثال پرہیز کی سی ہے۔ پس اگر کوئی دوا اور غذا کا اہتمام تو کرے لیکن پرہیز نہ کرے تو اس کا بھی علاج نہیں ہو پاتا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے آئندہ کے لیے دوا ہی غیر مؤثر ہو جائے اور شیخ کو بعد میں اپنی دوا تبدیل کرنی پڑے۔ پس شیخ کا کام تعلیم کرنا ہے اور مرید کا کام اس پر عمل کرنا۔ اگر مرید عمل کرنے کے لیے تیار ہو لیکن شیخ تعلیم نہ کرے تب بھی کام نہیں ہو سکتا۔ یا شیخ تعلیم کرے لیکن مرید اس پر عمل نہ کرے تب بھی کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہے اور اس کی غیر موجودگی میں مکاتب یا کسی اور ذریعے سے رابطے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مرید کے ذمہ لازم ہے کہ شیخ کو اپنی حالت سے مطلع کرے جیسا کہ مریض ڈاکٹر کو مطلع کرتا ہے اور شیخ جو نسخہ تجویز کرے اس پر مرید کو عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس باہمی تعلق کو دو الفاظ کے ذریعے یاد رکھا جاسکتا ہے ”اطلاع و اتباع“ پس مرشد کو بروقت اطلاع کرنا اور شیخ کی تجویز کا اتباع کرنا مرید کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس باہمی تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری

ہے کہ اپنے شیخ کے بارے میں مرید کا یقین راسخ ہو کہ یہی شیخ میرے لیے سب سے زیادہ مفید ہے۔ یہ نہیں کہ یہی شیخ سب سے افضل ہے۔ کیونکہ اس کا پتا تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس شیخ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کرے گا۔ کسی اور شیخ کی طرف ہرگز متوجہ نہیں ہو گا چاہے وہ دوسرا شیخ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اسی کو توحیدِ مطلب کہتے ہیں۔ اس کی مثال بھی بالکل ایسی ہے جیسے علاج کے دوران کسی اور ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا علاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ شیخ کے ان چار حقوق کو حضرت خواجہ مجددوب رحمۃ اللہ علیہ نے یوں نظم کیا ہے۔

چار حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد
اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد

◆ شیخ کا مقام

بعض حضرات بڑے بڑے مشائخ کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں اور اپنے قریب کے مشائخ کے فیض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ شیخ سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ اس کا بڑا ہونا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ مناسبت ہونا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ رابطے کا قائم ہونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شیخ بہت بڑا ہو لیکن اس کے ساتھ کسی کو مناسبت نہ ہو یا مناسبت تو ہو لیکن اس کے ساتھ رابطے کے ذرائع کمزور ہوں تو اس سے اتنا فائدہ نہیں ہو گا۔ شیخ اور مرید کے باہمی تعلق میں دو چیزیں مؤثر ہوتی ہیں۔ ایک تو شیخ کا صاحبِ فن ہونا اور دوسرا اس کا صاحبِ برکت ہونا۔ چنانچہ اگر کوئی شیخ بہت بڑا ہے تو وہ زیادہ صاحبِ برکت ہو گا۔ لیکن ان کے فن سے مستفید ہونے کے لیے رابطہ قائم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی اطلاع اور اتباع کا انتظام ہونا ضروری ہے۔ برکت چونکہ اس کی تعلیم میں ہوگی اس لیے اگر تعلیم ہی نہ ہو تو صرف برکت کس چیز میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ گو حضرت اویس رضی اللہ عنہ کا مقام بہت بڑا ہے لیکن کسی بھی صحابی سے کم ہے۔ کیونکہ صحابی کو صحبت حاصل تھی جو کہ تمام چیزوں سے زیادہ اہم ہے۔ صاحبِ برکت ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ شیخ صاحبِ سلسلہ ہو، کیونکہ سلسلہ ہی برکت کا ماخذ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بڑے شیخ کے ہاں کچھ اور نزاکتیں بھی آجاتی ہیں جن

کا نبھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے بعض لوگ بڑے بڑے مشائخ کے پاس رہ کر بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجوہات ان گنت ہیں۔ اس لیے جن قریب ترین مشائخ کے ساتھ مناسبت ہو، ان میں جس کے ساتھ مناسبت زیادہ ہو اور رابطہ آسان ہو، ان کی طرف رجوع کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ بڑے مشائخ بھی بعض اوقات ان ہی وجوہات کی وجہ سے طالبین کو ان کے قریب کے مشائخ کی طرف رجوع کرادیتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس ضمن میں شیخ کی مثال بجلی کے کھمبے سے بھی دی ہے کہ جس کھمبے کے ساتھ بھی اپنے بلب کو لگایا جائے گا تو وہ بلب اتنا ہی جلے گا جتنی اس کی طاقت ہے چاہے وہ کھمبہ پاور ہاؤس میں ہو یا اس سے دور کسی اور جگہ۔ پس مرید کو جس شیخ سے بھی مناسبت ہے اس سے اس کو اپنی استعداد کے مطابق اتنا ہی فائدہ ہو گا جتنا بڑے مشائخ سے ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات مرید اپنے شیخ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ مربی حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ ہر طالب کی طلب کے بقدر اس کے شیخ کے قلب باصفا سے چشمہ عرفان جاری کرتا ہے۔ اس کا بعض اوقات کھلی آنکھوں مشاہدہ بھی ہوتا ہے کہ بعض طالبین کی مجلس میں موجودگی سے شیخ کے قلب پر ایسے عالی مضامین کا ورود ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں پہلے خود شیخ کو بھی پتا نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے بھی آجاتے ہیں۔ اسی لیے بعض حضرات نے اپنے ملفوظات کے قلمبند کروانے کا بندوبست کیا ہوتا ہے کہ مبادا کسی طالب کی طلب صادق کے طفیل دنیائے عرفان کا کوئی موتی اچانک ہاتھ آجائے تو اس کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔

◆ تصوف کے سلسلے

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ یہ سلسلے صحبت کے سلسلے ہیں۔ مقصد کے اعتبار سے سب ایک ہیں یعنی سب کے ہاں نفس کی اصلاح مقصود ہے۔ لیکن ہر ایک نے اپنے اپنے ذرائع اختیار کیے ہیں جن کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ مثلاً سلسلہ چشتیہ میں پہلے رذائل کو دور کرنے پر زور دیا جاتا ہے پھر فضائل پیدا کیے جاتے ہیں۔ نقشبندیہ میں فضائل کے پیدا کرنے سے رذائل کو بھی دور کیا جاتا ہے۔ سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ کے بھی اپنے اصول ہیں۔ جس طرح اپنے شیخ کو اپنے لیے سب سے زیادہ مفید سمجھنے کے ساتھ باقی مشائخ کی تنقیص سے بچنا ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی کی مناسبت

جس سلسلے کے ساتھ پیدا فرمائی ہو اس سلسلے سے استفادہ کرتے ہوئے باقی سلسلوں کی تنقیص سے اپنے قلب و ذہن کو بچانا ضروری ہے۔

◆ ایک شیخ کو چھوڑ کر دوسرے شیخ سے بیعت ہونا

شیخ کا انتخاب تاحیات ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی کو بھی اصلاح کے بعد اپنے اوپر اچھا گمان نہیں رہتا۔ تاہم بعض دفعہ ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جس سے مرید کی اصلاح (جو کہ بیعت کا اصل مقصد ہے) متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے شیخ کا ہاتھ پکڑنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مثلاً:

(1) شیخ اول کو متبع شریعت نہ پانا (یعنی بدعت یا اصرارِ کبیرہ پر دیکھنا):

اس میں وقت کے مقتدر مفتیانِ کرام کی رائے کو ترجیح ہوگی۔ اپنی رائے کو نہیں۔ کیونکہ ”رَأَى الْعَلِيلَ عَلِيلٌ“ کے مصداق، ممکن ہے جس چیز کو مرید لازم سمجھتا ہے وہ فی الحقیقت شریعت میں لازم نہ ہو اور جس چیز کو وہ اہم نہیں سمجھتا وہ شریعت میں اہم ہو۔ وہ مفتیانِ کرام بھی اہل فتویٰ ہونے کے ساتھ ساتھ کاملین بھی ہوں ورنہ ذوقِ حقیقتِ حال تک پہنچنے میں حائل ہو سکتا ہے۔

(2) شیخ اول سے باوجود متشرع، متبع سنت ہونے کے مناسبت کا نہ ہونا:

بعض دفعہ کسی مجلس میں دوسروں کے بیعت کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر دل کسی شیخ کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا کسی وقت کسی شیخ کے ساتھ وقتی طور پر مناسبت کا احساس ہو جاتا ہے اور اس سے بیعت ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس کے ساتھ مناسبت نہیں ہے۔ جس سے ترقی رک جاتی ہے اور استفادہ رکتے رکتے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ساری عمر گزارے تو محرومی کا اندیشہ ہے۔ اس وقت چند احتیاطی تدابیر کے بعد شیخ بدلنے کی تجویز ہو سکتی ہے۔ پہلے اس بات کو دیکھا جائے کہ عدم مناسبت کہیں اپنے نفس کے شر کی وجہ سے تو نہیں۔ مثلاً بعض لوگ فرض عین علم کے حامل شیخ کی بجائے کسی علامہ سے بیعت ہونے کو لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ نفس کا خبط ہے۔ اس کے لیے یہ دیکھنا ہے کہ شیخ کے پاس اگر ضرورت کے درجے کا علم ہے

تو اس کو کافی سمجھے۔ شیخ کا تخصص اصلاح کرنے میں کمال کا ہے علم میں کمال کا نہیں۔ یہ شعبہ ہی دوسرا ہے۔ اس کے لیے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیعت ہونا یاد رکھے۔

بعض کو مشائخ کے بارے میں تصرفات اور کرامات کا پتلا لگا ہوتا ہے وہ اپنے شیخ میں اس کو نہ پا کر کچھ بدگمان سا ہو جاتا ہے جس سے ترقی رک جاتی ہے اور وہ اس کو عدم مناسبت سمجھ لیتا ہے۔ اس صورت میں اپنی نیت کی درستگی کی ضرورت ہے نہ کہ شیخ کی تبدیلی کی۔

(3) شیخ اول کا انتقال کر جانا:

اگر ابھی تکمیل نہ ہوئی ہو تو اس کے لیے کسی دوسرے شیخ سے اصلاح کے لیے رجوع کرنا مستحسن ہے اور اس کی دو صورتوں ہیں: جدید شیخ سے تجدید بیعت کے ساتھ یا گزشتہ بیعت کو برقرار رکھتے ہوئے محض تکمیل کے لیے بیعت کرنا۔ اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ جدید شیخ کے ذوق کے مطابق عمل کیا جائے۔

اگر تکمیل ہو چکی ہو اور مرید مزید پختگی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے بھی جدید شیخ سے بیعت کی جاسکتی ہے یا بغیر بیعت کے اس کی نگرانی میں اپنے آپ کو دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تَوَدَّ اللَّهُ مَرْقَدَهُ اول سلسلہ نقشبندیہ سے مجاز بیعت تھے، اپنے شیخ کے انتقال کے بعد چونکہ ابھی طبیعت کو سیری نہ ہوئی تھی، اس لیے سلسلہ چشتیہ میں حضرت میانجیو نور محمد صاحب جھنجھانوی تَوَدَّ اللَّهُ مَرْقَدَهُ سے بیعت فرمائی اور حضرت میانجیو صاحب کی طرف سے بھی مجاز بیعت ہوئے۔ جن کے فیوض و برکات سے آج عرب و عجم فیض یاب ہیں۔ حضرت کے اس بیعت کی منظوری دربار رسالت سے ہونے کا واقعہ تاریخ مشائخ چشت میں موجود ہے۔

◆ غور طلب

دوسرا شیخ تجویز کرنے پر پہلے شیخ کی شان میں کبھی سوء ادبی قولاً و فعلاً، غائباً، حاضرًا، ہرگز نہ کرے اگرچہ شیخ اول منشرع نہ رہا ہو، کیونکہ یہ سخت وبال ہے۔

◆ چاروں سلسلوں کے مشائخ کے اسمائے گرامی

سلسلہ چشتیہ کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چشتیہ سلسلے کی آگے پھر دو شاخیں ہیں۔ چشتیہ صابریہ کے سرخیل حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور چشتیہ نظامیہ کے سرخیل حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ سلسلہ قادریہ کے سرخیل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، سلسلہ سہروردیہ کے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ نقشبندیہ کے حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

◆ شجرہ اور اس کی اہمیت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصب جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائے ہیں۔ چار ہیں۔ یعنی قرآن کی تلاوت سکھانا، صحابہ کرام کا تزکیہ کرنا، کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا۔ قرآن کی تلاوت کے شعبے کی ذمہ داری قرآن حضرات نے، تزکیہ کی صوفیائے کرام نے اور علم و حکمت کی علمائے کرام نے اٹھائی۔ علمائے کرام میں محدثین کرام نے احادیث شریفہ کو امت تک محفوظ طریقے سے پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی سندوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی سندوں کو اس ترتیب سے روایت کرتے ہیں جس ترتیب سے ان تک روایت پہنچی ہوتی ہے۔ بعینہ اسی طرح صوفیائے کرام اپنی نسبت کو اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں جس ترتیب سے ان تک نسبت پہنچی ہوتی ہے۔ نسبت کی اسی ترتیب کا بیان شجرہ کہلاتا ہے۔ بعض حضرات نے اپنا شجرہ منظوم انداز میں چھاپا ہوتا ہے اور برکت حاصل کرنے کے لیے اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ دعائیہ شکل میں بھی ہوتی ہے اور مریدین اپنی دعا کی قبولیت کے لیے اس نسبت کو بطور وسیلہ پکڑتے ہیں۔

◆ بندہ کی نسبت

بندے کو حضرت صوفی محمد اقبال مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ چاروں سلسلوں میں اور ان ہی سے بواسطہ حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ طریقہ قادریہ راشدہ میں اور بواسطہ حضرت علی مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ نقشبندیہ میں، حضرت سید تنظیم الحق حلیمی رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت مولانا فقیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کے چاروں سلسلوں میں اور ان ہی سے بواسطہ حضرت سیف الرحمن گل بادشاہ المعروف میخ بند باباجی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ قادریہ، نقشبندیہ، معصومیہ مجددیہ میں اور حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہ، سید بشیر احمد کاکا خیل رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی عبدالمنان صاحب مدظلہ سے بواسطہ مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ چاروں سلسلوں میں اجازت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرحمن صدیقی رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعہ مولانا عبید اللہ انور رحمۃ اللہ علیہ طریقہ راشدہ میں اور بذریعہ مولانا شمس الحق افغانی، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ چار سلسلوں میں اور حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے بذریعہ کثیر مشائخ کے عرب و عجم کے مزید سلسلوں میں اجازت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت میاں اجمل قادری مدظلہ کے ذریعے حضرت احمد علی لاہوری کے قادریہ راشدہ سلسلے میں اور حضرت مولانا سید مصطفیٰ قادری رفاعی جیلانی دامت برکاتہم کی طرف سے آپ کے خاندانی سلسلوں اور چہار سلاسل میں اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے اس حسن ظن کو بندے کے حق میں قبول فرما کر اپنی خالص بندگی میں قبول فرمائے۔ آمین۔

◆ طریقت کے سلسلے

سلسلوں کی مثال طب کے مختلف طریقوں کی طرح ہے جیسے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی طب اور آکو پنچر وغیرہ۔ مطلوب صرف صحت ہوتی ہے طب کا طریقہ نہیں۔ اس لیے جس کو جس طریقے سے بھی شفا حاصل ہو، ٹھیک ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ باقی طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ تو اس کا یہ کہنا غلط ہوگا۔ کیونکہ مقصود جس ذریعے سے بھی حاصل ہو ٹھیک ہے۔ البتہ مزاجوں کے فرق سے طریقے کا انتخاب ایک اچھا اصول ہے۔

چار سلسلے چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ ہندوپاک میں زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن سلسلے صرف چار نہیں اور جن میں شازلیہ، رفاعیہ، کبرویہ، عبودیہ وغیرہ

زیادہ مشہور ہیں۔ ان سارے سلسلوں کے اپنے اپنے اصول ہیں جن سے صرف مشائخ کو سروکار ہوتا ہے۔ عوام کو صرف شیخ سے سروکار ہوتا ہے۔

سوائے نقشبندیہ سلسلے کے باقی سلسلوں کے ہاں سلوک پہلے طے کرایا جاتا ہے۔ جذب کے ذریعے تکمیل ہوتی ہے۔ نقشبندیہ سلسلے میں خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر، شوقِ سلوک پیدا کرنے کے لیے جذبِ مبتدی کو مقدم کیا اور اس کے لیے ایک طریقہ دریافت کر لیا جس سے یہ ہوا کہ روح کو قالب کے ساتھ ملنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے جو عشق تھا وہ اس کو ذکر، شغل اور مراقبہ کے ذریعے یاد دلایا۔ جس سے جذبِ منتہی کی طرح کا جذبِ مبتدی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا مقصد بنیادی طور پر سلوک کے لیے تیار کرنا تھا۔ اس لیے سلوک طے کیے بغیر سالک کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جذب حاصل ہو جائے تو اس کے کچھ توابع ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسے شخص کی توجہ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور اس کی کیفیات ایسی ہوتی ہیں کہ عوام کا ان کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ شیطان ان کو استعمال کر سکتا ہے اور سلوک طے کرنے میں تاخیر کر کے نفس کو پھر سے دل کی حالت دگرگوں (خراب) کرنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نفس اگر ایسا کر دے تو نہ صرف ایسا سالک اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیتا ہے بلکہ دوسرے سالکین جو اس کی طرف راغب ہوتے ہیں ان کا راستہ بھی مار دیتا ہے۔ اس چیز کو دور کرنے کے لیے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بھائی کو مکتوب نمبر 287 میں اس کی تفصیلات لکھی تھیں۔ جن کو احقر نے کتاب ”حقیقتِ جذب و سلوک“ میں جمع کر کے اس کی تشریح کے ساتھ چھاپ دیا ہے۔

اس کتاب میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ یہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس خواہش کے عین مطابق ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے اس سے آگاہ ہوں، تاکہ وہ ان تمام مسائل کے شکار ہونے سے بچ جائیں جن کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب میں ذکر کیا ہے۔

چونکہ یہ سلسلہ بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے عوام کے لیے بہت مفید ہے۔ لیکن

عوام ان مسائل کے شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس خطرے کے پیش نظر احقر نے سلوک کو طے کرانے کے لیے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی پہلے تذکیر سے کام لیا جائے جیسا کہ تبلیغی جماعت کا معمول ہے اور تذکیر کے ذریعے سلوک طے کرانے کا شوق پیدا کیا جائے اور دو مقامات کو جذبِ مبتدی سے پہلے طے کرایا جائے۔ اس کے بعد جذبِ مبتدی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جب وہ حاصل ہو جائے تو بقیہ سلوک طے کرایا جائے، تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ جذبِ منتہی پر منتج ہو جائے۔

سلوک کے دو مقامات جو پہلے طے کیے جائیں گے درج ذیل ہیں۔

(1) توبہ (2) انابت۔ یہ دونوں باقی مقامات سلوک کے لیے بنیاد ہیں۔ توبہ سے منفی اعمال سے کٹنا نصیب ہو گا اور انابت سے مثبت اعمال کا اجرا ہو گا۔ یعنی مقام توبہ گزشتہ گناہ آلود زندگی سے اپنے آپ کو کاٹنا ہے اور مقام انابت بقیہ زندگی میں شریعتِ مطہرہ کی پاکیزہ زندگی حاصل کرنے کے لیے استقامت حاصل کرنا ہے۔ باقی مقامات ان دو مقامات کے تفصیلی حصول کے لیے ذرائع ہیں۔ ان بنیادوں کی بنیاد بھی جذب سے پہلے ہو جائے تو کم از کم مجذوب متمکن ہونے سے ان شاء اللہ حفاظت ہو جائے گی۔

اس کے ساتھ چاروں سلسلوں کے نمائندہ ذکر ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، حَقُّ اور اَللَّهُ﴾ سے کام شروع ہو گا۔ شروع میں ایک ایک تسبیح، پھر حسب استطاعت ان میں اضافہ ہو گا۔ اس کے بعد ذکرِ قلبی، روحی، بری، خفی اور اخفی۔ پھر مراقبہٴ احدیت، پھر مراقبہٴ توحیدِ افعالی، صفاتِ ثبوتیہ، شیوناتِ ذاتیہ، تنزیہ و صفاتِ سلبیہ، شانِ جامع، معیت، حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ قرآن اور حقیقتِ صلوة کرایا جائے گا۔ بعد ازاں مراقبہٴ عبدیت، مراقبہٴ احسان، حبِ الہی، حبِ فی اللہ، نور اور دعائیہ کرائے جائیں گے۔ ان اذکار و مراقبات سے صرف اتنا جذب حاصل کرنا ہے کہ سالک سلوک طے کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جیسے ہی شیخ کو پتا چلے کہ سالک اتنا جذب حاصل کر چکا ہے کہ سلوک کو طے کر سکتا ہے تو طریقِ جذب کے حصول کو موقوف کر کے سلوک کے مقامات طے کرانا شروع کیا جائے۔

دو مقامات تو پہلے طے ہو چکے ہوں گے۔ چونکہ ریاضت کے بغیر نفس قابو نہیں آتا اس لیے اپنے آپ کو اس نیت سے ریاضت کا خوگر بنانا کہ شریعت پر چلنے میں نفس رکاوٹ نہ بنے، ضروری ہے۔ نفس زدہ دل میں دنیا کی جو محبت ہوتی ہے وہ دنیاوی چیزوں پر حریص کر دیتی ہے۔ جس کا علاج قناعت حاصل کرنا ہے۔ لیکن اگر اس پر عمل نہ ہو تو محض تخیل ہی تخیل رہ جائے گا اور جب اس کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ تو اس کو زد کہتے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ اعمال و افعال سے دور رکھنے کے لیے مقام تقویٰ حاصل کیا جاتا ہے۔ جو ایک حفاظتی قلعہ کی مانند ہے۔ اس مقام کے بعد جو بھی قدم اٹھایا جائے گا۔ وہ شریعت کے مطابق اچھی نیت سے اٹھایا جائے گا ان شاء اللہ۔ اس کا لازمی نتیجہ صبر ہے۔ کیونکہ صبر کے بغیر تقویٰ قائم نہیں رہ سکتا۔ موہوم خطرات سے بچنے کے لیے مقام توکل لازم ہے۔ اس کے بغیر شریعت پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ جب یہ گھاٹی گزر جائے تو پھر سالک دل سے اللہ تعالیٰ کے تکوینی و تشریحی احکامات کو تسلیم کر لیتا ہے جو کہ مقام تسلیم ہے۔ اس سے مقام رضا کے لیے رستہ کھل جاتا ہے یعنی پھر انسان ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور جو اب میں اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ جس کا پتا تو اُدھر چلے گا لیکن اس کے آثار یہ ہیں سے شروع ہو جاتے ہیں۔

* ● ● ● *

امورِ تصوف

اب چند سطروں میں تصوف کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو کہ مشہور کتاب ”شریعت اور طریقت“ سے لیا گیا ہے۔ بلاشبہ اسے تصوف کا نچوڑ کہا جاسکتا ہے۔

1... مقصود

یہ دو قسم کے ہیں:

(1) اعمال (2) ثمرات

اعمال دو قسم کے ہیں۔

(1) سلبی اعمال (2) جلبی اعمال

1.1... اعمال

اعمال دو قسم کے ہیں۔

1.1.1... سلبی اعمال

سلب کسی چیز کے دور کرنے کو کہتے ہیں۔ پس سلبی اعمال سے مراد وہ اخلاقِ رذیلہ ہیں جن سے چھٹکارہ حاصل کرنا مقصود ہے جیسے دنیا کی محبت، ریا، تکبر، حسد، کینہ، بغض، بے صبری، ناشکری وغیرہ۔

1.1.2... جلبی اعمال

جلب کسی چیز کے حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ پس جلبی اعمال سے مراد وہ اخلاقِ حمیدہ ہیں جن کا حاصل کرنا مطلوب ہے۔ جیسے اللہ کی محبت، صبر، شکر، اخلاص، تقویٰ، تواضع، رضا، صدق وغیرہ۔

1.2... ثمرات

ثمرات (نتائج) بھی دو قسم کے ہیں:

1.2.1... بندگی

یعنی بندے کی طرف سے ہمہ وقت بندگی

1.2.2... اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا و قربِ خاص

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا اور قربِ خاص کا حاصل ہونا جس کو وصول بھی

کہتے ہیں۔

2... غیر مقصود

یہ تین قسم کے ہیں:

(1) ذرائع (2) توابع (3) موانع

2.1... ذرائع

ذرائع دو قسم کے ہوتے ہیں:

2.1.1... مجاہدہ

جس میں کم بولنا، کم کھانا، کم دیکھنا، کم مطالعہ، کم سونا اور نا جنس (یعنی جن سے ملنے میں نقصان کا اندیشہ ہو) سے کم (یعنی صرف بضرورت) ملنا جلنا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نفسیاتی مجاہدات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کی ضرورت صرف فرائض و اجبات کی تکمیل اور حرام اور مکروہ تحریمی سے بچنے تک ہے۔ اس کے بعد سنتوں پر بتدریج عمل بڑھانا ہوتا ہے۔ کیونکہ سنتوں پر عمل بڑا مجاہدہ ہے۔ اس سے باقی تکمیل ہو جاتی ہے۔

2.1.2... فاعلہ:

فاعلات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول وہ جو مفید ہیں اور ان میں کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔ ان میں ذکر، شغل اور مراقبہ آتے ہیں۔ دوسرے جو مفید تو ہیں لیکن ان میں خطرہ بھی ہے۔ ان میں تصور شیخ، عشق مجازی اور سماع آتے ہیں۔

2.2... توابع:

یعنی سلوک میں ان سے (کوئی چاہے یا نہ چاہے) پالا پڑ سکتا ہے اور یہ سب غیر اختیاری ہیں۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں اول وہ جن میں نقصان کا احتمال ہے۔ دوسرے وہ جن میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

2.2.1... وہ توابع جن میں نقصان کا احتمال نہیں:

ان میں چند درج ذیل ہیں:

2.2.1.1... اجابتِ دعا:

دعاؤں کا قبول ہونا۔

2.2.1.2... الہام:

کسی ولی کے دل میں حق تعالیٰ کی طرف سے کسی بات کا القا ہو جانا۔

2.2.1.3... رویائے صالحہ:

اچھے خوابوں کا نظر آنا۔

2.2.1.4... فراستِ صادقہ:

یعنی سچی اٹکل جو واقع کے مطابق ہو۔ اس کو بصیرت بھی کہتے ہیں۔

2.2.1.5... فنا:

رذائل کا دل سے اتر جانا فنا ہے۔

2.2.1.6... بقا:

فنا کا بھی دل سے اتر جانا، یعنی خود فنا کے حاصل ہونے کو نہ جانا، بقا ہے۔ بعض لوگ اس کو فنا الفنا بھی کہتے ہیں۔

2.2.1.7... وحدۃ الوجود بغیر سُکر:

دل کا صرف اللہ سے متعلق ہونا اور مخلوقات سے اثر نہ لینا، باوجود اس کے کہ جانتا ہو کہ مخلوقات موجود ہیں۔ جیسے سورج ہو تو تارے نظر نہیں آتے لیکن موجود ہوتے ہیں۔

2.2.1.8... وجد:

کسی عجیب و غریب محمود حالت کا طاری ہو جانا۔

2.2.2... وہ توابع جن میں نقصان کا احتمال ہے:

وہ یہ ہیں:

2.2.2.1... استغراق:

کسی کیفیت میں ہمہ تن متوجہ رہ کر باقی چیزوں کو بھول جانا۔

2.2.2.2... تصرف:

اپنی ہمت و توجہ سے کسی شخص یا چیز کو متاثر کرنا۔

2.2.2.3... سُکر کے ساتھ وحدۃ الوجود:

یعنی وحدۃ الوجود میں بغیر قصد کے شرعی تشریحات کا ذہن میں نہ ہونا اور ایسی باتوں کا منہ سے نکل جانا جن پر شریعت گرفت کرتی ہو۔

2.2.2.4... قبض و بسط:

وارداتِ قلبی کا موجود نہ ہونا قبض اور اس کا موجود ہونا بسط کہلاتا ہے۔ دل پر منجانب اللہ جو کیفیات القا کی جاتی ہیں ان کو وارداتِ قلبی کہتے ہیں۔

2.2.2.5... مشاہدہ:

کسی امر یا ہستی کا کامل استحضار۔ اس کو کیفیتِ حضوری بھی کہتے ہیں۔ اس میں سالک کو اپنے آپ کی خبر نہیں رہتی، اس لیے اس سے ایسی حرکات کا ظہور ہو سکتا ہے جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔

2.2.2.6... کرامت:

کسی نیک مسلمان کے ہاتھ سے کسی ایسے کام کا ہوتے ہوئے نظر آنا جو عام فطری قوانین کے مطابق ممکن نہ ہو۔

2.2.2.7... کشفِ الہی:

ذات و صفاتِ الہیہ سے متعلق علوم و اسرار و معارف کا قلب پر وارد ہونا۔

2.2.2.8... کشفِ کوئی:

جن چیزوں کو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے، ان کا نظر آنا، چاہے وہ گزشتہ وقت کے حالات ہوں یا آئندہ کے واقعات، یا غائب چیزیں دور یا قریب کی ہوں۔

2.3... موانع:

وہ امور جن کے ارتکاب سے سالک اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی تو عباد الرحمن کی بجائے عباد الشیطان میں سے ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

2.3.1... حسن پرستی:

کسی شخص کے حسن میں ایسا محو ہو جانا کہ شریعت کے احکامات کی پروا نہ رہے۔ یہ انتہائی مذموم حرکت ہے۔ صوفیاء کے کلام سے بعض لوگوں کو اس کا شبہ ہو جاتا ہے جس کی ناسمجھی سے غلط تعبیر کر کے اپنی عاقبت خراب کر بیٹھتے ہیں۔ چاہے وہ شخص عورت ہو یا مرد۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین

2.3.2... تعجیل:

کسی کیفیت کو حاصل کرنے کے ایسے درپے ہو جانا کہ راہ سلوک کی احتیاطیں پیش نظر نہ رہیں۔ اس سے سالک کا دل پریشان ہو کر ہمت ہار جاتا ہے۔ بسا اوقات شیخ کے ساتھ بدگمانی تک کی نوبت آ جاتی ہے۔

2.3.3... تصنع:

سالک کو جو حالت حاصل نہیں ہے۔ اس کا حاصل کیا ہو اظہار کرنا۔

2.3.4... مخالفتِ سنت:

سلوک کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جو سنت کا مخالف ہو۔ اس لیے سنت کی مخالفت کا کوئی راستہ نہیں۔ سالک کا کسی امر میں قصداً سنت کی مخالفت کرنا اس کو سلوک سے بہت دور گرا دیتا ہے۔

2.3.5... مخالفتِ شیخ:

سلوک میں شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کی مخالفت کرنا۔

2.4... خواطر

خیالات کو کہتے ہیں۔ خیال کے مراتب پانچ ہیں۔

2.4.1... ہاجس

جب کوئی بات قلب میں ابتداً واقع ہوئی اور نفس نے اس کو ابھی لیا نہیں۔ اس کو ہاجس کہتے ہیں۔

2.4.2... خاطر:

اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور اول ہی سے اس کو دفع کر دیا، تو اس کے بعد والے حالات سے بچ گیا اور اگر نفس اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے فی الحال نہیں باندھا، اس کو خاطر کہتے ہیں۔

2.4.3... حدیثِ نفس:

جب نفس کرنے نہ کرنے کے برابر درجہ میں منصوبہ باندھنے لگے اور ان سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو، تو اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

2.4.4... ہم:

جب نفس میں فعل یا عدمِ فعل کا منصوبہ ترجیحِ فعل کے ساتھ ہونے لگا۔ لیکن وہ ترجیح قوی نہیں۔ بلکہ مرجوح ہے۔ جیسا کہ وہم ہوتا ہے۔ اس کو ہم کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ خیر میں ہے تو اس پر ثواب ہوتا ہے اور اگر وہ شر میں ہے تو اس پر عتاب ہوتا ہے۔ البتہ اس مرتبے میں آدمی کے واپس ہونے کا مکان زیادہ ہوتا ہے۔

2.4.5... عزم:

پھر جب فعل کار حجان قوی ہو گیا، یہاں تک کہ جازم مصمم بن گیا، تو اس کو عزم کہتے ہیں۔ اس پر بھی اس کے مطابق ثواب ہوتا ہے اگر خیر میں ہے اور اگر شر میں ہے تو اس پر عتاب ہوتا ہے۔

◆ حاصل مطالعہ

ان امور کے تعارف سے اب پتا چل چکا ہو گا کہ یہ سب شریعت پر عمل کرنے کے لیے ہیں اور عوام میں جو یہ مشہور ہو گیا ہے کہ طریقت اور چیز ہے اور شریعت اور چیز ہے۔ یہ بات اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ ان کی محنت کے میدان الگ الگ ہیں۔ کیونکہ شریعت نام ہے ان کاموں کے علم کا جو کرنے کے ہیں اور جن چیزوں سے بچنا ہے اور طریقت یہ ہے کہ شریعت پر عمل کرنے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کو دور کرنے کے طور طریقے اختیار کرنا۔ اخلاص کے بغیر شریعت ایسے ہی ہے جیسا کہ پھل کا چھلکا اور شریعت کے بغیر طریقت ایسے ہی ہے جیسا کہ فلسفہ اور جوگ۔

جب سلوک کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں نہ تو کشف و کرامات ضروری ہیں۔ نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔ نہ دنیا میں کار بر آری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائیں یا مقدمات دعا سے فتح ہو جائیں یا روزگار میں ترقی ہو یا جھاڑ پھونک اور تعویذات سے بیماری جاتی رہے یا ہونے والی بات بتادی جائے۔ نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے کہ اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے، خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں۔ مرید کو ارادہ نہ کرنا پڑے یا ذہن و حافظہ بڑھ جائے۔ نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کی ضمانت کہ عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے۔ عبادت میں کوئی خیال ہی نہ آئے یا یہ کہ خوب رونا آئے یا ایسی محویت ہو جائے کہ اپنی پرانی خبر نہ رہے اور نہ ذکر و شغل میں انوار وغیرہ کا نظر آنا نہ کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے۔ نہ اچھے خوابوں کا نظر آنا یا الہامات کا ہونا لازمی ہے۔ بس اصل مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور یہ ان کے نصیب میں ہوتی ہے جن کو خشیت حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام کے

حاصل کو اگر تقویٰ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا اور تقویٰ ایمان کے ساتھ جب جمع ہو تو یہ ولایت کے حصول کا باعث ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہو رہا ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ [یونس: 62-63]

ترجمہ: ”یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگیں ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے۔“

اور پھر جتنی تقویٰ میں ترقی ہوتی ہے اتنی ولایت میں ترقی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: 13]

ترجمہ: ”در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔“

••*

سالک کے لیے مفید کتب

◆ کتب تفاسیر

”معارف القرآن“ مؤلفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ”تفسیر عثمانی“ اور ”تفسیر مظہری“

◆ کتب احادیث

”ریاض الصالحین“ اور ”معارف الحدیث“ مؤلفہ مولانا منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

◆ کتب فقہ

”بہشتی زیور“ مؤلفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور ”تعلیم الاسلام“ مؤلفہ مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

◆ کتب تصوف

زیر نظر کتاب ”فہم التصوف“ اور بندہ کی کتاب ”تصوف کا خلاصہ“
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پر مشتمل کتاب ”شریعت و طریقت“
حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”سلوک سلیمانی“ 3 جلدیں
اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ”مواعظ“ اور ”ملفوظات۔“

◆ کتب فضائل

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی ”فضائل اعمال“، ”فضائل درود شریف“ اور ”فضائل حج“

◆ ضروری غور طلب

اگر شرعی رکاوٹ نہ ہو تو اپنا حال بالمشافہ یا بذریعہ ٹیلیفون شیخ کو بتائے، نہیں تو خط
کے ذریعے (خواتین کے لیے بالمشافہ رابطہ زیادہ مناسب نہیں ہے)
شیخ کی جو تحقیق ہو اس کو جاننے کے بعد اس پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کی
جائے اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آرہی ہو تو پھر پوچھ لیا جائے۔

اپنے شیخ کو کل عالم میں اپنے لیے سب سے بہتر سمجھیں۔ یہ نہیں کہ اس کو سب
سے افضل سمجھیں کیونکہ اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور فقیر تو بہت گنہگار ہے
اللہ تعالیٰ ستاری فرمائے۔ آمین

روحانی اصلاح کے لیے صرف اپنے شیخ سے تعلق رکھیں۔ کبھی کسی اور پر اپنا حال ظاہر
نہ کریں اس سے بعض اوقات سخت نقصان ہو سکتا ہے۔ اسی کو توحید مطلب کہتے ہیں۔
بقول حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ:

چار حق مرشد کے ہیں رکھ ان کو یاد

اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد

◆ فقیر سے متعلق حضرات کے لیے ابتدائی ہدایات

بیعت کے وقت کی تعلیم میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کو فقیر کی طرف سے بھی سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل باتوں کا بھی خیال رکھا جائے۔

فقیر کے دیے ہوئے ذکر کے ساتھ:

کلمہ سوم: 100 بار

درود شریف: 100 بار

استغفار: 100 بار

صبح شام ذکر کیا جائے۔

ہر نماز کے بعد:- 33 بار سبحان اللہ - 33 بار الحمد للہ - 34 بار اللہ اکبر۔

تین بار درود شریف پڑھیں۔ تین بار کلمہ طیبہ اور تین بار استغفار کا ذکر کیا جائے اور ایک بار آیت الکرسی کی تلاوت کی جائے۔

نوافل کا جو معمول ہو اس کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر نہ ہو سکے تو فقیر کے ساتھ اس کے بارے میں مشورہ کیا جائے۔ خود سے اپنے لیے نوافل یا نفل عبادت کا معمول مقرر نہ کیا جائے۔

جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات درود شریف کی کثرت اور جمعہ کے روز سورہ کہف کی تلاوت کا خاص خیال رکھا جائے اور جمعہ کے آخر وقت میں اپنے لیے، فقیر کے لیے اور پوری امت کے لیے دعائیں کرنے کی کوشش کی جائے۔

روزانہ کم از کم آدھا پارہ تلاوت کیا جائے۔ اگر قرأت نہ کر سکتا ہو تو جلد از جلد اس کو سیکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر مخارج درست نہ ہوں تو ان کی درستگی کا بندوبست کیا جائے۔

اپنے ہاتھ، زبان اور قلم کے شر سے ہر کسی کو بچائیں۔ جس چیز میں نہ دین کا فائدہ ہو نہ دنیا کا، اس میں مشغول ہونے کو سب سے بڑی حماقت جانیں اور اس سے بچیں۔ کوشش کی جائے کہ بشرط تحمل ہر کسی کو فائدہ پہنچایا جائے اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے اور خود کو شش بھی۔ خط کشیدہ بات کے لیے فقیر سے مشورہ مفید ہوگا۔

بیویوں اور بچوں کے بارے میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ نہ تو ان پر ظلم ہو، چاہے اس کے لیے کوئی بھی آمادہ کرے اور نہ ہی ان کے لیے کسی پر ظلم ہو۔ ان کو فتنہ کہا گیا ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔

جس بات کی تحقیق نہ ہو اس کو آگے نہ پھیلائیں۔ بالخصوص جس میں کسی مسلمان کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔ نیز مجلس میں یا کسی بھی موقع پر کسی کا مذاق اڑانا، اس کو برے نام سے پکارنا، اس کی نسل یا پیشے پر انگلی اٹھانا سخت ممنوع ہے۔

جو چیزیں اختیاری ہیں مثلاً نماز، روزہ یا شریعت میں مطلوب دوسرے اعمال، ان میں سستی نہ کریں اور جو چیزیں غیر اختیاری ہیں مثلاً حذرہ، شوق و ذوق یا دوسرے احوال وغیرہ جو محض وہی ہیں۔ ان کی فکر نہ کریں۔ پھر ان دونوں میں جو حاصل ہوں اس پر شکر کریں۔ اختیاری اعمال میں کوتاہی پر استغفار اور ندامت کے ساتھ آئندہ کوشش کا عزم ہو اور غیر اختیاری احوال میں جو محمود احوال حاصل نہ ہوں ان میں اپنے لیے خیر سمجھیں۔

گھر میں بہشتی زیور کار کھنا بہت مفید ہوتا ہے۔ اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد لکھے گئے ہیں۔ ان کے مطابق عقائد رکھے جائیں اور ضرورت کے وقت مسائل بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات کا مطالعہ روحانی ترقی کے لیے بہت مفید ہے۔

مرد متعلقین کو اپنی بیویوں کے حقوق واجبہ کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جو اولاد والے ہیں ان کو اولاد کی تربیت کی طرف خوب توجہ کرنی چاہیے۔ جو شادی شدہ نہیں ہیں ان کو اپنی حفاظت کے لیے فقیر سے فوراً مشورہ کرنا چاہیے۔ اس طرح جن خواتین کا فقیر کے ساتھ اصلاح کا تعلق ہے۔ اگر وہ شادی شدہ ہیں تو ان کو اپنے شوہروں کی دل سے خدمت کرنی چاہیے اور اولاد کی تربیت میں شوہر کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں ہیں تو اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہیے اور مناسب رشتہ ملے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔

1.1... اعمال

دو قسم کے ہیں۔

(1) سبلی اعمال یعنی اخلاقِ رزیلہ۔

(2) جلبی اعمال یعنی اخلاقِ حمیدہ۔

ان دونوں کے جاننے کے لیے پہلے اخلاق کا تعارف ضروری ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اس لیے اس سے ابتدا کی جاتی ہے۔

اخلاق

اخلاق خُلُق کی جمع ہے۔ خُلُق اور خُلُق دو جدا جدا لفظ ہیں۔ خُلُق سے مراد صورتِ ظاہری ہے اور خُلُق سے مراد صورتِ باطنی ہے۔ کیونکہ انسان جس طرح جسم سے ترکیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضا اس کو مرحمت ہوئے ہیں۔ جن کا ادراک قوتِ بصارت (یعنی چہرے کی آنکھیں) کر سکتی ہیں۔ اس طرح انسان روح اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے اور اس کا ادراک بصیرت (یعنی دل کی آنکھ) کرتی ہے۔ یہ ترکیب ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور ان دونوں ترکیبوں میں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورت اور قسم قسم کی شکلوں پر پیدا فرمایا ہے کہ کوئی صورت اور سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی سیرت اور صورت بری اور بھونڈی ہے۔ ظاہری ہیئت و شکل کو صورت کہتے ہیں اور باطنی شکل و ہیئت کو سیرت کہتے ہیں۔ سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾ [الحجر: 29]

یعنی آدم علیہ السلام کے پتلے میں میں نے اپنی روح کو پھونک دی۔ اس آیت کریمہ میں روح کو اپنا کہہ کر ذکر فرمایا ہے۔ دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلِ

الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ [الاسراء: 85]

ترجمہ: ”کہہ دو کہ: روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے۔“ اس میں اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ روح امر ربی ہے اور جسم کی طرح سفلی اور خاکی نہیں ہے۔ کیونکہ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا

مِّنْ طِينٍ﴾ [ص: 71]

ترجمہ: ”میں گارے سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔“ اس مقام پر روح سے مراد وہ شے ہے جو حق تعالیٰ کے الہام اور القا سے اپنی اپنی استعداد کے موافق اشیاء کی معرفت اور ادراک حاصل کر سکتی ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ زیادہ قابل لحاظ امر ربانی یعنی سیرت انسانی ہے کہ جب تک اس باطنی ترکیب کی شکل اور ہئیت میں حسن موجود نہ ہوگا اس وقت تک انسان کو خوب سیرت نہیں کہا جاسکتا اور چونکہ اس صورت کے اعضا ہاتھ پاؤں کی طرح سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے باطنی اعضا مرحمت فرمائے ہیں۔ جن کے نام قویٰ طبعیہ، قویٰ سبعیہ، قویٰ اور آبیہ ہیں۔ جو بالترتیب نفس، قلب اور عقل سے ناشی ہیں۔ کھسین سیرت ان اعضا کی حالت پر دو طرح منحصر ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان سارے اعضا میں اعتدال پایا جائے اور دوسرا ان میں کوئی بیماری نہ ہو۔ اب ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

1) قویٰ طبعیہ جو نفس سے ناشی ہیں:

قرآن سے ثابت ہے کہ انسان کے نفس کی تین حالتیں ہیں۔ نفس اتارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ۔ نفس اتارہ کی حالت بیماری کی ہے اور نفس مطمئنہ صحت کی حالت ہے اور نفس لوامہ اس کی درمیانی حالت ہے جس میں بیماری اور صحت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نفس کا کام چونکہ جسم کی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ اس لیے اس کی تفریط یہ ہے کہ اس کی ضروریات بھی پوری نہ ہوں۔ جس کے لیے فرمایا گیا ہے: ”لَآ اِنَّ لِنَفْسِكَ

عَلَيْكَ حَقًّا“ [جامع ترمذی، حدیث نمبر- 2413]

ترجمہ: ”بلاشبہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے“ اور اس کی افراط یہ ہے کہ نفس کو اپنی خواہشات پوری کرنے دی جائیں اور اس پر روک ٹوک نہ ہو۔ جس سے قرآن میں ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾ کے الفاظ میں ڈرایا گیا ہے اور حدیث شریف میں

ایسے شخص کو بے وقوف فرمایا گیا ہے۔ اس کا اعتدال یہ ہے کہ جسم کی ضروریات پوری کی جائیں اور ناجائز خواہشات کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔

انسان کی طبیعت جن چیزوں کو پسند نہیں کرتی، ان کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جس قوت سے یہ کام لیا جاتا ہے وہ قوتِ غضب ہے۔ اس کے اعتدال کا نام شجاعت ہے اور یہی عند اللہ پسندیدہ ہے۔ کیونکہ اگر اس میں زیادتی ہوگی تو اس کا نام تہور اور بے باکی ہوگا اور اگر کمی ہوگی تو یہ بزدلی کہلائے گی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں۔ حالتِ اعتدال یعنی شجاعت سے لطف و کرم، دلیری و جودت و بردباری، استقلال، نرمی و ملاحظت اور غصہ کے ضبط کا مادہ، نیز ہر کام میں دور اندیشی و وقار پیدا ہوتا ہے اور اگر زیادتی ہوتی ہے تو ناقابت اندیشی، ڈینگ مارنا، شیشی بگھارنا، غصہ سے بھڑک اٹھنا، تکبر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو بزدلی و ذلت، بے عزتی، کم ہمتی، خساست، کمینہ پن اور وہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں جو چھچھور پن کہلاتی ہیں۔

انسان کو طبعاً جو چیزیں پسند ہوتی ہیں ان کو اپنانا چاہتا ہے۔ جو قوت اس میں کار فرما ہوتی ہے اس کو قوتِ شہوت کہتے ہیں جس کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے۔ اگر یہ اپنی حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو حرص و ہوا کہلائے گی اور گھٹ جائے تو بے کار محض ہو کر معاشرے کا عضوِ معطل ہو جاتا ہے۔ حالتِ معتدل یعنی پارسائی اللہ پاک کو پسند ہے اور اس سے جو فضائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت، حیا، صبر، قناعت و اتقا کہلاتے ہیں۔ طمع کم ہو جاتی ہے۔ خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے حرص و لالچ، خوشامد، چاپلوسی، امر کے ساتھ تذلل اور فقرا کو بنظرِ حقارت دیکھنا، بے حیائی، فضول خرچی، ربا، تنگ دلی، نامردانگی اور حسد وغیرہ فضائل بد پیدا ہوتے ہیں۔ نفس کے ان دونوں قسم کے رذائل پر عمل نہ کرنا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یہ تقویٰ ہے۔ جو ان رذائل سے وجود میں آتا ہے۔ گویا بنجور کے الہام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رد کر کے تقویٰ کے الہام کو اختیار کرتا ہے۔

(2) قویِ سبعیہ جو قلب سے ناشی ہیں:

قرآن میں قلبِ سلیم کا لفظ ان آیات کریمہ ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا

بَنُونَ ۙ اَلَا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۸﴾ [الشراء: 88-89]

میں آیا ہے یعنی صحت مند دل۔ اس کا مطلب ہے بیمار دل بھی ہو گا جس کو سلیم بنایا گیا ہو گا۔ دل چونکہ ایمان و کفر اور جذبات مثلاً محبت و نفرت کی جگہ ہے۔ اس لیے اس کی سب سے پہلی اصلاح ایمان کا حصول ہے۔ اس کے بعد اس کی بیماریوں کا علاج کیا جائے گا تو قلب سلیم بنے گا۔ اس کی سب سے بڑی بیماری دنیا کی محبت ہے اور اس کی سب سے اچھی حالت اللہ تعالیٰ کی محبت سے اس کا سرشار ہونا ہے۔ دنیا کی محبت حب جاہ کی صورت میں ہو یا حب باہ اور حب مال کی شکل میں ہو بیماری ہے۔ لیکن اس میں بھی حدود ہیں۔ مال سے اتنی بے اعتنائی کہ ضائع ہو، حب باہ کی اتنی کمی کہ حق زوجیت بھی ادا نہ کر سکے اور حب جاہ سے اتنی بے پرواہی کہ عزت نفس کی حفاظت بھی نہ ہو، یہ ان کی تفریط کی حالت ہے۔ جبکہ مال اور لذتوں کی اتنی طلب کہ جائز و ناجائز کی پروا نہ رہے اور جاہ کی ایسی محبت کہ دوسروں کو حقیر سمجھیں یا اس کے حصول کے لیے غیر شرعی امور کا مرتکب ہوں، ان کی افراط کی حالت ہے اور ان کا اعتدال یہ ہے کہ مال کی اتنی محبت ہو کہ مال کو ضائع نہ کرے، لذتوں اور جاہ کے حصول میں شریعت کی حدود کا خیال رکھے۔

(3) قوی اور اکیہ جو عقل سے ناشی ہیں:

قرآن میں عقلمندوں کو اولوالالباب کہا گیا ہے جو کھڑے بیٹھے لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور مخلوقات میں غور کرتے ہیں۔ اس طرح ایمان کی دعوت کے لیے ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ کا لفظ آیا ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کی عقل نہیں اس کا دین نہیں۔ عقل کا کام سوچ و بچار، تجزیہ، تقابل اور فیصلہ کرنا ہے۔ یہ حافظے میں معلومات رکھتی ہے اور اس کی بنیاد پر اپنا کام چلاتی ہے۔ اس کے ذریعے جذبات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور تذکیر کے ذریعے اس کو اس کا اصل کام یاد دلایا جاسکتا ہے۔ یہ نفس اور جذبات سے متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ اس کی بیماری کی حالت ہے۔ اس کی صحت کی حالت یہ ہے کہ ایمان کی روشنی میں آفاقی تعلیمات سے

متاثر ہو کر دنیا میں قلب کے جذبات کو اعتدال پر رکھے اور نفس کو قلب کے ذریعے مجاہدے کے لیے تیار کر کے اس کو شریعت کا پابند بنائے۔ عقل کی تفریط کی حالت حماقت اور افراط کی حالت مکاری کہلاتی ہے اور اس کا اعتدال حکمت ہے جس کے لیے فرمایا گیا ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ [البقرہ: 269]

ترجمہ: ”اور جسے دانائی عطا ہو گئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔“

اللہ تعالیٰ نے عقل کی نعمت انسان کو عطا فرمائی کہ اس کے ذریعے انسان اپنے علم سے کام لے سکتا ہے۔ کیونکہ محض علم کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال کے لیے عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ معلومات تو کافی رکھتے ہیں لیکن ان کے استعمال کا ان کو سلیقہ نہیں ہوتا، جس کی وجہ ان میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ کم عقل لوگوں پر جذبات زیادہ حاوی ہوتے ہیں اور عقلمند لوگ جذبات کے حاکم ہوتے ہیں۔ قوتِ عقل میں اگر اعتدال ہو تو انسان مدبر، منتظم، ذکی اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ اس کی رائے صائب (درست) ہوتی ہے اور ہر مضمون میں اس کی طبیعت چلتی ہے اور جو دت دکھلاتی ہے اور اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے اور اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہو گا تو کند ذہنی و حماقت اور بیوقوفی کہلائے گی۔ جس کا اثر یہ ہو گا کہ ایسا آدمی جلدی دوسرے کے دھوکے میں آجائے گا۔

◆ حالتِ اعتدال کی اہمیت

جب انسان کے یہ تینوں قویٰ حالتِ اعتدال پر آجائیں تو اس کی حالت قابلِ اطمینان اور لائقِ تعریف ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسان صاحبِ حسنِ خلق اور خوب سیرت کہلائے گا۔ اصل میں یہ ان قویٰ کی تہذیب کی علامت ہے۔ غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حدِ اعتدال پر ہوں گی تو اس وقت انسان کو خوب سیرت کہا جائے گا۔ کیونکہ اعتدال سے بڑھنا اور گھٹنا دونوں حالتیں حسن سے خارج ہیں۔ ”خَيْرٌ اَلَا مُؤَدِرٌ اَوْ سَطْهًا“ نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے بندے وہ ہیں جو نہ اسراف کرتے ہیں

نہ بخل، بلکہ اس کے بین بین حالت پر رہتے ہیں۔ جس طرح حسن ظاہری میں کمی و بیشی ہوتی ہے کہ کوئی زیادہ خوب صورت ہے اور کوئی کم، اسی طرح حسن باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ پس سب سے زیادہ حسین سیرت تو سرورِ عالم رسول مقبول ﷺ ہیں کہ آپ کی شان میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ [القم: 4]

ترجمہ: ”اور یقیناً تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔“

آپ ﷺ کے بعد جس مسلمان کو آپ ﷺ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہوگی۔ اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے اور ظاہر ہے کہ سیرت باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہو گا اسی قدر اس کو سعادت اخروی حاصل ہوگی۔ اخلاق سب فطری جبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے نہ محمود، بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح و ذم آجاتی ہے: ”مَنْ أَعْطَىٰ اللَّهُ وَمَنَعَ اللَّهُ فَقَدْ

اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ“ [الجامع الصغیر و زیادہ، حدیث نمبر: 10909]

یعنی جس نے اللہ ہی کی رضا کے لیے دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لیے روکا تو اس کا ایمان مکمل ہوا۔ اس میں ”أَعْطَىٰ“ اور ”مَنَعَ“ دونوں کے ساتھ ”لِلَّهِ“ کی قید ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں۔ نہ بخل مطلقاً مذموم ہے۔ بلکہ اگر خدا کے لیے ہو تو دونوں محمود ہیں ورنہ دونوں مذموم ہیں۔ اخلاق ذمیمہ جن سے نفس کا تزکیہ کرانا ضروری ہے۔ یوں تو بہت ہیں۔ مگر اصول یہی ہیں جن کا آئندہ ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے۔ اس لیے جب تک سب ہی سے نجات نہ ملے گی اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے پروا رہنا اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو، وہ تندرست اس وقت کہلا سکتا ہے جب کہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں۔ جس طرح کوئی خوب صورت آدمی حسین اسی وقت کہلا سکتا ہے جبکہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان غرض سارے اعضا مناسب ہوں اور خوبصورت ہوں۔ اسی طرح انسان کو حسنِ خلق اسی وقت حاصل ہوگا جب

اس کی تمام باطنی حالتیں قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہوں۔ رسول مقبول ﷺ فرماتے ہیں: ”أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 1162]

ترجمہ: ”ایمان والوں میں کامل ترین مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔“ پس اسی اصل کا نام دین ہے اور اسی کی تکمیل کے لیے رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے۔

بعض لوگ اخلاق کو مروت کے معنی میں لیتے ہیں جو کہ صرف اخلاق کا جزو ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ بات چیت اچھی طرح کرتا ہے یا کسی کے کام کوئی آتا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اس کے بہت اچھے اخلاق ہیں اور ملنسار ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اوپر اخلاق کے بارے میں تفصیل جاننے سے پتا چلا کہ یہ صرف اخلاق کا جزو ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اگر خدا کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے کوئی دنیاوی مقصد وابستہ ہو، تو پھر جزو بھی نہیں کاروبار ہے۔ اس سے کافروں کی یا کمزور مسلمانوں کی ان اچھی صفات کی نفی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو بھی یہ اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کی ہوئی ہیں۔ اس لیے وہ قابلِ تعریف تو پھر بھی ہیں۔ جیسے حاتم طائی کی سخاوت کی آپ ﷺ نے تعریف فرمائی۔ پس اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہو تو اس کا صلہ ان کو دنیا میں تو مل جائے گا کہ لوگ ان کی تعریف کریں گے یا ان کے دوسرے دنیاوی کاموں میں لوگ ان کے ساتھ اچھا رویہ رکھیں گے۔ لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ کتنی بڑی محرومی ہے کہ عمل بھی کیا اور فائدہ بھی نہیں ہوا۔ دوسری طرف اگر کچھ ایسے دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال کی جائیں جن کا حاصل کرنا ان کے لیے جائز نہیں تھا۔ تو یہ دھوکہ اور فریب ہے۔ اخلاق کے پردے میں بد اخلاقی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ فرمائے۔ آمین

◆ رذائل اور فضائل

آپ ﷺ نے فرمایا: ”حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ“ [جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن الاثیر، حدیث نمبر: 2603] جس کا مفہوم ہے کہ دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے اور

قرآن پاک میں نفس کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَالْتَمَسَهَا جُورًا وَتَقْوَاهَا﴾ [النس: 8]

ترجمہ: ”پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیزگاری کی ہے۔“

پس جس نفس کی تربیت نہ ہوئی ہو، اس میں جو فجور کے تقاضے ہیں اور قلب میں جو دنیا کی محبت کسی شکل میں بھی موجود ہے۔ ان کی ملی بھگت سے رذائل پیدا ہوتے ہیں اور عقل بھی نفس و قلب سے متاثر ہو کر ان کو دور نہیں کر رہی ہوتی، بلکہ ان کا ساتھ دے رہی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کا قلب و نفس مختلف حالت میں ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے باہمی امتزاج سے ہزاروں لاکھوں قسم کے رذائل کی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن میں بڑے بڑے رذائل جو گنے جاسکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

حرص، غصہ، جھوٹ، غیبت، بخل، ریا، عجب، خود رائی، تکبر، حسد اور کینہ وغیرہ۔ ان کو اخلاقِ ذلیلہ بھی کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان پر بڑی بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ اس لیے ان کی اصلاح بہت ضروری ہوتی ہے۔

اصلاح کے بعد جو اخلاقِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بڑے بڑے درج ذیل ہیں: توحید، اخلاص، توبہ، اللہ والوں کی اور شعائر اللہ کی محبت، شوق، انس، خوف، خشیت، رجا، زہد، توکل، قناعت اور حلم وغیرہ۔

◆ نظامِ ہدایت

چونکہ انسان ان رذائل کی موجودگی میں اپنی اصلاح کی تدبیر وضع کرنے سے قاصر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی ہدایت کے لیے دو عظیم سلسلے جاری فرمائے ہیں۔ ایک اپنی کتابوں و صحف کا سلسلہ، جو قرآن پر مکمل ہوتا ہے۔ دوسرا انبیائے کرام کا سلسلہ، جو خاتم النبیین حضور انور ﷺ پر مکمل ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّةَ

نَبِيِّهِ“ [موطا امام مالک، حدیث نمبر: 3]

ترجمہ: ”میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں ان کے ہوتے کبھی گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور میری سنت۔“ یہ وہ روشنی ہے جس کے بغیر ہمیں حق نظر نہیں آسکتا۔ اس کے علم کو علم نافع کہتے ہیں۔ لیکن اس سے عمل صالح وجود میں آئے، اس کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔

◆ نظام تربیت

حکمت کا اصول ہے کہ بیماری کا علاج اس کی ایسی ضد سے کیا جاتا ہے کہ اس سے اعتدال حاصل ہو جائے۔ پس غیر تربیت یافتہ شخص کا نفس چونکہ اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتا ہے لہذا اس کا علاج اس طرح ہو گا کہ اس کی مخالفت کی جائے تاکہ اس کا خواہشات پوری کرنے کا تقاضا دب جائے اور صرف ضروریات پوری کرنے پر اکتفا کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس طرح بیمار دل میں دنیا کی محبت بھری ہوتی ہے۔ اس کو نکالنے کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ڈالی جاتی ہے اور اس کے لیے ذکر کرایا جاتا ہے جس سے دل کو اسم کے ذریعے مسمیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ کیونکہ جسم میں آنے سے پہلے روح اللہ تعالیٰ کی عاشق تھی، جس کا اللہ تعالیٰ نے اس انداز میں ذکر فرمایا ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ [الأحزاب: 72]

ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ظالم، بڑا نادان ہے۔“

کیونکہ اپنے مفادات سے بیگانہ ہو جانا اور جان کی بازی لگانا کوئی عاشق ہی کر سکتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی دل کی اصلاح کے ذکر کا فرمایا گیا ہے۔ ایسے ہی دنیاوی نظام میں غلطاں و پچھاں عقل نفس کی خواہشات کو یاد رکھتی ہے اور ان کو پورا کرنے کی تدبیروں میں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ اس کا علاج ذکر اور آخرت کی تیاری کی فکر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیاوی چیزوں کی یاد کا توڑ اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے اور دنیاوی تفکرات کا علاج آخرت کی فکر ہے جس سے آخرت پر یقین درجہ بدرجہ بڑھتے بڑھتے حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے نفس کی تربیت کے لیے مجاہدہ ہے۔ دل کے لیے ذکر اللہ ہے۔ آقائے نامدار جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّ كُلَّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ وَإِنَّ صِقَالَةَ الْقَلُوبِ ذِكْرُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ۔“ [الدعوات الکبیر، للبیہقی، حدیث نمبر: 19]۔

ترجمہ: ”ہر چیز کو صاف کرنے والی چیز ہوتی ہے اور دلوں کو صاف کرنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے“ اور عقل کی اصلاح کے لیے ذکر اور فکر ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاٰخِثِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۗ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَقَعُوْدًا وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: 190-191]

ترجمہ: ”بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔ (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں۔ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔“

اصل میں تو علم، عمل اور اخلاص کا مطالبہ ہے چونکہ نفس و شیطان ان تینوں کو جیسا چاہیے نہیں ہونے دیتے اس لیے شیطان کی تو تربیت نہیں ہو سکتی۔ نفس کی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ اسی نفس کی تربیت کا نام سلوک ہے جو کہ علاج ہے اور علاج بغیر معالج کے نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کا معالج یعنی شیخ اپنے مرید کے نفس و قلب اور عقل کا علاج ان ذرائع سے کرے گا۔ اس لیے اس نظامِ تربیت کو عرفِ عام میں پیری مریدی بھی کہتے ہیں۔

اس سلوک کو طے کرنے کے لیے اخلاقِ رذیلہ کو اخلاقِ حمیدہ میں بدلنا پڑتا ہے جس کا نسبتاً تفصیلی تعارف یہاں دیا جاتا ہے۔ تاکہ سالک ان امور سے آگاہ ہو جن سے بچنا ہے اور ان امور سے بھی جن کو حاصل کرنا ہے اور ان سے متعلقہ تفصیلات سے بھی وہ آگاہ ہو سکے۔

1.1.1... سلبی اعمال (اخلاقِ رذیلہ)

اللہ تعالیٰ نے انسان سے صحت مند دل اور رذائل سے پاک نفس کا مطالبہ فرمایا ہے۔ اگر دل نفس کی بری خواہشات سے آلودہ ہو کر روحانی طور پر بیمار ہو جائے تو پھر انسان انسان نہیں رہتا، اس سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ ان ہی روحانی بیماریوں کو رذائل بھی کہتے ہیں۔ جب تک دل میں برے جذبات اور نفس کی بری خواہشات موجود ہوں، انسان خطرے میں ہوتا ہے کہ مبادا کس مرض سے روحانی ہلاکت ہو جائے۔ اس لیے جلد از جلد ان بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ ان ساری بیماریوں کو ختم کرنا مقصود ہے۔ لیکن ان کے علاج میں ترتیب شیخ کی اجتہادی بصیرت پر موقوف ہوتی ہے۔ مرید کا کام اپنے احوال کی اطلاع کرنا ہوتا ہے اور شیخ اس سے اندازہ لگاتا ہے کہ کون سی بیماری اس اطلاع سے معلوم ہو رہی ہے یا کس مرض کی صحت یابی کے بارے میں پتا چل رہا ہے۔ پھر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ جو ڈال دیتا ہے اس کے مطابق وہ مرید کو بتاتا ہے۔ اس طرح شدہ شدہ ان بیماریوں کا علاج ہو رہا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مکمل صحت ہو جاتی ہے۔ پھر اس صحت کو برقرار رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

روحانی بیماری اور جسمانی بیماری میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ جو جسمانی عوارض خود بخود آتے ہیں کہ ہر شخص نے ایک دن اس دار فانی سے جانا ہوتا ہے۔ اس سے مکمل چھٹکارا معالج کے بس میں نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب ارذل العمر کو پہنچتا ہے تو معالج کی یہ بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے کہ مزید بیماریوں سے جتنا ممکن ہو بچانے کی سعی کرتا رہے۔ موجودہ بیماریوں کے ساتھ تو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف جب روحانی صحت حاصل ہو جاتی ہے یعنی ان امراض سے چھٹکارا مل جاتا ہے تو پھر روحانی قوت میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری عمر میں بعض مشائخ کی روحانی قوت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روح کا میدان اور ہے اور جسم کا اور جسم فانی ہے اور روح باقی ہے۔

آنے والے صفحات میں روحانی امراض کی ضروری تفصیل دی جاتی ہے جو صرف ایک تعارف ہے۔ اس کی تفصیل اس مختصر کتاب میں نہ سما سکتی ہے نہ اس کا بیان کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ یہ مشائخ کا کام ہے کہ ہر مرض کی ضروری تفصیل معلوم کریں، ہر کس و ناکس کا یہ کام نہیں ہے۔

حبِ دنیا

اخلاقِ رذیلہ کی جڑ حبِ دنیا سے نکلی ہے۔ جو کہ تین قسم کی محبتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ تین مندرجہ ذیل ہیں:

(1) حُبِ جاہ۔

(2) حُبِ باہ۔

(3) حُبِ مال۔

سب سے پہلے حبِ دنیا کو بیان کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد اس کی تفصیل یعنی یہ تینوں محبتیں بیان کی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ [آل عمران: 185]

ترجمہ: ”اور یہ دنیوی زندگی تو (جنت کے مقابلے میں) دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7606]

ترجمہ: ”دنیا مؤمن کا قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے۔“

نفس کی جو خواہش شریعت کے مقابلے میں آئے، وہ دنیا ہے۔ نفس اتارہ شریعت کی پابندی سے تنگ ہوتا ہے۔ اس سے خلاصی چاہتا ہے۔ مال پر نظر کرتے ہوئے عقلمند اس کو شریعت پر عمل کے لیے خوگر بناتا ہے۔ اس سے یہ دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ بن جاتی ہے اور کافر جو نفس کو آزاد چھوڑتا ہے کہ جو چاہے کرے، چاہے آخر میں اس کو نقصان ہی ہو۔ تو یہ اس کی جھوٹی جنت ہے۔ کیونکہ وہ اس کی سزا عنقریب بھگتے گا۔

بعض علمائے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ مؤمن کے لیے وہاں جنت ہے جہاں تمام خواہشات پوری کی جائیں گی۔ لہذا یہ دنیا کہ جس میں چند خواہشات ہی جائز طریقے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اس میں باقی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ قید خانہ ہی ہے۔ اس طرح کافر کے لیے وہاں دوزخ ہے۔ جہاں اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں دنیا جہاں اس کی چند خواہشات پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ جنت ہی تو ہے۔

◆ حقیقتِ دنیا

جس چیز میں فی الحال حظِ نفس ہو اور آخرت میں اس کا کوئی نیک ثمرہ مرتب نہ

ہو، وہ دنیا ہے۔

◆ تشریح

ہر چند ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں۔ لیکن حسب فرمان نبی اکرم ﷺ تمام امراض کی جڑ صرف ایک ہی چیز حسب دنیا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ“ [جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن الاثیر، حدیث نمبر: 2603]

ترجمہ: ”دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے“ اور جڑ یعنی اصل مرض ہی بقیہ امراض کا سبب ہو کرتی ہے اور اصل کا علاج کرنے سے جملہ امراض خود ہی دفع ہو جائیں گے۔ جس میں حب دنیا ہوگی اس کو آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا اور جب آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا تو وہ شخص نہ تو اعمالِ حسنہ کو انجام دے گا اور نہ برائیوں سے بچے گا۔ اس کے برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ حب دنیا میں فکرِ دین کم ہوتی ہے۔ چنانچہ جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ فکرِ دین کم ہوگی۔ اگر کامل درجہ کی حب دنیا ہوگی تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی۔ جیسی کہ کفار میں ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی۔ مگر یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ حقیقت میں دنیا مال و دولت زن و فرزند کا نام نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کسی ذی اختیار کے ایسے مذموم فعل یا ایسی حالت کا نام ہے جو اللہ سے غافل کر دے خواہ کچھ بھی ہو، اسی کو کہا ہے کہ:

غافل کرے جو رب سے وہی اصل میں دنیا ہے
اس سیم و زر و آل کو دنیا نہیں کہتے

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ حبِ دنیا کے تین شعبے ہیں۔ حبِ مال، حبِ باہ اور حبِ جاہ۔ ان کی تفصیل عنقریب آرہی ہے۔ طلبِ دنیا یعنی دنیا کماتا تو بری بات نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا جائے تو یہ واقعی جرم ہے۔ مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے ہے۔ اسی کو کہا ہے۔

کشتی میں آئے پانی تو وہ موت ہے اس کی
نیچے ہو یہی پانی تو ہے اس کی زندگی

یعنی پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے۔ اس طرح کہ کشتی سے باہر اور نیچے رہے تو معین اور مددگار ہوتا ہے اور اگر کہیں پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح مال ہے کہ اگر قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین ہے اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

واسطے ہو دین کے اچھا مال قبول
مال صالح لصالح گفت رسول

کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ : ”نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ
الصَّالِحِ“ [الآداب للبیہقی، حدیث نمبر: 791]

ترجمہ: ”نیک آدمی کے لیے مال حلال بہت ہی اچھا ہے۔“ چونکہ مؤمن صالح اس مال میں سے اقارب کو دے گا۔ ضروریاتِ دین میں چندہ دے گا۔ لوگوں کی مدد کرے گا۔ لیکن اگر دل میں مال کی محبت ہے تو اوروں کے حقوق دبا لے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب فارس کا خزانہ آیا تو آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿ذُرِّيَّةً لِّلنَّاسِ حُبُّ الشَّهْوَاتِ﴾ [آل عمران: 14]

ترجمہ: ”لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے جو ان کی نفسانی

خواہش کے مطابق ہوتی ہے“ اور فرمایا: ”اے اللہ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اندر اس کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے ہم اس کا توازلہ نہیں چاہتے، مگر یہ دعا ہے کہ مال تیری محبت میں معین ہو جائے“ اور وہ دنیائے مذموم جو آخرت سے غافل کرے، اس کی مثال سانپ کی سی ہے جس کا ظاہر تو اچھا ہے اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ مگر اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ اسی کو کہا ہے کہ اگر کسی بچے کے سامنے کوئی زہریلا سانپ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے۔ کیونکہ اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا؟ ہماری حالت بھی اس بچے کی سی ہے کہ ہم دنیا کی ظاہری آب و تاب، نقش و نگار اور رنگ و روپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں اور یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جس قدر خوب صورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے۔ اسی لیے حقیقت شناس اس دنیا کی طرف رغبت نہیں کرتے۔ دنیا کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے لوگ اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں اور اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ: ”لَوْ كَانَتْ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بُعُوضَةٍ مَّاسَتْ فِي كَافِرٍ أَمِنْهَا شَرِّ بَتَّةٍ مَاءٍ“ [المترک علی الصّحیحین للحاکم، حدیث نمبر: 7847]

ترجمہ: ”اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتے۔“

چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی قدر کچھ بھی نہیں ہے اس لیے مغبوض شے اپنے دشمنوں کو دیتے ہیں اور حقیقت شناس آدمی ہمیشہ ایسی چیز سے گھبراتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے نزدیک مغبوض ہو۔ نیز جناب رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو ایک مثال میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ بیان فرماتے ہیں کہ ”مَا لِي، وَوَلِلدُّنْيَا، اِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رَاكِبٍ، قَالَ فِي ظِلِّ شَجَرَةٍ فِي يَوْمٍ صَائِفٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَ كَهَا“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 4208]

ترجمہ: ”مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار سخت گرمی کے دن راستے میں جا رہا ہو اور کسی درخت کے سائے میں سستانے کے لیے ٹھہر جائے اور سستا کر اپنی راہ لے۔“

◆ حب دنیا کا علاج

موت کو کثرت سے یاد کرتے رہنا اور مدتوں کے لیے منصوبے اور سامان نہ کرنا اور نہ سوچنا اس کا علاج ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: ”مُوتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا“ یعنی مر جانے سے پہلے مر جاؤ۔ جس کا مطلب ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے آپ میں مرنے والوں کے اوصاف پیدا کرو۔

حُبِ جَاهِ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْأَخْرَجُ نَجَعُلَهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فِسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [التقص: 83]

ترجمہ: ”وہ آخرت والا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں نہ توبہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد اور آخرت انجام پر ہیز گاروں کے حق میں ہو گا۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَا ذُنْبَانِ جَاءَعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2376]

وہ کے گلے میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ اس گلہ کو اتنا تباہ نہیں کرتے جتنا آدمی کی حرص مال و جاہ پر اس کے دین کو تباہ کر دیتی ہے۔“

◆ حقیقتِ حبِ جاہ

دل میں دوسروں سے اپنی تعظیم کا خواہشمند ہونا حبِ جاہ کی حقیقت ہے۔

◆ تشریح

حبِ جاہ ایسا مرض ہے کہ اس کا پتا چلنا مشکل ہے۔ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس کا سبب حبِ جاہ ہو، تب پتا چلتا ہے کہ میرے اندر حبِ جاہ کا مرض ہے۔ یہ مرض محض وہی ہے اور محض دوسرے کے خیال سے قائم ہے۔ کیونکہ جاہ دوسرے کی نظر میں معزز ہونے کا نام ہے اور اس کا مدار دوسرے کے خیال پر ہے۔ وہ جب چاہے اپنا

خیال بدل دے، پس ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود طالبِ جاہ خوش ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ معزز ہونا بیماری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو فی الحقیقت دوسروں کا فعل ہے جس میں ضروری نہیں کہ اس معزز شخص نے اس کی طلب کی ہو۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اپنی نگاہوں میں گرے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے آپ میں کوئی کمال نہیں پاتے، لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ عزت ڈال دیتے ہیں۔ ناپسندیدہ جاہ وہ ہے جس کی طلب اور خواہش میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پروا نہ کی جائے اور ظاہر ہے یہ وہ بلا ہے جو دین و دنیا دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دینی نقصان تو یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ دنیا مجھ پر فدا ہے۔ تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر کار اس عجب و کبر کی وجہ سے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے۔ یہ تو دین کا نقصان ہوا۔ دنیا کا نقصان یہ ہے کہ مشہور آدمی کے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحبِ جاہ کا دین بھی خطرے میں رہتا ہے اور دنیوی خطروں کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے۔ پس حق تعالیٰ کی طرف سے طلب کے بغیر جو جاہ حاصل ہو، وہ نعمت ہے۔ لیکن خود سے اس کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنا اور اپنے کمالات کی طرف اس کی نسبت کرنا مذموم ہے۔ ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مال کی طرح انسان جاہ کا بھی بقدرِ ضرورت محتاج ہے۔ تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور بے خوف ہو کر باطمینان قلب عبادت میں مشغول رہ سکے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں یہ دعا منقول ہے: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَفِي آعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا“ [ابیشی فی مجمع الزوائد، ج 10، ص 181]

ترجمہ: ”اے اللہ! مجھے میری نگاہوں میں گرا دے اور دوسروں کی نگاہوں میں معزز کر دے۔“

اس میں یہی جاہ مطلوب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بڑا ہونے کا توڑ اس میں موجود ہے کہ اپنی نظروں میں آدمی چھوٹا ہو۔ لہذا اتنی طلبِ جاہ میں بھی مضائقہ نہیں۔ اس لیے قاعدہ یہ ہوا کہ خود سے جو جاہ حاصل ہو اور عملِ شریعت کے مطابق

ہو، تو یہ خدا کی طرف سے انعام ہے اور اگر عمل شریعت کے مطابق نہ ہو اور خود سے جاہ حاصل ہو، تو یہ خدا کا امتحان ہے اور آزمائش ہے۔ جاہ کی ایسی طلب کہ لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کا جذبہ ہو۔ اس میں بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

- (1) لوگوں سے اپنی اطاعت ان کو خیر پہنچانے کے لیے ہو۔ جیسے حاکم عادل، استاد، مربی شیخ وغیرہ۔ یہ جائز اور بعض اوقات ضروری ہے۔
- (2) لوگوں کو صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے مطیع کرنا چاہتا ہو۔ یہ نہ صرف ناجائز بلکہ اکثر بیماریوں کی جڑ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو جاہ شریعت سے ہٹا دے، چاہے طلب میں یا نتیجے میں، اس سے باز آنا چاہیے اور جو جاہ شریعت پر چلنے میں مدد کرے، وہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے۔ مختصر آئیے کہ آدمی اس جاہ کا طالب بنے کہ جو منجانب اللہ ایسی عطا ہو کہ اس میں اپنے کمال پر نظر نہ جائے۔

◆ حبِ جاہ کا علاج

یوں سوچے کہ اس وہمی کمال سے کیا حاصل جو پائیدار نہیں۔ اس کی بجائے اس کمال کو حاصل کرنا چاہیے جو پائیدار ہو یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ کا کرم فرما کر عزت مند بنا دے۔ اس کے لیے چونکہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے ہر اس تدبیر کو اختیار کرنا چاہیے جس سے آدمی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے۔ مثلاً اپنے نقائص پر نظر رکھنا۔ جو لوگ اپنے اوپر تنقید کرنے والے ہوں، ان کی باتیں غور سے سنا کہ مبادا کوئی کام کی بات اس میں نکلی آئے۔ تکبر کے بارے میں وعیدوں کو پیش نظر رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوچنا کہ نہ تعظیم و اطاعت کرنے والے رہیں گے اور نہ میں رہوں گا۔ پھر ایسی موہوم اور فانی چیز پر خوش ہونا نادانی ہے۔ اس سے بھی فائدہ ہو جاتا ہے۔

حبِ باہ

ویسے تو ”باہ“ کا لفظ ایک خاص قسم کی جنسی لذت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تمام لذاتِ دنیاوی کی محبت حبِ باہ کہلاتی ہے۔ نفس لذت کا طالب ہوتا

ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ ساری لذات کو اپنے لیے جمع کرے۔ اس کے لیے وہ پروا نہیں کرتا کہ وہ جائز طریقے سے حاصل کی جائیں یا ناجائز طریقے سے۔ حب باہ بھی چونکہ ایک وقتی جذبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی وجہ سے جو گناہ ہوتے ہیں ان پر بعد میں انسان نادم ہوتا ہے۔ لیکن ان کا چھوڑنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ لذات کا خوگر نفس مجاہدہ کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس میں بڑی برائی یہ بھی ہے کہ ان لذات کی طلب بڑھتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ عام طریقوں سے ان لذات سے بدکار نفس مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت انسان مجسم شیطان بن جاتا ہے اور اس سے ایسی ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (Perversion) کہتے ہیں۔ دنیائے طب میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کا علاج دنیائے لذات میں منہمک معالجین کیا جانیں؟ اس لیے یورپ اور امریکا میں بظاہر بہت ہوشیار لوگ بھی اس معاملے میں بالکل بے وقوف بن جاتے ہیں اور اس کو بعض اوقات مرض ہی نہیں سمجھتے۔

جاہ کی طرح اگر باہ کی تسکین منجانب اللہ جائز طریقے سے نصیب ہو جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ لذات سے بالکل منہ موڑنا مطلوب نہیں ہے۔ لیکن ان میں اتنا انہماک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ٹوٹ جائے، مذموم ہے۔ روزے میں خواہش نفس کی مخالفت کرائی جاتی ہے۔ لیکن جب افطار کا وقت ہو جائے تو جلدی مستحب ہے اور اس کو فرحت فرمایا گیا ہے۔ اس طرح عید کی خوشی، ولیمے کی خوشی وغیرہ وغیرہ۔ نیز شادی میں باکرہ کے ساتھ شادی کی پسندیدگی۔ چار تک شادیوں کی اجازت وغیرہ سب تسکین باہ ہی کے جائز ذرائع تو ہیں۔ اسلام میں نہ تو رہبانیت ہے کہ خود کو اذیت دینا ہی دین ٹھہرے اور نہ ہی ابا حیت ہے کہ ہر چیز جائز ہو جائے، بلکہ ان کے درمیان اعتدال کا ایک راستہ ہے۔ جس پر چلنا مطلوب ہے اور اس کا تعین سوائے وحی کے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں وحی سے استفادہ کرنا ہی نجات کا باعث ہو سکتا ہے۔

◆ حبِ باہ کا علاج

اس کا علاج مجاہدہ ہے کہ نفس کو روکا جائے۔ روزہ رکھنا اور شرعی قیود مثلاً غرض بصر یعنی نگاہ نیچے رکھنا وغیرہ اس کا علاج ہے۔ موت کی یاد ان لذات کا موثر توڑ ہے۔ ایسی محفلوں سے بچنا جن میں لذاتِ نفس کے لیے ترغیب ہو، بہترین پرہیز ہے۔ اپنے نفس پر ہر وقت بدگمان رہنا چاہیے اور دل میں یہ سوچا جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس وقت میری موت واقع ہو جائے تو کیا ہو گا۔ بعض لوگ ایسے حالات میں مر جاتے ہیں یا مارے جاتے ہیں کہ دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایسی عبرتناک موت کا سوچ کر ایسی چیزوں کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے، جس میں اتنے خطرات ہوں۔

حبِ مال

مال کا جمع کرنا ایک علیحدہ بیماری ہے۔ بعض دفعہ یہ بیماری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ جس چیز کے لیے مال مطلوب ہوتا ہے یعنی عزت اور آرام، اس کو بھی مال کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔ جیسے ڈوم اس کے لیے عزت قربان کر دیتے ہیں اور بنیے آرام اور لذات۔ مثل مشہور ”چڑھی جائے پر دمڑی نہ جائے“ ایسے ہی موقع کے لیے ہے۔ مال کا جمع کرنا فی نفسہ مطلوب ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ بہت سارے منافع وابستہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہیے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ مال ہو لیکن کارِ خیر میں اس کے خرچ سے دل مانع نہ ہو، تو یہ مال کی محبت نہیں ہے۔ بخل اسی حبِ مال ہی کا اثر ہے۔ اس کی باقی تفصیل حبِ دنیا میں گزر گئی ہے وہیں دیکھی جائے۔

◆ حقیقتِ حبِ مال

مال کی ایسی محبت کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز نہ رہے۔ یہ حبِ مال کی حقیقت ہے۔

◆ حبِ مال کا علاج

نفس پر جبر کر کے کارِ خیر میں مال کو خرچ کرنا، اس کا علاج ہے۔ کم از کم زکوٰۃ اور

صدقات واجبہ کی ادائیگی کا التزام ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی نیک لوگوں کی دعوت کرنا بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔

◆ اخلاقِ رذیلہ کی قسمیں اور ان کا علاج

جیسا کہ اخلاق کے باب میں حرص، غصہ، جھوٹ، غیبت، بخل، ریا، عجب، خود رائی، تکبر، حسد اور کینہ وغیرہ کا ذکر کیا گیا تھا کہ ان کو اخلاقِ رذیلہ یا اخلاقِ ذمیمہ کہتے ہیں۔ تزکیہ رذائل کے دور کرنے کے عمل کو کہتے ہیں۔ فقہ کا قاعدہ بھی ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت سے زیادہ ضروری ہے۔ نیز یہ اخلاقِ ذمیمہ ایسے ہیں کہ ان کو جب دور کیا جاتا ہے تو زیادہ تر اخلاقِ حمیدہ خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ باقی اخلاقِ حمیدہ کے لیے بہت تھوڑی سی کوشش بھی کافی ہوتی ہے۔ اس لیے پہلے اخلاقِ ذمیمہ کی قدرے تفصیل دی جاتی ہے۔ جہاں تک ان کے علاج کا تعلق ہے۔ وہ دو قسم کا ہے:

(1) اصل علاج جس سے ان رذائل کی جڑ کٹ جائے۔

(2) ان کا فوری علاج۔

فوری علاج ان کا مختلف ہے اور وہ وقتی ہوتا ہے۔ اس سے مرض کا ازالہ یا مکمل علاج نہیں ہو پاتا، لیکن وقتی طور پر اس کے ذریعے اس مرض کے شر سے خود کو بچایا جاسکتا ہے۔ جبکہ ان کا جو اصل علاج ہے۔ وہ تفصیلی سلوک طے کرنے اور جذبِ منتہی کے ذریعے ممکن ہے۔ سلوک طے کرنا کسی ہے اور جذبِ منتہی وہی ہے۔ سالک کا کام کسی میں کوشش کرنا ہے۔ وہی فیوض کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو ہم کو ہم سے زیادہ جانتا ہے اور ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے۔ البتہ دو باتوں کا فیصلہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک امید کسی ہے۔ کیونکہ اس کا مطالبہ ہے اور جب بندہ اس طرح کرے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ”أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي يَوْمٍ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6970]

ترجمہ: ”میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں۔“

اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی بھی خلاف نہیں فرماتے، تو پھر ڈر کس بات کا؟ جہاں تک نقشبندی طریقے کے جذبِ مکتسب یعنی جذبِ مبتدی کا تعلق ہے۔ وہ

بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ شوق کو بڑھانے کے لیے ہے کہ سلوک طے کرنے پر نفس کو قلبِ راضی کر سکے۔ جب سلوک طے کرنے کے لیے قلب و نفس تیار ہو گئے تو اس کے بعد پھر سب طریقوں کا ایک ہی نظام ہے۔ جس میں اکابر کی تحقیقات کی وجہ سے فرق آسکتا ہے۔ کیونکہ یہ فن تجرباتی ہے اور ہر سالک کے لیے بھی تھوڑا تھوڑا فرق پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ہر سالک کی طبیعت اور حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس میں سالک کے لیے خصوصی طور پر کون سا طریقہ مناسب ہے۔ یہ شیخ کے اجتہاد اور بصیرت پر چھوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شیخ طبیب کی طرح مجتہد ہے۔

اب ترتیب کے ساتھ اخلاقِ ذمیرہ کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور ان کا فوری مگر وقتی علاج بھی بتایا جاتا ہے۔

1.1.1.1... حرص

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [طہ: 131]

ترجمہ: ”اور دنیوی زندگی کی اس بہار کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان (کافروں) میں سے مختلف لوگوں کو مزے اڑانے کے لیے دے رکھی ہے۔“

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”يَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَيَشْبُ مِنْهُ اِتِّسَانُ: الْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2339]

ترجمہ: ”آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور اس کی دو چیزیں بڑھتی رہتی ہیں۔ مال پر حرص کرنا اور عمر پر حرص کرنا۔“

◆ حقیقتِ حرص

حرص حبِ دنیا کا تقاضا ہے۔ دل کا اپنے مفادات کے ساتھ ہمہ وقت مشغول ہونا حرص کی حقیقت ہے۔

◆ تشریح

جیسا کہ حب دنیا تمام روحانی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح حرص تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو اُم الامراض کہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرصِ مال نہ ہو تو کوئی بھی کسی کا حق نہ دبائے۔ بدکاری کا منشا بھی لذت کی حرص ہے۔ اخلاقِ رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہے۔ کیونکہ عارفین کا قول ہے کہ ”تمام اخلاقِ رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر جاہ کی حرص ہے۔“ پس کبر بھی حرص سے ہوا۔ انسان کا طبعی خاصہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جن میں سونا یا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں، پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہو گا۔ جتنا ہوس کو پورا کرو گے اتنا ہی بڑھے گی۔ جیسا کہ خارش والا جتنا کھجلا تا ہے اتنی ہی خارش بڑھتی جاتی ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَمَرَ لِلنَّاسِ مَا تَمَنُّونَ** ﴿[النجم: 24]

ترجمہ: ”کیا انسان کو ہر اس چیز کا حق پہنچتا ہے جس کی وہ تمنا کرے۔“ یعنی بھلا انسان کی ہر آرزو پوری ہو سکتی ہے؟ یعنی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حرص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی۔ اس کی ہوس کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ کیونکہ ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے اور جب تقدیر پر راضی ہی نہ ہو تو ہر کام میں یوں دل چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے۔ چونکہ سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار ہے اس لیے اس کا نتیجہ پریشانی ہی پریشانی ہے۔ گو ظاہر میں اولاد اور مال سب کچھ ہو مگر حرص کا دل ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

◆ حرص کا علاج

یہ سوچے کہ حرص انسان اس لیے کرتا ہے کہ مزے میں رہے اور آرام پائے۔ جبکہ حرص کے ساتھ ان دو چیزوں کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پس جس چیز سے آرام اور مزہ ختم ہو اس کو آرام و مزے کے لیے کیوں کیا جائے؟ تقدیر پر قانع رہے۔ ضروریات کے لیے اسباب کو اختیار کرنے میں حرج نہیں ہے۔ لیکن پھر جو فیصلہ رب

کی طرف سے ہو اس پر راضی رہے۔ خرچ کو گھٹائے تاکہ زیادہ آمدنی کی فکر نہ ہو اور آئندہ کی فکر نہ کرے کہ کیا ہو گا اور یہ سوچے کہ حریص و طمع کرنے والا ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔ جنت کے مزدوں کو سوچے اور یہ کہ اگر میں نے ان لذتوں کو غلط طریقے سے حاصل کیا تو جنت کی لذتوں کو کیونکر حاصل کروں گا۔ اس طرح یہاں کی حرص وہاں کی حرص میں بدل جائے گی۔ اعمال کے فضائل کا مطالعہ کرے تاکہ اعمال کی حرص پیدا ہو اور وہ یہاں کی حرص کا توڑ کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی محبت کو بڑھائے تاکہ لذتوں کی محبت مغلوب ہو۔ موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرے کہ وہ لذات کو توڑنے والی چیز ہے اور آخرت کی طرف راغب کرنے والی ہے۔

عشقِ فانی تو پائیدار نہیں
حی و قیوم کا عاشق بن جا

1.1.1.2... شہوت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ

عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ [الانعامات: 40-41]

ترجمہ: ”لیکن وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا تھا تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔“

اور آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

”وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ: فَهَوَىٰ مُتَّبِعٌ“ [شعب الایمان لیسنتی، حدیث نمبر: 7252]

ترجمہ: ”رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے۔“ خواہش نفسانی کا نام شہوت ہے۔ اس کو ہوا بھی کہتے ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ کفر و شرک ہے۔ وہ تو اسلام ہی سے خارج کر دیتا ہے اور جو ادنیٰ درجہ ہے وہ کمالِ اتباع سے ڈگمگا دیتا ہے۔ ہر خواہش نفس میں یہ خاصیت ہے کہ راہِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَا

تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [ص: 26]

ترجمہ: ”اور نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی“ اور ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ ”وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَّتْ عَلَى اللَّهِ“ [المترک علی الصبیحین للحاکم، حدیث نمبر: 7639]

ترجمہ: ”عاجز وہ ہے جو اپنی خواہشات کی اتباع کرے اور پھر خدا سے نیک اجر کی امید رکھے۔“ خواہشِ نفسانی ایسی بری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدمہ معصیتیں اس سے ہیں۔ انسان نفس کی فوری خواہش کی تسکین کے لیے اسی نفس ہی کے مستقبل کی خواہشات کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ نیز اسی فوری خواہش کے لیے دوسروں کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر لادین حکومتیں بھی قوانین بنانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اجتماعی مفادات کا حصول ممکن نہیں۔ اس سے یہ پتا چلا کہ نفس کو اگر قابو نہیں کیا گیا تو یہ نہ صرف ملک دشمن اور قوم دشمن ہے۔ بلکہ خود اپنا بھی دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مصالحوں کو ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ اس لیے دونوں جہاں میں ہمیں خیر پہنچانے کے لیے کچھ قوانین پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جن کو شریعت کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فائدہ ہمارا اپنا ہے۔ اس لیے شریعت پر بلاچون و چرا عمل کرنا ہی عقلمندی ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الباقیہ: 18]

ترجمہ: ”لہذا تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔“

یعنی ہم شریعت کا اتباع کریں، ان جاہلوں کی خواہشوں کی اتباع نہ کریں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے فائدہ و نقصان سے غافل ہیں۔ اس لیے ان کی خواہشات کا اتباع کرنے میں سراسر نقصان ہے۔ اس کے مقابلے میں اس علیم و خبیر کے احکامات پر عمل کرنا نہایت ہی سود مند ہے۔ جو غنی بھی ہے اور ہمارا خیر خواہ بھی۔

◆ طریق کار

نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جَعَلَتْ بِهِ" [مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 167]

ترجمہ: کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں حق تعالیٰ کے پاس سے لایا ہوں (یعنی شریعت)۔
مرض کا علاج تب ہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے۔ پس جو کام کیا جائے سوچ کر کیا جائے کہ کہیں یہ شریعت کے خلاف تو نہیں۔

◆ شہوت کا علاج

شہوت کا علاج مجاہدہ کرنا ہے۔ یعنی جائز امور میں بھی تربیتاً اپنے نفس کو روکے تو ناجائز امور میں نفس کو روکنا آسان ہو جائے گا۔ جیسے روزے میں نفس کی تربیت کی جاتی ہے اور مجاہدہ نام ہے نفس کے تقاضوں کو روکنا بتکلف ہو یا بلا تکلف۔

1.1.1.3... غصہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظِ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [آل عمران: 134]

ترجمہ: "اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے" اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَا تَغْضَبْ" [صحیح بخاری، 3523]
ترجمہ: "غصہ مت کر۔"

◆ حقیقت غصہ

بدلہ لینے کے لیے دل کے خون کا جوش مارنا غصے کی حقیقت ہے۔

◆ تشریح

آپ ﷺ نے فرمایا: "كَيْسَ الشَّدِيدِ بِالصَّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ"۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 5763]

ترجمہ: ”پہلو ان وہ نہیں ہے جو کشتی لڑنے میں غالب ہو جائے بلکہ اصلی پہلو ان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو پائے“ بے قابو نہ ہو جائے۔ یعنی اصل میں قوی وہ ہے جو غصے پر مالک ہو، یعنی غصے پر غالب ہو، یہ نہ ہو کہ غصہ کے منشا کے مطابق فوراً عمل کرے، بلکہ اس کو شریعت کی تعلیم کے مطابق استعمال کرے۔ اس لیے کہ غصہ میں جوش پیدا ہونا طبعی امر ہے۔ اس میں ملامت نہیں ہے۔ مگر انسان کو خدا تعالیٰ نے اختیار بھی دیا ہے۔ اس لیے اس کو روکنا چاہیے۔ اس اختیار کو صرف نہ کرنا انسانیت کے خلاف ہے۔ غصہ کو بھی حق تعالیٰ نے بہت سی مصلحتوں سے انسان کی سرشت میں داخل کیا ہے۔ اس سے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ لیکن اختیار کو بھی ساتھ ساتھ رکھ دیا ہے کہ جس جگہ غصہ کا کام ہو وہاں کام لے اور جو جگہ غصہ کے کام کی نہیں۔ وہاں کام نہ لے۔

غصہ فی نفسہ غیر اختیاری ہے۔ لیکن اس کے اقتضا پر عمل کرنا اختیاری ہے۔ اس لیے اس کا ترک بھی اختیاری ہے اور اختیاری کا علاج بجز استعمالِ اختیار کے کچھ نہیں۔ گو اس میں کچھ تکلف و مشقت بھی ہو۔ اسی استعمال کے تکرار اور مداومت سے اس کا تقاضا ضعیف ہو جاتا ہے اور اس کے ترک میں زیادہ تکلف نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اختیار کے استعمال میں کبھی قدرے تکلف ہوتا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ ”لَا يَقْضِيَنَّ حَكْمَ بَيْنِ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانٌ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6739]

ترجمہ: ”کوئی ثالث دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ اس وقت نہ کرے جب وہ غصہ میں ہو۔“ بلکہ اس وقت مقدمہ ملتوی کر دے اور تاریخ بڑھا دے۔ یہاں حاکم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی دو آدمیوں پر حکومت ہو۔ اس میں معلم استاد اور گھر کا مالک بھی شامل ہے۔ لہذا غصہ کی حالت میں بچوں یا دیگر ماتحتوں اور کمزوروں کو کسی جرم میں بھی سزا دینے میں جلدی نہ کریں۔ بلکہ غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جائے اور یاد رکھیں کہ جس حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہو گا۔ یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ:

”الَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ بَيْعٍ طَيِّبٍ نَفْسٍ فَأَنَا حَاجِبُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ [سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 3054]

ترجمہ: ”سنو! جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اس کا کوئی حق چھینا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی مرضی کے لے لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے وکیل ہوں گا۔“ لہذا سزا دیتے وقت احتیاط لازمی ہے اور اگر طبعی طور پر غصہ زیادہ ہو اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو جس پر غصہ کیا جائے۔ غصہ ختم ہو جانے کے بعد مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں، پاؤں پکڑیں، بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھ لیں، ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آجائے گی۔ قول یا فعل میں ہر گز جلدی نہ کریں۔ تنکف اس تقاضے کی مخالفت کریں۔ جب کوتاہی ہو جائے تو استغفار کریں اور اگر کسی شخص کے حق میں زیادتی و حدودِ شرعیہ سے تجاوز ہو گیا ہو تو اس سے معاف کرائیں۔ زبان سے ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھیں۔ اگر کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں اور اگر بیٹھے ہوں تو لیٹ جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کریں، یا ٹھنڈا پانی پی لیں۔ فوراً کسی ایسے جائز کام میں لگ جائیں جو دل کو جلدی مشغول کرے۔ مثلاً مطالعہ کتب میں مصروف ہو جائیں۔ اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو اس شخص سے علیحدہ ہو جائیں یا اس کو علیحدہ کر دیں، جیسا موقع ہو۔

◆ غصہ کا علاج

یہ یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر زیادہ قدرت ہے اور میں اس کی نافرمانی بھی کرتا ہوں۔ اگر وہ بھی مجھ سے یہ معاملہ کرے تو کیا ہو اور یہ سوچیں کہ خدا کے ارادہ کے بغیر کچھ واقع نہیں ہوتا، سو میں کیا چیز ہوں کہ مشیتِ الہی سے مزاحمت کروں۔ اگر اس وقت میں صبر کروں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس پر اجر دے گا۔ میں کیوں اجر کے اس موقع کو ضائع کر دوں اور یہ حقیقت ہے کہ جس کو جلدی جلدی غصہ آتا ہو اور وہ اس پر قابو پانے پر قادر ہو جائے تو اس کے لیے یہ اجر اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لیے ہزار ہا نوافل پڑھنے کے اجر سے زیادہ نافع ہو گا۔ بس تھوڑی سی فکر اور سمجھ کی ضرورت ہے۔

1.1.1.4... جھوٹ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ [الحج: 30]

ترجمہ: ”اور جھوٹ بات سے بچ کر رہو۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّهُ مَعَ الْبِرِّ، وَهُمَا فِي الْحَبَّةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّهُ مَعَ الْفُجُورِ وَهُمَا فِي النَّارِ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 5]

ترجمہ: ”تم اپنے لیے سچائی کو لازم کرو کیونکہ سچائی نیکی کی ساتھی ہے اور یہ دونوں جنت میں ہوں گی اور تم جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹ برائی کا ساتھی ہے اور یہ دونوں جہنم میں ہوں گی۔“

◆ جھوٹ کی حقیقت

خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ ہے۔ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے اسے بیان کر دے، بلا تحقیق بات کو نقل کر دے۔

◆ تشریح

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ بولنے سے بچو کہ جھوٹ اور فجور ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں جہنم میں ہیں اور فرمایا: ”عَدَلْتُ شَهَادَةَ الزُّورِ بِالْإِشْرَاقِ بِاللَّهِ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ“ [ابوداؤد، حدیث نمبر: 3599]

ترجمہ: ”جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔ یہ جملہ آپ ﷺ نے تین بار دہرایا“

نیز بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص تو بیٹھا ہوا ہے اور ایک شخص کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں (امام بخاری نے کہا کہ ہمارے بعض اصحاب نے غالباً عباس بن فضیل اسقاطی نے موسیٰ بن اسماعیل سے یوں روایت کیا ہے) لوہے کا آنکس تھا جسے وہ بیٹھنے والے کے جبرے میں ڈال کر اس کے سر کے پیچھے تک بچر دیتا پھر دوسرے جبرے کے ساتھ بھی اسی طرح کرتا تھا۔ اس دوران میں اس کا پہلا جبرہ صحیح اور اپنی اصلی حالت پر آجاتا اور پھر پہلے کی طرح

وہ اسے دوبارہ پھیرتا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بعد میں انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹا آدمی تھا جو جھوٹی باتیں بیان کیا کرتا تھا۔ اس سے وہ جھوٹی باتیں دوسرے لوگ سنتے۔ اس طرح ایک جھوٹی بات دور دور تک پھیل جایا کرتی تھی۔ اسے قیامت تک یہی عذاب ہوتا رہے گا۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 1386]

◆ جھوٹ کا علاج

کلام میں احتیاط ہو، بے سوچے کوئی کلام نہ کرے۔ استحضار قبل از وقت، ہمت در عین وقت، تدارک بعد الوقت، اس کا علاج ہے یعنی وقت پر اس کا استحضار ہو کہ میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔ اس کے لیے کوئی نشانی مقرر کرے، مثلاً کوئی چیز ہاتھ کے ساتھ باندھ لے جس سے یاد آئے کہ جھوٹ نہیں بولنا اور اگر جھوٹ بولنا شروع ہو اچا ہتا ہو تو ہمت کر کے اس سے رکے۔ اگر ہو جائے تو اپنے دوستوں کو بتائے کہ میری فلاں بات جھوٹی ہے اور اپنے نفس پر کچھ جرمانہ کرے۔ اگر نفس کو نفلوں سے زیادہ تکلیف ہو تو نفل پڑھے اور اگر پیسے کے ساتھ محبت ہو تو کچھ خیرات کر دے۔ اگر کوئی بات کبھی منہ سے خلاف شریعت نکل جائے تو فوراً خوب توبہ بھی کر لے کہ جھوٹ بولنا اللہ تعالیٰ کا حق بھی ضائع کرنا ہے۔

1.1.1.5... غیبت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ [الحجرات: 12]

ترجمہ: ”اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔“

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے: ”الْغَيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا“ [مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 4875]

ترجمہ: ”غیبت زنا سے بھی سخت تر ہے۔“ کیونکہ غیبت گناہ جاہلی ہے یعنی غیبت جاہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد ندامت نہیں ہوتی بلکہ انسان فخر کرتا ہے اور زنا پر ندامت ہوتی ہے۔ اس پر کوئی فخر نہیں کرتا۔ اس لیے غیبت زنا سے بدتر ہوتی ہے۔

◆ حقیقتِ غیبت

کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی بات کرنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار ہو، اگرچہ وہ بات اس کے اندر موجود ہی ہو اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو وہ بہتان ہے۔

◆ تشریح

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَنْ اغْتَيْبَ عِنْدَهُ اُخُوهُ الْمُسْلِمَ وَهُوَ يَسْتَطِيعُ نَصْرَهُ فَتَصْرَهُ، نَصْرَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، فَاِنْ اسْتَطَاعَ نَصْرَهُ فَلَمْ يَنْصُرْهُ اَدْرَكَهُ اللهُ بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ [الجامع فی الحدیث لابن وہب، حدیث نمبر: 424]

ترجمہ: ”جس کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہوتی ہو اور وہ اس کی حمایت پر قادر ہو اور اس کی حمایت کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی حمایت فرمائیں گے اور اگر اس کی حمایت پر قادر ہوتے ہوئے اس کی حمایت نہ کی تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر گرفت فرمائیں گے۔“

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”اِنَّ اَحَدَكُمْ مَرَاةٌ لَا خِيَةَ، فَاِذَا رَاى بِهَا شَيْئًا، فَلْيَمِطْهُ عَنْهُ“ [شرح السنن للبخاری، حدیث نمبر: 3513]

ترجمہ: ”تم میں سے ہر شخص اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے پس اگر اس میں کوئی گندی بات دیکھے تو اسے اس سے دور کر دے۔“ یعنی جس طرح آئینہ چہرہ کے داغ دھبے کو صرف عیب والے پر ظاہر کرتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا، اسی طرح اس شخص کو چاہیے کہ اپنے بھائی کی خفیہ طور پر اصلاح کر دے، اس کو سوانہ کرے۔ زبان اور کان کے گناہوں میں غیبت کرنا اور سننا ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ شاید ہی کوئی طبقہ اس سے بچا ہوا ہو، اَلَا مَا شَاءَ اللهُ۔

اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام کرنا چاہیے اور اگر غیبت ہو جائے تو جس کی غیبت کی ہے اس کو علم بھی ہو جائے تو اس سے معافی مانگنا ضروری ہے اور اگر اس کو علم نہ ہو تو کثرت سے استغفار کرے اور جس کی غیبت کی ہے اس کے لیے دعائے مغفرت کرے۔

◆ غیبت کا علاج

بات کرنے سے قبل تھوڑی دیر تامل کرے اور سوچے کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ جو سمیع و بصیر ہیں ناخوش تو نہیں ہوں گے؟ اِنْ شَاءَ اللهُ کوئی بات منہ سے گناہ کی نہ نکلے

گی۔ غیبت صرف زبان کو ہی تو کثروں کرنا ہے۔ پس اگر ذرا سی ہمت سے انسان اتنے بڑے گناہ سے بچ سکے تو ہمت کیوں نہ کی جائے؟ اس کو سوچے اور ہمت سے کام لے کر غیبت سے رکے۔ یہ سوچے کہ جس کی میں غیبت کر رہا ہوں اس کو اپنی نیکیاں دے رہا ہوں، گویا میں اس شخص کو فائدہ پہنچا رہا ہوں جو مجھے پسند نہیں ہے۔ جب بھی کسی کی غیبت کرنے کو جی چاہے تو فوراً اس کے لیے دعا کرے کہ یا اللہ! تو اس پر قادر ہے کہ اس شخص سے ان عیوب کو دور کر سکتا ہے۔ اس لیے اس سے ان عیوب کو دور فرما اور مجھے غیبت سے بچا۔ اس پر ہمت کے ساتھ چند روز بھی عمل ہو تو شیطان کسی کی غیبت کا خیال ہی نہ آنے دے گا۔

1.1.1.6... حسد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ”وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدًا“ [العلق: 5] یعنی تم کہو: میں حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے، پناہ مانگتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لَا تَحَاسَدُوا“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر 6695] یعنی آپس میں حسد نہ کرو۔

◆ حقیقتِ حسد

کسی شخص کی اچھی حالت کا ناگوار گزرنا اور یہ آرزو کرنا کہ اس کی یہ اچھی حالت زائل ہو جائے۔ یہ حسد ہے۔

◆ تشریح

حسد کے ساتھ تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ایک کیفیتِ انسانیہ ہے۔ جس میں انسان معذور ہے۔ ایک اس کے مقتضایہ پر عمل ہے۔ اس میں انسان مازور یعنی گنہگار ہے۔ ایک اس کے مقتضایہ کی مخالفت ہے۔ اس میں انسان ماجور ہے یعنی ثواب پانے والا ہے۔ حسد کا باعث عموماً تکبر و غرور ہوتا ہے یا خبیثِ باطن اور نیچ پن کہ بلا وجہ خدا تعالیٰ کی نعمت میں بخل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح میں کسی کو کچھ نہیں دیتا حق تعالیٰ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے۔ البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھ کر حرص کرنا اور یہ چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی نعمت حاصل ہو جائے۔

یہ غبطہ اور رشک کہلاتا ہے اور غبطہ شرعاً جائز ہے۔ حسد قلبی مرض ہے اس میں دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ ایسے شخص کے کیے ہوئے نیک اعمال ساقط ہو جاتے ہیں۔ نیکیاں چلی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ کے غصے کا نشان بن جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”الْحَسَدُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ، كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْحَطِيبَةَ، كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَالصَّلَاةُ نُورُ الْمُؤْمِنِ، وَالصِّيَامُ جُذَّةٌ مِنَ النَّارِ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 4210]

ترجمہ: ”حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو اور صدقہ و خیرات گناہوں کو اسی طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو، نماز مومن کا نور ہے اور روزہ آگ سے ڈھال ہے۔“

اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہے اور اسی غم میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو زلت و افلاس میں مبتلا دیکھے۔ اسی طرح عذابِ آخرت میں بھی اپنے سر کو رکھا اور اپنی قناعت و آرام کی زندگی رخصت کر کے ہر وقت کی خُلاش اور دنیوی کوفت خریدی۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں

رنجِ حسد ہے جان ہے جب تک کہ جان میں

◆ حسد کا علاج

گو بتکلف سہی اس شخص کی خوب تعریف کیا کرے اور اس کے ساتھ خوب احسان و سلوک و تواضع سے پیش آئے اور اپنے آپ کو یہ سمجھائے کہ اے ظالم یہ نعمت فلاں کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اگر اللہ تعالیٰ تجھ سے پوچھے کہ میرے کام پر اعتراض کیوں کیا؟ تو میں کیا جواب دوں گا۔ ایسے لوگوں کے لیے جن کے ساتھ حسد ہو ان کے لیے بتکلف مزید نعمتوں کی دعا کرنا کرنا چاہیے اور ساتھ یہ دعا بھی کرے کہ یہ نعمتیں (اگر جائز ہوں) مجھے بھی عنایت فرمائی جائیں۔

1.1.1.7... بخل

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَن نَّفْسِهِ﴾ [محمد: 38]

ترجمہ: ”اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے وہ خود اپنے آپ سے ہی بخل کرتا ہے“
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِّنَ اللَّهِ بَعِيدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِيدٌ“

[سنن ترمذی، حدیث نمبر: 1961]

ترجمہ: ”کنجوس اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔ جنت سے دور ہے۔ لوگوں سے دور ہے۔
دوزخ کے قریب ہے۔“

◆ حقیقتِ بخل

جس چیز کا خرچ کرنا شرعاً یا مروتاً ضروری ہو، اس میں تنگ دلی کرنا بخل ہے۔

◆ بخل اور شُخ میں فرق

شُخ اور بخل میں یہ فرق ہے کہ کسی چیز کی شدید حرص کرنا، اس کی طلب میں نہایت کوشش و مبالغہ کرنا، اسے حاصل کرنے میں انتہائی قوت صرف کر دینا اور ٹوٹ مرنا شُخ کہلاتا ہے اور کوئی چیز حاصل ہو جانے پر خرچ نہ کرنا، اس سے محبت رکھنا اور بند رکھنا بخل کہلاتا ہے۔ چنانچہ بخیل مال حاصل ہونے سے پہلے شُخ والا ہوتا ہے اور حصول کے بعد بخیل۔ لہذا بخل، شُخ کا ثمرہ ہے اور شُخ سے ہی بخل پیدا ہوتا ہے۔ جو طبیعت میں چھپا ہوتا ہے۔ لہذا جس نے بخل کیا اس نے شُخ کی اطاعت کی اور جس نے بخل نہ کیا اس نے شُخ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس کو اس کے شر سے بچا لیا اور یہی شخص فلاح یاب ہے۔ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُؤْفِكْ شُخَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [الحشر: 9، التائبین: 16]

ترجمہ: ”اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح

پانے والے ہیں“

◆ تشریح

بخل کے دو درجے ہیں۔ ایک شریعت کے تقاضے کی مخالفت ہے اور یہ معصیت ہے۔ دوسرا موت کے تقاضے کی مخالفت ہے۔ وہ معصیت نہیں ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ فضیلت تو یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔ نیز جو ضرورتیں اتفاقیہ طور پر پیش آجائیں، ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ جس مال کے ذریعے سے آدمی اپنی آبرو کو بچائے وہ بھی صدقہ ہے۔ مثلاً کسی مال دار کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ شاعر یا ڈوم یا بیچڑا یا بہر و بیاتیری بھو کرے گا اور اگر اس کو کچھ میں دے دوں گا تو اس کا منہ بند ہو جائے گا۔ باوجود اس علم کے اگر اس کو کچھ نہ دے تو وہ شخص بخیل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر نہ کی اور بدگو کو بدگوئی کا موقع دیا۔ بخل بہت بڑا مرض ہے اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو شیخ سے بچاؤ کہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا۔ پس مسلمان کے شایان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے۔ چونکہ بخل درحقیقت مال کی محبت ہے اور مال کی محبت دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا علاقہ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبراً و قہراً آخرت کا سفر کرتا ہے۔ اس لیے اس کو خالق جلّ جلالہ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے ”مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ“ (صحیح بخاری، 6142)

ترجمہ ”جو شخص اللہ سے ملنے کو محبوب رکھتا ہے۔ اللہ بھی اس سے ملنے کو محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ سے ملنے کو پسند نہیں کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنے کو پسند نہیں کرتا۔“

◆ بخل کا علاج

مال کی محبت کو موت کی یاد کی کثرت سے دل سے نکالنا اس کا علاج ہے۔ مال کو حسنت کے لیے استعمال کرنے کی فضیلتیں سننا یعنی فضائلِ صدقات۔ اس کے لیے

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”فضائل صدقات“ کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ سخی لوگوں کے واقعات پڑھنا، تکلف لوگوں پر جائز طریقے سے خرچ کرنا، چاہے دعوت کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں اور اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنا زیادہ مفید ہے۔

1.1.1.8... ریا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يُرَآءُونَ النَّاسَ﴾ [النساء: 142]

ترجمہ: ”لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”إِنَّ يَسِيرَ الرِّيَاءِ شِرْكٌ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 3989]

ترجمہ: ”یعنی بے شک تھوڑی ریا بھی شرک ہے۔“

◆ حقیقتِ ریا

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لوگوں کی پسند اور ناپسند پر نظر ہونا ریا کی حقیقت ہے۔

◆ تشریح

ریا کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عمل خیر کے ذریعے سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو۔ یہ عبادت کے مقصود کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ عبادت سے مقصود حق تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ اب چونکہ اس مقصد میں دوسرا شریک ہو گیا یعنی مخلوق کی رضا اور حصولِ منزلت کی نیت ہے۔ لہذا اس کا نام شرکِ اصغر ہے۔ نیز آیت کریمہ ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَادِقًا﴾ [الکہف: 110]

ترجمہ: ”لہذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے۔“ اس میں مفسرین نے ﴿وَلَا يَشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ [الکہف: 110]

ترجمہ: ”اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔“ کی تفسیر ریا نہ کرنے سے فرمائی ہے۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہ تفسیر مظہری

میں اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں: ”أَمْ لَا يَرَى بِعَمَلِهِ وَلَا يَطْلُبُ عَلَى عَمَلِهِ أَجْرًا مِّنْ أَحَدٍ غَيْرِهِ تَعَالَى جَزَاءً وَلَا تَنَاءً“ یعنی اپنے عمل کو دکھاوے کے لیے نہ کرے اور نہ اپنے عمل پر خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے کسی قسم کے بدلے یا تعریف کا طلبگار ہو۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کو جزا اور سزا اور انعامات عطا فرمائے گا تو ریاکاروں کو حکم دے گا: ”إِذْهَبُوا إِلَى الَّذِينَ كُنتُمْ تُرَآءُونَ فِي الدُّنْيَا فَاَنْظُرُوا هَلْ تَجِدُونَ عِنْدَهُمْ جَزَاءً“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 23630]

ترجمہ: ”ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کے لیے دنیا میں تم دکھاوا کرتے تھے اور دیکھو کہ کیا تم ان کے پاس کوئی جزا پاتے ہو؟“ مسلم شریف کی ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”پہلے قیامت میں جس کا فیصلہ ہو گا وہ ایک شخص ہو گا جو شہید ہوا۔ جب اس کو اللہ کے پاس لائیں گے تو اللہ اپنی نعمت اس کو بتلا دے گا وہ پہچانے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تو نے اس کے لیے کیا عمل کیا ہے؟ وہ بولے گا: میں لڑا تیری راہ میں۔ یہاں تک کہ شہید ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرمادے گا: تو نے جھوٹ کہا تو لڑا تھا اس لیے کہ لوگ بہادر کہیں اور تجھے بہادر کہا گیا، پھر حکم ہو گا تو اس کو اوندھے منہ ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے اور ایک شخص ہو گا جس نے دین کا علم سیکھا اور سکھلایا اور قرآن پڑھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس لائیں گے، تو اللہ پاک اسے اپنی نعمتیں دکھلائے گا۔ وہ شخص پہچان لے گا۔ تب کہا جائے گا تو نے اس کے لیے عمل کیا ہے؟ وہ کہے گا میں نے علم پڑھا اور پڑھایا اور قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو نے اس لیے علم پڑھا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور قرآن اس لیے پڑھا تھا کہ لوگ قاری کہیں تجھے کو عالم اور قاری دنیا میں کہا گیا پھر حکم ہو گا تو اس کو منہ کے بل گھیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے اور ایک شخص ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تھا اور سب طرح کے مال دیے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں دکھلائے گا۔ وہ پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تو نے اس کے لیے کیا عمل کیے؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی راہ، مال خرچ کرنے کی، جس میں خرچ کرنا پسند کرتا تھا۔ نہیں چھوڑی تیرے واسطے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے۔ تو نے اس لیے خرچ کیا کہ لوگ سخی کہیں۔ تو تجھے لوگوں نے دنیا میں سخی کہہ دیا۔ پھر حکم ہو گا تو اس کو منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیں گے“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 5032]

مسلم شریف کی ایک حدیث قدسی میں ہے: ”قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَنَا
أَعْنَى الشِّرْكَاءِ عَنِ الشِّرْكَ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَزَكَّتْهُ
وَشِرْكُهُ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7666]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں تمام شریکوں سے بڑھ کر شرک سے بیزار
ہوں۔ جس کسی نے کوئی (دین کا) عمل کیا اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک
کیا تو میں اسے، اس کے عمل اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں“

اس ارشاد پاک کو گوش بگوش سنو اور عبرت پکڑو۔ لہذا کسی عمل میں نہ اظہار کا
قصد کریں نہ اخفا کا، اپنے کام سے کام رکھیں۔ اپنے اختیار سے ہر کام میں رضاء حق کا
قصد ہو اور اپنے اختیار سے رضاء خلق کا قصد نہ کریں۔ بلا قصد اگر رضاء خلق کا وسوسہ یا
خیال آئے تو اس کی مطلق پروا نہ کریں اور عمل سے پہلے مراقبہ و محاسبہ کرتے رہیں کہ
اس میں میرا کیا قصد ہے؟ آیا رضائے حق ہے یا رضائے خلق اور نیت کو خالص کر کے
عمل کیا کریں۔ ریا اختیاری عمل ہے اس لیے اگر کوئی اپنے اختیار سے کرتا ہے تو گنہگار
ہے اور اگر اس کو صرف ریا کا وسوسہ آتا ہے تو اس پر کوئی گرفت نہیں۔ اس کو خوب
سمجھ لیا جائے کیونکہ اس میں بہت سارے غلطی کرتے ہیں۔

ریا کا علاج

حب جاہ کو دل سے نکالیں، کیونکہ ریا اسی کا ایک شعبہ ہے اور عبادت پوشیدہ کیا
کریں، یعنی وہ عبادت جو جماعت سے نہیں ہے اور جس عبادت کا اظہار ضروری ہے
اس کے اندر ازالہ ریا کے لیے ازالہ حب جاہ کافی ہے اور معالجے کا طریق یہ ہے کہ جس
عبادت میں ریا ہو اس کو کثرت سے کریں، پھر نہ کوئی التفات کرے گا نہ اس کو یہ خیال
رہے گا۔ چند روز میں ریا سے عادت پھر عادت سے عبادت اور اخلاص بن جائے گی۔

1.1.1.9... عجب

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ﴿إِذَا عَجَبْتُمْ كَمَا كُنْتُمْ كُمْ﴾ [البقرہ: 25]

ترجمہ: ”جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تمہیں مگن کر دیا تھا“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: ”وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ: فَهَوَى مُتَّبِعٌ وَشُحُّ مُطَاعٌ وَإِعْجَابُ التَّرْوِءِ
بِنَفْسِهِ وَهِيَ أَشَدُّ هُنَّ“ [شعب الایمان للسیوطی، حدیث نمبر: 7252]

ترجمہ: ”رہے مہلکات، سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے اور بخل ہے جس کے موافق عمل کیا جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔“

◆ حقیقتِ عجب

اپنے کمال کی نسبت اپنی طرف کرنا اور اس کا خوف نہ ہونا کہ شاید سلب ہو جائے، یہ عجب ہے۔

◆ تشریح

عجب کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کی ایک چال ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز ہو کر رہے اور اس میں اس کو مزا آتا ہے۔ سو یہ عجب ہے۔ عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہو جاتا ہے اس وقت وہ اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ البتہ اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہو اور اس کے چھن جانے کا خوف بھی دل میں رکھے اور اتنا ہی سمجھے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے فلاں علم یا عمل کے سبب مجھ کو مرحمت فرمادی ہے اور وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اس کو مجھ سے لے لے۔ تو یہ خود پسندی اور عجب نہیں ہے۔ کیونکہ خود پسند شخص نعمت کا منعم حقیقی (اصل انعام کرنے والے) کی جانب منسوب کرنا ہی بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ عجب میں صرف ایک قید کم ہے یعنی اس میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنا نہیں ہے۔ صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے۔ باقی سب اجزا وہی ہیں جو تکبر کے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: ”مَنْ تَعَطَّ فِي نَفْسِهِ، أَوْ اخْتَالَ فِي مَشِيئَتِهِ لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضَبَانٌ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 5995]

ترجمہ: ”جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اترتا ہوا چلتا ہے وہ قیامت کے روز خدا تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضب ناک ہوگا“ [مسند احمد]

◇ عجب کا علاج

اس کمال کو عطاءے خداوندی سمجھے اور اس کی قدرت کو یاد کر کے ڈرے کہ شاید سلب ہو جائے۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ کمال کا اعلیٰ درجہ پیش نظر رکھ کر غور سے اپنی لغزش اور کوتاہی ظاہری و باطنی دیکھے تاکہ اپنی بزرگی اور کمال کا گمان پیدا نہ ہو۔ اس کا بھی اصل علاج اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا ہے۔ شیطان کے دل میں بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں تھی اس لیے سب کمالات کی نسبت اپنی طرف کی۔ جو عاشق ہوتا ہے وہ محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اور اس کو سب چیزوں میں اپنا محبوب نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کے لیے اپنے کمالات محبوب تک پہنچنے کا باعث ہوتے ہیں۔ جب کسی کو اپنے اندر عجب محسوس ہونے لگے تو فوراً اپنے آپ سے کہے کہ چونکہ عجب رذیلہ ہے اس کے ہوتے میں کیسے بزرگ ہو سکتا ہوں۔

1.1.1.10... خود رائی

جب کوئی شخص کسی خوبی کا سن کر اس کو اپنے میں سمجھنا شروع کرے، تو سمجھ لو کہ یہ خود رائی میں مبتلا ہے۔ یہ بھی بڑا عیب ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کی نظر اپنے عیوب سے اور دوسروں کے محاسن سے اٹھ جاتی ہے۔ وہ صرف اپنی ذات میں مگن رہتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنا رہتا ہے۔ جب بھی کسی کی کوئی خوبی سنتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی تحسین کرے، کوشش کرتا ہے کہ اس وقت اپنی کوئی واقعی یا من گھڑت خوبی سامنے لائے تاکہ لوگ دوسرے کی تعریف کی بجائے اس کی تعریف کریں۔ اللہ تعالیٰ اس بیماری سے ہر ایک کو بچائے۔ آمین۔ یہ اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا مریض اپنی اصلاح کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان محاسن کو (جن کے حاصل کرنے کا حکم ہے) اپنے میں موجود سمجھ کر اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ یہ عجب کی بھی ماں ہے۔ کیونکہ عجب میں تو انسان اپنے محاسن پر ناز کرتا ہے۔ جب کہ یہاں تو عیوب کو بھی محاسن سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دونوں سراب ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ان سے بچائے۔ آمین

◇ خوددرائی کا علاج

اس کی وجہ بھی دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کا نہ ہونا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کو چاہیے کہ جلد از جلد اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھنا جاری رکھے۔ شیخ کی صحبت میسر ہو تو وہ تو نور علی نور ہے۔ یہ مراقبہ بھی اس کے لیے مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے میرے اعمال پیش کیے جا رہے ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپائی نہیں جاسکتی، اس لیے بندہ حیران و پریشان ہے کہ اپنے اعمال میں جو عیوب ہیں۔ ان کو کیسے چھپائے۔ بس یہی بات دل کو لگے گی کہ اپنے اعمال کو انتہائی کمزور سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو اور جب تک زندہ ہے اپنی اصلاح کی فکر لگی ہو۔ اس مراقبہ سے دل کی گرہیں کھلیں گی۔ اپنے محاسن بھی عیوب نظر آئیں گے اور ان شاء اللہ حقیقی توبہ کی دولت نصیب ہو جائے گی۔

ایک دفعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے خط میں ذکر کیا کہ میں کیا کروں؟ مجھے اپنے عیوب نظر نہیں آرہے ہیں۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ اگر یہ بات ہے تو تم لا علاج ہو، یہاں سے دفع ہو جاؤ، مجھے اپنا منہ نہ دکھاؤ۔ بے وقوف ذرا یہ مراقبہ تو کرو (جو اوپر ذکر کیا گیا) پھر دیکھو تیرے اعمال کی کیا حقیقت ہے۔ اس شخص نے جب اس پر عمل کیا تو لکھا کہ حضرت میرا دماغ درست ہو گیا۔ اب مجھے کوئی عمل بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رب کے حضور پیش کروں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرا دل ایک صندوق ہے جس پر اوپر سے خوشنما کاغذ اور پھول سبجے ہوئے ہیں۔ لیکن اندر جب کھول کر دیکھا تو اس میں گوہ ہی گوہ (گوہر) ہی جما ہوا ہے۔ حضرت نے جواب میں لکھا مبارک ہو حقیقت تک رسائی ہوئی، اب ان شاء اللہ اس بول براز سے کھاد کا کام لیا جائے گا اور دل میں ایسے خوشنما پھول اور پھل لگیں گے کہ دل خوش ہو جائے گا۔ پس خوددرائی کا یہ مراقبہ مؤثر علاج ہے۔

1.1.1.11... تکبر

ارشادِ خداوندی ہے: ﴿لَا يَجِبُ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ [النحل: 23]

ترجمہ: ”وہ یقیناً گھمنڈ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبَرٍ“ [سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 4091]

ترجمہ: ”جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔“

◆ حقیقت کبر

اپنے آپ کو صفات کمال میں دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا یا دوسروں کو کسی بھی وجہ سے تحارت سے دیکھنا۔

◆ تشریح

تکبر کی قسمیں بہت ہیں جن میں سے اکثر بہت باریک اور مخفی ہیں کہ سوائے شیخ کامل کے کسی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اور اس میں علمائے ظاہر کو بھی کسی محقق کی تقلید کرنی پڑتی ہے۔ تکبر کا حاصل یہ ہے کہ کسی کمال دینی یا دنیوی میں اپنے آپ کو بااختیار خود دوسرے سے اس طرح افضل سمجھنا کہ اپنے مقابلے میں دوسرے کو حقیر سمجھے۔ گویا اس میں دو جزو ہوں گے۔ اول اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، دوم دوسرے کو اپنے سے حقیر سمجھنا۔ یہ تکبر کی حقیقت ہے جو کہ حرام اور معصیت ہے۔ تکبر کی ایک صورت اور بھی ہے کہ اس میں بجز اختیار کے سب اجزا موجود ہیں۔ یعنی بلا اختیار ان اجزا کا خیال آگیا۔ یہاں تک تو معصیت نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد اس خیال کو با اختیار خود اچھا سمجھا یا باوجود اچھا نہ سمجھنے کے با اختیار خود اس کو باقی رکھا۔ تو یہ کبر کی حقیقت ہو جائے گی اور معصیت ہوگی اور جو قید لگائی گئی ہے کہ دوسرے کو حقیر سمجھے، یہ اس لیے ہے کہ اگر وہ واقعی بڑائی چھوٹائی کا اس طرح معتقد ہو کہ دوسرے کو ذلیل نہ سمجھے، تو وہ تکبر نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک بیس برس کی عمر والا دوبرس کے بچے کو سمجھے کہ یہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ مگر اس کو حقیر نہیں سمجھتا تو یہ کبر نہیں ہے۔ الغرض جو شخص با اختیار خود اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھتا ہے جس سے اس کا نفس پھول جاتا ہے اور پھر اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ تو یہ کبر ہے۔ مثلاً دوسروں کو نظر

حقارت سے دیکھنا یا اگر کوئی سلام کرنے میں پیش قدمی نہ کرے تو اس پر غصہ ہونا، اگر کوئی تعظیم نہ کرے تو ناراض ہونا، اگر کوئی نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھانا، حق بات کے معلوم ہونے کے بعد بھی اس کو نہ ماننا اور عوام الناس کو ایسی نظر سے دیکھنا جس طرح گدھوں کو دیکھتے ہیں۔

تکبر سے اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔ یہ بہت برا مرض ہے اور تمام امراض کی جڑ ہے۔ تکبر ہی سے کفر پیدا ہوتا ہے۔ تکبر ہی سے شیطان گمراہ ہوا۔ اس لیے حدیث میں اس پر سخت وعیدیں آئیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعِظْمَةُ إِزَارِي فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ" [سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 4092]

ترجمہ: "اللہ عزوجل کا فرمان ہے: بڑائی (کبریائی) میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند، تو جو کوئی ان دونوں چیزوں میں کسی کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں ڈال دوں گا۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ. قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَتَعَلُّهُ حَسَنَةً. قَالَ: إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ" [صحیح مسلم: حدیث نمبر: 275]

ترجمہ: "جنت میں نہ جائے گا وہ شخص جس کے دل میں رتی برابر بھی غرور اور گھمنڈ ہو گا ایک شخص بولا: ہر ایک آدمی چاہتا ہے اس کا جو تا اچھا ہو اور کپڑے اچھے ہوں (اوروں سے) تو کیا یہ بھی غرور اور گھمنڈ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ جمیل ہے۔ دوست رکھتا ہے جمال کو۔ غرور گھمنڈ یہ ہے کہ انسان حق کو ناحق کرے (یعنی اپنی بات کی بیخ (حمایت، طرف داری) یا نفسانیت سے ایک بات واجب ہو اور صحیح ہو اس کو رد کرے اور نہ مانے) اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خِيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ"

يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ أَحَدَ شَقِيٍّ ثَوْبِي يَسْتَرِحِي إِلَّا أَنْ
 اتَّعَاهَدَ ذَلِكَ مِنْهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّكَ
 لَسْتَ تَصْنَعُ ذَلِكَ حَيَلَاءً“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3465]

ترجمہ: ”جو شخص تکبر کی وجہ سے تہبند گھسیٹتا ہوا چلے گا تو اللہ پاک اس کی
 طرف قیامت کے دن نظر بھی نہیں کرے گا۔“ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:
 یا رسول اللہ! میرے تہبند کا ایک حصہ کبھی لٹک جاتا ہے مگر یہ کہ خاص طور سے
 اس کا خیال رکھا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو ایسا
 تکبر سے کرتے ہیں۔“

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”إِنَّ مِنْ أَحْبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحْسِنَكُمْ أَخْلَاقًا، وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي
 مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرَثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيِّهُونَ،
 قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَدْ عَلِمْنَا الثَّرَثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ. فَمَا
 الْمُتَفَيِّهُونَ؟ قَالَ: الْمُتَكَبِّرُونَ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2018]

ترجمہ: ”میرے نزدیک تم میں سے (دنیا میں) سب سے زیادہ محبوب اور
 قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو تم میں
 بہترین اخلاق والے ہیں اور میرے نزدیک تم میں (دنیا میں) سب سے زیادہ قابل
 نفرت اور قیامت کے دن مجھ سے دور بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو الثَّرَثَارُونَ،
 الْمُتَشَدِّقُونَ اور الْمُتَفَيِّهُونَ ہیں،“ صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم
 نے الثَّرَثَارُونَ (باتونی) اور الْمُتَشَدِّقُونَ (بلا احتیاط بولنے والے) کو تو جان لیا
 لیکن ”مُتَفَيِّهُونَ“ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”تکبر کرنے والے“

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”تَحَاجَّتِ الْحَبَّةُ وَالنَّارُ فَقَالَتِ النَّارُ: أَوْثَرْتُ
 بِأَلْمَتِكَبِيرِينَ وَالْمُتَجَبِّرِينَ. وَقَالَتِ الْحَبَّةُ: فَمَا لِي لَا يَدْخُلْنِي إِلَّا ضِعْفَاءُ
 النَّاسِ وَسَقَطُهُمْ وَعِزَّتُهُمْ قَالَ اللَّهُ لِلْحَبَّةِ: إِنَّمَا آتَتْ رَحْمَتِي أَرْحَمُ

بِكْ مَنْ أَشَاءَ مِنْ عِبَادِي. وَقَالَ لِلنَّارِ: إِنَّمَا أَنْتِ عَذَابِي أُعَذِّبُ بِكَ مَنْ أَشَاءَ مِنْ عِبَادِي، وَبِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْكُمْ مِلْوَةٌ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7354]

ترجمہ: ”جنت اور دوزخ نے جھگڑا کیا۔ دوزخ نے کہا: مجھ میں بڑے بڑے زور دار مغرور لوگ آئیں گے اور جنت نے کہا: مجھ میں ناتواں مسکین لوگ آئیں گے۔ اللہ جل جلالہ نے دوزخ سے فرمایا: تو میرا عذاب ہے میں جس کو چاہوں گا تجھ سے عذاب کروں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس پر چاہوں گا تجھ سے رحم کروں گا اور تم دونوں بھری جاؤ گی۔“

◆ کبر کا علاج

اللہ تعالیٰ کی عظمت کو یاد کرے تاکہ اپنے کمالات ہیچ نظر آئیں اور جس شخص سے اپنے آپ کو بہتر سمجھتا ہے اس کے ساتھ تواضع اور تعظیم سے پیش آئے تاکہ عادی ہو جائے۔ ذہن میں بات جمادے کہ مجھے یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں اور ان کی بقا بھی اس کے حکم سے ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو یہ نعمتیں آن کی آن میں چھن سکتی ہیں۔ اگر کسی کے اعمال اپنے سے کم نظر آئیں تو یہ سوچے کہ ممکن ہے میرے اعمال اس سے زیادہ ہوں لیکن کامیابی زیادہ اعمال پر نہیں بلکہ اس کے فضل پر ہے۔ نیز جیسے آگ تمام چیزوں کو آن کی آن میں خاکستر کرتی ہے یا زہر تمام غذاؤں کے اثر کو آن واحد میں تباہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے اس طرح میرے اس تکبر سے میرے تمام اعمال ہیچ ہو جائیں اور اُس کے پاس جو تھوڑے بہت اعمال ہیں وہ اس کی عاجزی کے سبب قبول ہو جائیں۔ یا یہ نہ ہو تو آخر کا کسے پتا کہ خاتمہ کیسے ہو، ممکن ہے میں مارا جاؤں اور وہ کامیاب ہو۔

1.1.1.12... کیسے

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ”خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ“ [الأعراف: 199]

ترجمہ: ”(اے پیغمبر) درگزر کا رویہ اپناؤ اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وَلَا تَبَاغُضُوا“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4849]

ترجمہ: ”آپس میں بغض نہ رکھو۔“

◆ حقیقت کینہ

کینہ کی حقیقت یہ ہے کہ جب غصہ میں بدلہ لینے کی قوت نہیں ہوتی تو اس کے ضبط کرنے سے اس شخص کی طرف سے دل پر ایک قسم کی گرانی کا ہو جانا، جس کے سبب سے اس کو کسی تکلیف دینے کے درپے ہونا۔

◆ تشریح

کینہ صرف ایک عیب نہیں ہے بلکہ بہت سے گناہوں کا بیج ہے۔ جب غصہ نہیں نکلتا تو اس کا خمار دل میں بھر رہتا ہے اور بات بڑھتی اور رنجیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کینہ یہ ہے کہ اپنے اختیار اور قصد سے کسی کی برائی یا بدخواہی دل میں رکھی جائے اور اس کو ایذا پہنچانے کی تدبیر بھی کرے۔ اگر کسی سے رنج کی کوئی بات بھی پیش آئے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباضِ طبعی ہے جو گناہ نہیں۔ کینہ کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تَفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَّا يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اٰخِيهِ شَحْنَاءٌ فَيُقَالُ: اَنْظُرْ وَاَهْذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا اَنْظُرْ وَاَهْذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا اَنْظُرْ وَاَهْذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6709]

ترجمہ: ”جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں پیر اور جمعرات کے دن، پھر ہر ایک بندہ کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا، مگر وہ شخص جو کینہ رکھتا ہے اپنے بھائی سے اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے ان دونوں کو مہلت دو حتیٰ کہ یہ صلح کر لیں، ان دونوں کو مہلت دو حتیٰ کہ یہ صلح کر لیں، ان دونوں کو مہلت دو حتیٰ کہ یہ صلح کر لیں“ (جب مل جائیں ان کی مغفرت ہو)۔ نیز فرمایا: ان دو آدمیوں کی مغفرت نہیں ہوتی جن کے درمیان عداوت و کینہ ہو۔ یہاں پر عداوت سے مراد وہ عداوت ہے جس کا معنی ناحق امور ہوں۔ اسی لیے اگر کسی مسلمان کو کسی سے دین کے متعلق خدا تعالیٰ کے واسطے دشمنی ہو تو یہ عداوت مستحسن اور قابلِ اجر ہے۔ جیسا کہ

حدیث شریف میں امر ہے: ”اَكْحَبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ“ [سنن ابی داؤد، 4601]
ترجمہ: ”اللہ کے لیے محبت کرنا اور اللہ کے لیے بغض رکھنا۔“

◆ کینہ کا علاج

کینہ کا علاج یہ ہے کہ جس شخص سے کینہ ہو اس شخص کا قصور معاف کر دینا اور اس سے میل جول شروع کر دینا، گو تکلف ہی ہو۔ کینہ میں چونکہ مخفی طور پر غصہ شامل ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ غصہ وقتی طور پر ہوتا ہے اور اس میں سوچ کا عنصر کم ہوتا ہے۔ جبکہ کینہ مستقبل کے لیے ہوتا ہے اور اس میں سوچ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس لیے روحانی طور پر کینہ زیادہ قابل مذمت ہے۔ سوچ کا علاج سوچ ہے اس لیے اپنے آپ کو رب کا قصور وار سمجھ کر یہ سوچا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ حساب کیا تو میں کیسے بچ سکتا ہوں؟ پس مجھے بھی اس کی مخلوق کو معاف کرنا چاہیے تاکہ وہ میرے اوپر رحم فرمائے۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث مبارکہ ہے: ”الَّذِي أَحْمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ، وَإِذَا أَحْمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمُهُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ، الرَّاحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّاحِمِينَ، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلَهُ اللَّهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعَهُ اللَّهُ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 1924]

ترجمہ: ”رحم کرنے والوں پر رحمن رحم کرتا ہے۔ تم لوگ زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔ رحم رحمن سے مشتق (نکلا) ہے۔ جس نے اس کو جوڑا اللہ اس کو (اپنی رحمت سے) جوڑے گا اور جس نے اس کو توڑا اللہ اس کو اپنی رحمت سے کاٹ دے گا۔“

1.1.2 ... جلبی اعمال (اخلاقِ حمیدہ)

اخلاقِ حمیدہ، اخلاقِ رذیلہ کی ضد ہیں۔ اس لیے جہاں رذائل کے بالمقابل ضد والے اخلاقِ حمیدہ حاصل کرنے ہوں تو اس رذیلے کی اصلاح ہی اس کے بالمقابل اچھے اخلاق کا حصول ہے۔ مثلاً اخلاص ریا کی ضد ہے۔ پس اگر ریا ختم ہو جائے تو اخلاص حاصل ہو جائے گا۔

اب اخلاقِ حمیدہ کی تفصیل دی جاتی ہے اور ان کے حصول کا فوری طریقہ بھی۔ کیونکہ یہ بھی حقیقی معنوں میں تب حاصل ہوتے ہیں جب فنا اور بقا کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور عبدیتِ تامہ سالک کا خاصہ بن جاتی ہے۔

1.1.2.1... توحید

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ [الصافات: 96] ترجمہ: ”حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم بناتے ہو اس کو بھی“ نیز ارشاد ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ [التکویر: 29] ترجمہ: ”اور تم چاہو گے نہیں۔ الا یہ کہ خود اللہ چاہے“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وَأَعْلَمَ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَىٰ أَنْ يَنْفَعُوكَ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَ اللَّهُ لَكَ وَلَوْ اجْتَمَعُوا عَلَىٰ أَنْ يَضُرُّوكَ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْكَ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2516] ترجمہ: ”جان لو کہ اگر سب متفق ہو جائیں اس پر کہ تجھ کو کچھ نفع پہنچادیں، ہر گز نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اس چیز کا جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اور اگر سب متفق ہو جائیں کہ تم کو نقصان پہنچائیں ہر گز نقصان نہ پہنچا سکیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔“

◆ توحید کیا ہے؟

یہ یقین کر لینا کہ خدا کے ارادے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، توحید کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ خدا کے بغیر کوئی دوسرا موجود نہیں۔ جیسا کہ جو لوگ وحدت الوجود کا دعویٰ کرنے والے کہتے ہیں۔ کیونکہ خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک صفت خلق بھی ہے اور خالق کوئی تب ہی ہو سکتا ہے جب اس نے مخلوق تخلیق کی ہو۔ اس لیے مخلوق کی موجودگی ماننا خالق کا ماننا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایسا ادراک کسی کو ہو جائے کہ مخلوق کی موجودگی اس کو محسوس ہی نہ ہو، جیسے سورج کی موجودگی میں ستارے نظر نہیں آتے، لیکن یہ جانتا ہے کہ

ستارے بھی موجود ہیں۔ اسی کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

توحید کو توہینِ مقررین میں بدلنا ٹھیک نہیں ہے۔ توحید کے مقابلے میں شرک ہے جس کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتے۔ اس لیے توحید کا حاصل کرنا اور شرک سے بچنا سب کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جن مقررین کو عزت عطا فرمائی ہے چاہے وہ انبیاء علیہم السلام ہوں یا امتی، ہر دو صورتوں میں توحید کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کی توہین کی جائے۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہے تو اس سے بچنا بہت ضروری ہے ورنہ بے ادبی کے جرم میں سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین کے بارے میں بہت غیور ہے اس لیے جو ان کی شان میں بے ادبی کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں وہ مردود ہو جاتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال ضائع ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

﴿لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ [الحجرات: 2]

ترجمہ: ”اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کیا کرو“ اس آیت مبارکہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔ نیز حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اَذْنَبُ بِاِحْرَابٍ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6137]

ترجمہ: ”جو میرے کسی ولی کو تکلیف پہنچاتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے“ پس نہ تو شرک میں مبتلا ہونا چاہیے کہ یہ جرم ناقابلِ معافی ہے اور نہ بے ادبی کا مرتکب کہ اس کا انجام بھی تباہی ہے۔ توحید کا مطلب مقررین کی بے ادبی نہیں ہے اور ادب کو شرک نہیں بنانا چاہیے۔

◆ توحید حاصل کرنے کا طریقہ

مخلوق کے عجز اور خالق کی قدرت کو یاد رکھنا اور سوچنا۔ سورہ فاتحہ میں اس کا بہترین علاج موجود ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں شرک سے بچنے کا انتظام ہے اور ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں بے ادبی سے بچنے کا انتظام ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنا ہدایت ہے اور ان دونوں میں سے کسی سے اعراضِ غضبِ الہی کو دعوت دینا اور گمراہی ہے۔ ان آیات مبارکہ کی تلاوت کے دوران ان کا مفہوم ذہن

میں رکھنا اور صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی زندگی کا مطالعہ بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔

2.2.1.1... اخلاص

اخلاص توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو بھی صحیح معنوں میں موحد ہو گا وہ مخلص بھی ہو گا۔ کیونکہ خدا کو ہم سے اخلاص مطلوب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ﴾ [البینہ: 5]

ترجمہ: ”اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اسی کے لیے خاص رکھیں اور جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6708]

ترجمہ: ”حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور اموال کی طرف نظر نہیں فرماتے بلکہ تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں“

◆ اخلاص کیا ہے؟

اپنی اطاعت میں صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کا ارادہ کرنا اور مخلوق کی خوشنودی اور رضامندی، یا اپنی کسی باہی و مالی و جاہی خواہش کے ارادے سے اپنے آپ کو بچانا اخلاص کہلاتا ہے۔ یہ ریاکی ضد ہے۔ اس لیے ریاکا ہونا اخلاص کی غیر موجودگی کی ہی دلیل ہے۔ البتہ ایک بات کی تحقیق اس میں ضروری ہے کہ جیسے اعداد منفی، صفر اور مثبت ہوتے ہیں۔ اس لیے منفی نہ ہونا ہر وقت مثبت ہونے کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ صفر بھی ہو سکتا ہے جو نہ منفی ہے نہ مثبت۔ مثلاً اسی مثال میں ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی کوئی کام نہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اور نہ کسی مخلوق کے لیے، بس صرف اس سے اپنی کوئی ذاتی منفعت وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ریا تو نہیں ہے کہ اس کو گناہ ہو، البتہ اُس کو اس عمل کا آخرت میں کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی داڑھی اس لیے رکھے کہ اُس سے وہ خوبصورت لگتا ہے۔ تو وہ خوبصورت تو لگے گا اور داڑھی نہ رکھنے کے گناہ سے بھی بچے گا۔ لیکن اس کو سنت کا ثواب نہیں ملے گا۔ کیونکہ

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 1] اس حدیث کے مطابق ہر عمل کا دار و مدار اس کی نیت پر ہے۔

اگر مخلوق کی رضا یا خوشنودی کے لیے کوئی دینی کام کیا جائے گا تو وہ ریا ہے۔ اس سے بچنا فرض ہے ورنہ وہی عمل جہنم میں لے جاسکتا ہے جیسا کہ عالم، سخی اور شہید والی حدیث میں ہے۔

اخلاص حاصل کرنے کا طریقہ

اخلاص ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لیے اپنی نیت کو درست کرنے سے یہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ریا کے باب کو تفصیل سے پڑھ کر اس سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کسی شیخِ کامل کی اتباع سے ہی ریا کا سدّ باب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت مخفی طریقے سے داخل ہوتی ہے۔ مخلصین کی صحبت کا التزام کرنا چاہیے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ [الکہف: 28]

ترجمہ: "اور اپنے آپ کو استقامت سے ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو اس لیے پکارتے ہیں کہ وہ اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں" اس آیت مبارکہ میں مخلصین کے ساتھ بیٹھنے کا امر ہے اور دنیا داروں کے پاس بیٹھنے کی ممانعت ہے۔

◆ اخلاص کے فائدے

چاہے کیسا ہی نیک کام ہو، بڑا ہو یا چھوٹا مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے۔ چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو۔ جس قدر اخلاص زیادہ ہو گا اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لَا تَسْبُوْا أَصْحَابِيْ لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا أَدْرَكَ مُدًّا أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَةً" [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3470]

ترجمہ: "میرے اصحاب کو برا بھلا مت کہو۔ اگر کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا (اللہ کی راہ میں) خرچ کر ڈالے تو ان کے ایک مد غلہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے آدھے مد کے برابر۔" دراصل ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر زیادہ تھی کہ اوروں کے اندر اتنی محبت نہیں تھی۔ اسی لیے ان حضرات کے صدقات

و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاص کا اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ محض خدا کے لیے کام کرے، مخلوق کا اس میں تعلق ہی نہ ہو۔ اس سے کم یہ ہے کہ مخلوق کو راضی کرنے کے لیے کام کرے مگر کوئی ذنیوی غرض مطلوب نہ ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کچھ نیت نہ ہو، نہ دنیا ہو نہ دین۔ یوں ہی خالی الذہن ہو کر کام کر لیا۔ یہ بھی اخلاص (یعنی ریا کا نہ ہونا) ہے۔

◆ ایک قابل توجہ بات

یہاں اس ضمن میں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صرف اخلاص پر بخشش نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے ساتھ حضور ﷺ کے طریقے پر عمل بھی ہو۔ کوئی شخص چاہے کتنے ہی اخلاص کے ساتھ نماز میں ایک رکعت میں تین سجدے کر لے، اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے حضور ﷺ کے طریقے پر نماز نہیں پڑھی۔ یہیں سے بدعت اور سنت میں فرق بھی سمجھنا چاہیے۔ اہل بدعت بدعت کو دین سمجھ کر کرتے ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ کر رہے ہوں، لیکن بدعت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ”كُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2042]

ترجمہ: ”ہر بدعت گمراہی ہے“ پس آپ ﷺ کا طریقہ سیکھنا اور اس کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل کرنا لازمی ہے۔ ان دو میں سے کوئی ایک چیز بھی رہ گئی تو تباہی کا اندیشہ ہے۔ اس لیے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے عمل کا علمی اور قلبی جائزہ لیتے رہیں کہ کہیں کوئی بات آپ ﷺ کے طریقے کے خلاف تو نہیں ہو رہی ہے؟ یا طریقہ تو آپ ﷺ کا ہو لیکن کہیں نیت میں کھوٹ تو نہیں آیا! اپنا احتساب روزانہ کرنا چاہیے اور اس کی فکر کرنی چاہیے۔

البتہ اس میں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو مخلصین ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سمجھنے کا راستہ بنا ہی دیتا ہے۔ جس سے ان کے اخلاص کا بھی امتحان ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی مخلص شخص بدعات یا جہالت کی کسی بات میں مبتلا ہو، تو فوراً اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ احسن طریقے سے اس پر حضور ﷺ کا طریقہ پیش کرنا چاہیے۔ اگر وہ مخلص ہو گا تو وہ اس کو ضرور اپنالے گا۔ اس سے اس حدیث شریف کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ ہماری صورتوں اور مال کو نہیں دیکھتے، بلکہ ہماری نیتوں

اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔ پس اگر صرف نیت کافی ہوتی تو اعمال کلہاں تذکرہ نہ ہوتا۔ اس لیے نیت کا درست ہونا اور عمل کا صحیح ہونا دونوں لازمی قرار پائے۔ اخلاص نہ صرف قبولیت کے لیے ضروری ہے بلکہ ثواب کے درجات و مراتب بھی اخلاص کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہر انسان عمل کرتا ہے۔ جن کے اعمال درست ہیں ان کے اجر میں فرق ان کے اخلاص میں فرق کی وجہ سے ہو گا۔ جس کے عمل میں اخلاص زیادہ ہو گا وہ زیادہ اجر کا مستحق ہو گا۔

1.1.2.3... توبہ

ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کی بندگی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس فرض میں جب کوتاہی ہو جائے اور شیطان کے اغوا سے یا نفس کی شرارت سے آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اللہ تعالیٰ سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا، یہ بندہ اب بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے گڑ گڑائے، اپنی خطا کا اعتراف کرے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر کے اپنا قصور معاف کرائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ [التحریم: 8]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ“ [صحیح مسلم حدیث نمبر: 7034]

ترجمہ: ”اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو کیونکہ میں دن میں سو دفعہ توبہ کرتا ہوں“

◆ توبہ کی حقیقت

خطا کو یاد کر کے اس پر نادم ہونا۔ اس گناہ کو ترک کر دینا اور آئندہ کے لیے پختہ ارادہ کرنا کہ اب نہ کروں گا اور خواہش کے وقت نفس کو روکنا توبہ کہلاتی ہے۔

◆ تشریح

توبہ کے معنی رجوع کرنے اور بعد سے قرب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں۔ مگر اس کے لیے بھی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ ابتدا تو یہ ہے کہ قلب پر نور معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو مضمون کی آگاہی حاصل ہو جائے کہ گناہ سُمِّ قَاتِل ہے

اور تباہ کر دینے والی شے ہے اور پھر خوف و ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کے لیے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کرے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گزشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے جب ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا یہ ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔

◆ ضرورتِ توبہ

توبہ کے معنی اور حقیقت سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ [التحریم: 8]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو“ چونکہ توبہ کی حقیقت یہی ہے کہ گناہوں کو اخروی زندگی کے لیے سُمّ قاتل اور مہلک سمجھے اور ان کے چھوڑنے کا عزم کر لے اور اتنا مضمون ایمان کا جز ہے اس لیے ہر مومن پر اس کا واجب اور ضروری ہونا تو ظاہر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَن تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ﴾ [المائدہ: 39]

ترجمہ: ”پھر جو شخص اپنی ظالمانہ کاروائی سے توبہ کر لے اور معاملات درست کر لے، تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا“

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قاعدہ شریعت کے موافق اپنی اس زیادتی یعنی گناہ کرنے کے بعد توبہ کرے اور آئندہ کے لیے اعمال کی درستی رکھے، یعنی تمام برائیوں کو چھوڑ دے، شریعت کے مطابق کام کرے اور اپنی توبہ پر قائم رہے۔ تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کے حال پر رحم کے ساتھ توجہ فرمائیں گے کہ توبہ سے پچھلے گناہ معاف فرمادیں گے اور توبہ پر استقامت عطا فرما کر مزید اعانت فرمادیں گے۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ”يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ

مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ فِيكَ وَلَا أَبَايَ، يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ
بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ، وَلَا أَبَايَ، يَا ابْنَ
آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقَيْتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا
لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3540]

ترجمہ: ”اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے
اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا میں تجھے بخشا رہوں گا۔ چاہے تیرے گناہ کسی
بھی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں۔ مجھے کسی بات کی پروا و ڈر نہیں ہے۔ اے آدم کے
بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرنے لگے
تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کسی بات کی پروا نہ ہوگی۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو
زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے (مغفرت طلب کرنے کے لیے) ملے لیکن
میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت
لے کر آؤں گا اور تجھے بخش دوں گا۔“ نیز دوسری حدیث میں ہے: ”الَّذِينَ يَمُنُونَ
لَا ذَنْبَ لَكُمْ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 4250]

ترجمہ: ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ شخص جس نے کوئی گناہ کیا ہی
نہ ہو“ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وَاللَّهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي
الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 5948]

ترجمہ: ”اللہ کی قسم! میں دن میں ستر سے زائد مرتبہ اللہ سے استغفار اور توبہ
کرتا ہوں“ عصمتِ انبیاء یعنی انبیاء کا گناہوں سے پاک ہونا، ایک مسلم مسئلہ ہے۔ پھر بھی
آپ ﷺ استغفار فرما رہے ہیں۔ یہ انبیاء اور اکابرین کی حالت ہے۔ تو پھر ہم کس شمار
میں ہیں۔ اس کی پروا نہ کریں کہ توبہ ٹوٹ جائے گی۔ جب توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ
کر لے۔ مگر شرط یہ ہے کہ توبہ دل سے ہو یعنی توبہ کے وقت یہ عزم پختہ ہو کہ اب یہ
گناہ نہیں کروں گا۔ اس طرح توبہ کر کے اگر سو مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے تو کچھ پروا نہیں۔
ہر دفعہ پھر توبہ کرتے رہیں۔ خدا تعالیٰ کے مقبول اور اہل طاعت میں شمار ہونگے۔

باز آ اے بندے میرے باز آ
شکر و کفر و ہر گناہ سے باز آ

میرے در پر کوئی مایوسی نہیں
بار بار توبہ بھی توڑے باز آ

حق تعالیٰ کی وسعتِ رحمت ہے کہ ہر حالت میں اجازت دے دی کہ ہم سے باتیں
کر لو ہمارا نام لے لو، ہر حالت میں سماعت ہوگی۔

◆ توبہ کا طریقہ

گذشتہ گناہوں پر ندامت اور معذرت ظاہر کرے۔ جو حقوق العباد واجب الادا
ہیں فی الحال ان کے ادا کرنے کا عزم کرے اور پھر ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے یا اہل
حقوق سے معاف کرائے۔ اگر پھر گناہ صادر ہو جائے تو فوراً دو رکعت نماز توبہ کی نیت
سے پڑھ کر پھر توبہ کرے۔ زبان سے بھی توبہ کرے اور رونے کی شکل بنا کر خدا تعالیٰ
سے خوب معافی مانگے۔ توبہ کے لیے تو گناہوں کو یاد کرے اور اس کے بعد جی بھر کے
توبہ کرے، مگر ان کو بلا وجہ بار بار یاد نہ کرے کہ اس سے بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان
ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ جو محبت اور ترقی سے مانع ہے۔ جس کا اثر یہ ہو گا کہ
وہاں سے بھی عطا میں کمی ہوگی۔ کیونکہ جزا اور ثمرات کا ترتیب عمل پر ہوتا ہے۔ سچی
توبہ کے بعد اگر از خود پرانے گناہ یاد آجائیں تو پھر تجدید توبہ کر کے کام میں لگ جائے
اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔ نیز استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکرے اور
استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری
فہرست پڑھنے بیٹھ جائے۔ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کر لے۔ ہر گناہ
کا نام لینا ضروری نہیں۔

حدیث میں ہے: ”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا
أَعْلَنْتُ وَمَا آتَتْ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 7076]

ترجمہ: ”اے اللہ! میرے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے اور وہ تمام گناہ جنہیں

میں نے چھپ کر اور کھلم کھلا کیا ہو اور اس گناہ کو جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ بخش دے، اس میں سب گناہ آگئے اگرچہ یاد نہ آئیں، کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعہِ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو از خود یاد آجائیں ان سے بالخصوص توبہ کریں، خواہ مخواہ کرید کرید کر تلاش کرنا، یہ خود ایک ایسا مشغلہ ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بس سب گناہوں سے توبہ کر کے اپنے کاموں میں لگ جائیں کیونکہ مقصود بالذات خدا تعالیٰ کی یاد ہے۔ نہ کہ گناہوں کی یاد اور نہ ہی طاعت کی یاد مقصود ہے۔ گناہوں کی یاد سے توبہ مقصود ہے جب وہ حاصل ہے تو پھر قصداً گناہ کو یاد کر کے اس کی یاد کو مقصود بالذات نہ بنائیں اور اگر یاد آجائے تو پھر توبہ و استغفار کر لیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ مصیبت خود بخود یاد آجائے تو ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھ لیں کہ ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2165]

اس وقت ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھنے کا وہی ثواب ہوگا جو عین مصیبت کے وقت پڑھنے کا ثواب تھا۔ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مصیبت کی یاد کو مقصود بالذات نہ بنائیں، کیونکہ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں اور یہ خیال خطرناک ہے۔

◆ توبہ کا محرک

قرآن و حدیث میں جو وعید گناہوں پر آئی ہے ان کو یاد کرے اور سوچے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے گناہوں کا حساب دینا ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے ہمارے اوپر جو احسانات ہیں اور اللہ تعالیٰ جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کو یاد کر کے سوچے کہ ہم کتنے کمینے ہیں کہ ایسے رب کو ناراض کرتے ہیں جو ہمیں ہمارے فائدے کے لیے گناہوں سے روکتا ہے اور ہم ہر حالت میں اس کے محتاج ہیں اور اپنے دشمن جس نے ہماری دشمنی میں اپنا سب کچھ کھویا ہے یعنی شیطان اس کی بات مانتے ہیں۔ اس سے گناہ پر دل میں سوزش اور ندامت پیدا ہوگی۔ یہی توبہ ہے۔

1.1.2.4... محبت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ [المائدہ: 54]

ترجمہ: ”جن سے وہ محبت کرتا ہو گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے“ نیز ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرہ: 165]

ترجمہ: ”اور جو لوگ ايمان لاپچھے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زيادہ محبت رکھتے ہیں“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6996]

ترجمہ: ”جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے“

◆ حقیقتِ محبت

طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے لذت حاصل ہو، اسے محبت کہتے ہیں۔ یہی میلان اگر قوی ہو جائے تو اس کو عشق کہتے ہیں۔

◆ تشریح

محبت کی دو قسمیں ہیں۔ محبتِ طبعی اور محبتِ عقلی۔ محبتِ طبعی اختیاری نہیں ہے۔ اس کا ہو جانا اور اسکی بقا بالکل غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری کام بعض اوقات پائیدار نہیں ہوتا۔ لہذا محبتِ طبعی مامور بہ نہیں ہے۔ جبکہ محبتِ عقلی کا حاصل کرنا اور اس کی بقا اختیاری ہے۔ اس لیے یہ پائیدار بھی ہوتی ہے۔ لہذا محبتِ عقلی مامور بہ ہے اور یہی افضل اور رائج ہے۔ چونکہ محبتِ طبعی کا منشا جوشِ طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔

◆ اسبابِ محبت

محبت کے تین سبب ہو کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ کوئی ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ نہایت حسین و جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف دل کا میلان ہو۔ تیسرا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وہ کمال باعثِ محبت ہو۔ لہذا جب تک یہ کمالات باقی ہیں اس وقت تک محبت بھی رہے گی۔

سو انعام و نوال و حسن و جمال و فضل و کمال علی وجہ الکمال خدا تعالیٰ ہی میں پائے جاتے ہیں اور محبوبِ حقیقی کے کمالات کبھی ختم نہیں ہو سکتے لہذا ان کی محبت بھی ختم نہ ہوگی۔ چونکہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی میں بھی بالذات کمالات نہیں ہیں۔ اس لیے کالمیلین کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے محبتِ عقلی نہیں ہو سکتی۔ ہاں حبِ طبعی یعنی عشقِ غیرِ خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس محبت کا امر ہے وہ حبِ عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ لہذا انصوح میں حبِ طبعی یعنی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں۔ بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حبِ طبعی مطلوب نہیں۔ بلکہ حبِ عقلی مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حبِ عقلی والوں میں (یعنی کالمیلین میں) حبِ طبعی نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حبِ عقلی کو ہوتا ہے۔ باقی جن پر حبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبتِ طبعی بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبتِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔ مگر وہاں محبتِ طبعی پر حبِ عقلی غالب ہوتی ہے۔ اس لیے جوشِ دبا رہتا ہے۔ لیکن گاہے گاہے کالمیلین پر بھی حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔

بہر حال کالمیلین حبِ طبعی اور حبِ عقلی دونوں کے جامع ہوتے ہیں۔ مگر ان میں غلبہ حبِ عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین میں حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ کمال گو مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے اور جو دونوں سے کورا ہے وہ خطرے میں ہے۔ پس محبت کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر محبت کے صرف طاعات و عبادات کافی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا بھروسا کچھ نہیں۔

خدا کی محبت کو حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف و انعامات کو یاد کرے اور سوچے۔ احکامِ شرعیہ کی بجا آوری کرے اور کثرتِ ذکر اللہ سے غیر اللہ کی محبت دل سے نکال کر اللہ کی محبت کو دل میں داخل کرے۔ اتباعِ سنت اللہ تعالیٰ کی محبت بلکہ محبوبیت کا باعث ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ [آل عمران: 31]

ترجمہ: ”(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا“ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے

ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں ان کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ اتباعِ سنت کریں تو ان کو محبوب بنا دیا جائے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ کیا میں آپ کو کامیابی کا طریقہ بتا دوں؟ لوگوں نے کہا ضرور۔ حضرت نے فرمایا کہ محبت کی پڑیا کھا لو۔ لوگوں نے پوچھا محبت کی پڑیا کہاں سے ملے گی؟ حضرت نے فرمایا محبت کی دکاتوں سے۔ قصہ مختصر حضرت کا مطلب یہ تھا کہ محبت پر کامیابی کا اصل مدار ہے۔ جس کا حصول اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے در پر ہوتا ہے۔ پس اہل اللہ کے ساتھ تعلق جوڑنے سے یہ نعمت حاصل ہو سکتی ہے۔

محبت ایک طاقت ہے۔ محبت ہی عمل میں قوت پیدا کرتی ہے۔ سلوک میں اعمال اور محبت کو جمع کیا جاتا ہے تو اس سے کامیابی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ریل گاڑی پٹری پر کھڑی ہے۔ لیکن انجن میں بھاپ نہیں ہے۔ تو اس انجن کو صرف دھکے کے ذریعے کہاں تک چلایا جاسکتا ہے۔ اس میں پٹری شریعت کی مثال ہے اور دوسرے عوامل ذرائع ہیں اور بھاپ محبت کی طرح ہے۔ پس اگر محبت ہو تو دوسرے ذرائع راستہ طے کرنے میں کافی مدد دیں گے۔ اس صورت میں گاڑی اگر پٹری پر ہو، تو مسافت بہت جلد قطع ہوگی اور اگر پٹری پر نہ ہو تو زبردست تباہی کا ذریعہ بنے گی۔ پس اگر محبت ہو اور شریعت کا پاس نہ ہو تو انسان گمراہ ہو کر نصاریٰ کی طرح گمراہیوں کے گھاٹوں پر اندھیروں میں ختم ہو سکتا ہے۔ محبت قاطع وساوس ہے۔ محبت میں انسان محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اس لیے اس کو اپنا ہوش ہی نہیں ہوتا۔ اس کو صرف اس سے سروکار ہوتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے خوش ہے یا نہیں۔ پس وہ اپنے محبوب کو خوش رکھنے میں اتنا مگن ہوتا ہے کہ اس کو راستے کی مشکلات پریشان نہیں کر سکتیں۔

◆ محبت کو حاصل کرنے کا طریقہ

محبتِ طبعی کا حاصل ہونا غیر اختیاری ہے اور محبتِ عقلی کا حاصل کرنا اختیاری ہے۔ اس لیے محبتِ عقلی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ غیر اختیاری چیزوں کے درپے ہونے سے پریشانی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر جب محبتِ عقلی ہو جائے تو بعض اوقات یہ محبتِ طبعی میں بھی بدل جاتی ہے یا اس کی شدت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس پر محبتِ طبعی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشادِ مبارک ہے کہ محبتِ طبعی میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اس میں انتظام نہیں ہوتا۔ بعض حضرات سے جب محبت میں ایسے کام ہو جاتے ہیں کہ شریعت جن کی عام حالات میں اجازت نہیں دیتی، اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس صورت میں ایمان کی محافظت ہو اور عقائد پر زد نہ پڑتی ہو تو بعض امور میں ایسے لوگوں کو معذور سمجھ کر ان سے صرفِ نظر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے کہ نہ تو دین پر حرف آئے نہ بزرگوں سے بدگمانی ہو۔

محبتِ عقلی کو حاصل کرنے کا طریقہ اہل محبت کی مجالس میں شرکت اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے واقعات کا مطالعہ کرنا یا سننا، علاجی ذکر، شغل اور مراقبہ کا کرنا ہے۔ اس سے دل سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور خدا کی محبت آ جاتی ہے۔ یہ تصور کرنا کہ خدا مجھ سے محبت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا، اس کے لیے بہت مفید ہے۔ اعمال میں جو راحت کی جائز صورت ہو اس کو اختیار کرنا بھی اس کے لیے ذریعہ ہے۔ شریعت کا علم حاصل کرنا سالک کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر محبت میں خطرات بہت ہیں۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہو سنا کے نداند جام و سندان باعترن

ایک ہاتھ جام شریعت ایک ہاتھ سندان عشق

جام و سندان ساتھ ہوں دونوں ہر کسی کا منہ نہیں

1.1.2.5... شوق

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ﴾ [العنکبوت: 5]

ترجمہ: ”جو شخص اللہ سے جاننے کی امید رکھتا ہو، اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ

تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی میعاد ضرور آکر رہے گی“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”أَسْأَلُكَ
لَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ، وَالشَّوْقَ إِلَى لِقَائِكَ“ [سنن نسائی، حدیث نمبر: 1305]

ترجمہ: ”تجھ سے تیرے رخ مبارک کی زیارت اور تیری ملاقات کا شوق مانگتا ہوں۔

◆ حقیقتِ شوق

کسی محبوب چیز کو حاصل کرنے یا کسی محبوب کا قرب حاصل کرنے کے لیے دل کا بے قرار ہونا شوق کہلاتا ہے۔ شوق ایک جذبہ ہے اور اس میں ایک کیفیت مغلوبیت کی ہوتی ہے۔

◆ تشریح

ابتدا میں محبتِ شوق کے رنگ میں ہوتی ہے اور بعد میں انس کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ولولہ نہیں رہتا جو شوق کے وقت ہوا کرتا ہے۔ مثلاً بات پر رونا اور استغراق کا غلبہ ہونا وغیرہ۔ مگر لوگ انہی آثار کو مقصود سمجھتے ہیں اور انس کی حالت میں جب یہ آثار کم ہو جاتے ہیں تو پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں کہ ہر وقت شوق غالب رہے اور مرغوباتِ نفسانیہ کا تقاضا طبعی کبھی نہ ہو۔ نہ یہ مقصود ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے شوق کی ایک حد بیان فرمائی ہے: ”أَسْأَلُكَ الشَّوْقَ إِلَى
لِقَائِكَ فِي غَيْرِ صَرَآءٍ مُضِرَّةٍ، وَفِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 21666]

ترجمہ: ”اے اللہ! میں آپ سے آپ کی ملاقات کا شوق بغیر کسی تنگی میں پڑنے کے جو نقصان دینے والی ہو اور بغیر کسی گمراہ کن آزمائش میں مبتلا ہونے کے، طلب کرتا ہوں“ چونکہ شوق اور عشق کا غلبہ کبھی ہلاکت اور مضرت کا باعث بھی بن سکتا ہے جس سے اعمال میں خلل پڑتا ہے۔ اصل مقصود چونکہ اعمال اور احکامات کی پابندی ہے اور کبھی غلبہ شوق میں آدمی ادب کا پاس نہیں رکھ سکتا اور بے ادبی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ اکثر عشاقِ غلبہ حال میں کرتے ہیں اور یہ بے ادبی دین کے نقصان کی وجہ بن سکتی ہے۔ گو غلبہ کی حالت میں معاف ہے مگر کمال نہیں اور آنحضرت ﷺ ادب، اطاعت اور محبت کے جامع ہیں۔ اس لیے یہ مذکورہ بالا دعا فرمائی ہے۔

شوق حاصل کرنے کا طریقہ

محبت الہی کے ساتھ شوق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ محبت کے لیے شوق لازم ہے۔

1.1.2.6... اُنس

جب آدمی کا دل کسی چیز کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تو اس کا تعلق اتنا محسوس نہیں ہوتا، لیکن جب وہ چیز نہیں ہوتی تو اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی، تو کہتے ہیں کہ اس آدمی کو اس چیز کے ساتھ اُنس ہو گیا۔ شوق کے ساتھ عاشق پر جب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور محبوب کی پسند و ناپسند کا اندازہ ہو جاتا ہے تو شوق مبدل بہ اُنس ہو جاتا ہے۔ جو شوق کی طرح ظاہر تو نہیں ہوتا لیکن دیر پا اور مؤثر ہوتا ہے۔ اس وقت عاشق اپنی محبت کا حق ایک طریقے سے ادا کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن نیا عاشق اس کو عشق سے خالی سمجھتا ہے۔ مثلاً صاحبِ شوق تو محبوب کے لیے جان دے دے گا۔ لیکن جو محبوب کو مطلوب ہے ضروری نہیں کہ وہ یہ کر گزرے۔ جب کہ صاحبِ اُنس محبوب کے لیے اپنی جان کی حفاظت بھی کرے گا اور جان کو اس کے لیے استعمال بھی کرے گا۔

◆ اُنس حاصل کرنے کا طریقہ

صاحبِ شوق اگر شیخِ کامل کے ہاتھوں میں ہے تو اس کے احکامات پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سوچے کہ جس کی برکت سے مجھے یہ نعمت ملی ہے وہ میرا خیر خواہ ہے۔ شدہ شدہ شوق مبدل بہ اُنس ہو جائے گا یعنی دل محبوب کے ساتھ مانوس ہو جائے گا۔ چونکہ یہ بھی آثارِ محبت میں سے ہے۔ اس لیے اس کی تحصیل کے لیے کوئی جداگانہ طریقہ نہیں ہے محبت کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتا ہے۔

1.1.2.7... خوف

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِخْشَاؤُنِي﴾ [البقرہ: 150]

ترجمہ: ”ہاں میرا خوف رکھو“ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ”مَنْ

خَافَ أَدْلَجَ وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ إِلَّا إِنْ سِلْعَةَ اللَّهِ غَالِيَةً إِلَّا إِنْ سِلْعَةَ اللَّهِ الْحَبَّةُ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2450]

ترجمہ: ”جو ڈرتا ہے وہ منہ اندھیرے چلتا ہے اور جو منہ اندھیرے چلتا ہے وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ سن لو اللہ تعالیٰ کا سودا مہنگا ہے۔ سن لو اللہ تعالیٰ کا سودا جنت ہے“

◆ حقیقتِ خوف

ناگوار طبع چیز کے خیال اور اس کے واقع ہونے کے اندیشے سے قلب کا ڈرنا۔

◆ تشریح

یہ احتمال کہ کہیں مجھے عذاب نہ ہو جائے، یہ خوف کی حقیقت ہے اور یہ احتمال مسلمانوں میں ہر شخص کو ہے اور یہی مامور یہ ہے اور اسی کا بندہ مکلف کیا گیا ہے۔ یہ تو شرط ایمان ہے اور اس کا نام خوفِ عقلی ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت و عیدِ الہی اور عذابِ خداوندی کو یاد کر کے گناہوں سے بچا جائے۔ یہ درجہ فرض ہے اور اس کے نہ ہونے سے گناہ ہو گا اور یہی حق تعالیٰ کا خوفِ جملہ نیک کاموں میں رغبت کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ خوف کرنے والوں کی شان میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، علم اور رضا کی محمود خصلتیں جمع فرمائی ہیں۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”عَيْنَانِ لَا تَمْسُهُمَا النَّارُ عَيْنٌ بَكَتَ مِنْ

خَشْيَةِ اللَّهِ، وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ [شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: 796]

ترجمہ: ”دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے تر ہوئی ہو اور ایک وہ آنکھ جس نے راہِ جہاد میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو۔“ ترمذی شریف میں ہے: ”عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَى شَابٍ وَهُوَ فِي الْمَوْتِ، فَقَالَ: كَيْفَ تَجِدُكَ؟ قَالَ: وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي أَرَجُوا اللَّهَ، وَإِنِّي أَخَافُ ذُنُوبِي، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَجْتَمِعَانِ فِي قَلْبٍ عَبْدٌ فِي مِثْلِ هَذَا الْمَوْطِنِ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ مَا يَرْجُو وَآمَنَهُ مِمَّا يَخَافُ۔“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 983]

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک نوجوان کے پاس آئے اور وہ سُکرات کے عالم میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے کو کیسا پارہے ہو؟ اس نے عرض کیا: اللہ کی قسم، اللہ کے رسول! مجھے اللہ سے امید ہے اور اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں اس جیسے وقت میں جس بندے کے دل میں جمع ہو جاتی ہیں تو اللہ اسے وہ چیز عطا کر دیتا ہے جس کی وہ اس سے امید رکھتا ہے اور اسے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے جس سے وہ ڈر رہا ہوتا ہے“ الغرض خشیت مؤمن کے لیے لازم ہے اور اس کی دو جوہات ہیں: اول مال میں احتمال کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی فی الحال ہو گئی ہو جس کا علم بھی التفات سے ہو سکتا تھا اور التفات میں کوتاہی ہوئی کہ یہ بھی اختیاری ہے۔ جیسے ڈاکو سزا کے خوف سے ڈاکہ نہیں ڈالتا، بچہ پٹنے کے خوف سے شرارت سے رکتا ہے۔ جرمانے کے خوف سے لوگ جرائم سے باز رہتے ہیں۔ آدمی سبکی کے خوف سے محفل میں تہذیب سے بیٹھتا ہے۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن نہیں رہتا۔ گویا کہ خوف جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا اور خوف ہی جملہ طاعات کا ذریعہ ہے۔

ایک خوف یہ بھی ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے ناراض ہونے سے ڈرتا ہے اس لیے اپنے آپ کو ہر وقت خطرے میں محسوس کرتا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو ان کا ڈر سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔ خدا کا خوف اس طرح نہیں ہوتا جیسا سانپ کچھو سے ہوتا ہے۔ ان سے تو طبعی خوف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا خوف عقلی خوف ہے جو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إِنِّي اتَّقَاكُمْ دَلَّةً“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6933]

ترجمہ: ”میں اللہ تعالیٰ سے تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں“ دنیا میں جن چیزوں سے ہم ڈرتے ہیں وہ نہ صرف طبعی ہوتی ہیں۔ بلکہ ان سے رحم کی امید بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ڈر زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید بھی ہوتی ہے اس لیے یہ خوف زیادہ محسوس نہیں ہوتا، لیکن وقت پر اس کا پتا چلتا ہے۔

◆ خوف حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کو یاد کیا کرے اور سوچا کرے۔ قرآن و حدیث میں آخرت کے جو عذاب بیان کیے گئے ہیں ان کے بارے میں سوچا جائے کہ کہیں شامتِ اعمال سے میں ان عذابوں کا مستحق ہوا تو پھر کیا ہو گا؟

1.1.2.8... رجا

جس طرح اللہ تعالیٰ کا خوف ضروری ہے کیونکہ وہ مالک ہے کسی بھی وقت گرفت فرما سکتا ہے۔ اس کی رحیمی پر جرأت کرنا حماقت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے عفو کی امید بھی نہیں ٹوٹنی چاہیے کہ وہ رحیم ہے۔ ستار ہے۔ غفار ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا رب ہے جس نے ہمیں سب کچھ بغیر ہمارے استحقاق کے عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ [الزمر: 53]

ترجمہ: ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو“ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ”لَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ“ [صحیح، مسلم، حدیث نمبر: 7155]

ترجمہ: ”اگر کافر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حال جان لے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو“

◆ رجا کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اور اس امید پر عمل کیے جانا کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے کوئی بعید نہیں کہ ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو قبول فرمائیں۔ جس طرح شیطان انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل اور بے خوف کر کے جہنم کا مستحق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اس کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو کر عمل چھوڑ دے۔ اگر غور کیا جائے تو بے خوفی اور مایوسی دونوں انسان کو عمل سے محروم کر دیتی ہیں۔ حضرت وحشی جب مسلمان نہیں ہوئے تھے تو ان کو جب حالتِ کفر کے اپنے ظلم یاد آتے تھے تو اس کی وجہ سے اپنی مغفرت سے

مایوس ہو گئے تھے۔ ان کی تسلی کے لیے قرآن میں یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ [الزمر: 53]

ترجمہ: ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقین جانو اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے“

اس سے ہمت پا کر حضرت وحشی مسلمان ہوئے اور صحابیت کا شرف پایا۔ اس لیے اگر اپنے گناہوں کے خیال سے مایوسی طاری ہونے لگے تو اس آیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید کرنی چاہیے اور عمل کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ رحمت کی باتیں کر کے اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو جائے۔ ایمان خوف اور رجا کے درمیان ہے یعنی ان دونوں میں اعتدال ہونا چاہیے۔ اس اعتدال سے کسی طرف بھی جھکاؤ خطرے سے خالی نہیں۔ عارفین فرماتے ہیں کہ جوانی میں خوف غالب ہونا چاہیے اور بڑھاپے میں رجا غالب ہونی چاہیے۔ جو شخص رحمت اور جنت کا منتظر رہے اور اس کے حاصل کرنے کے اسباب یعنی عملِ صالح اور توبہ وغیرہ کو اختیار نہ کرے، اس کو مقامِ رجا حاصل نہیں ہے۔ وہ دھوکے میں ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص تخمِ پاشی نہ کرے اور غلہ پیدا ہونے کا منتظر رہے۔ کہ یہ محض ہوسِ خام ہے۔

◆ رجا حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت و عنایات کو یاد کرے اور سوچا کرے۔ رحمت کی آیتوں میں غور کرے لیکن عمل میں اختیاری سستی نہ کرے۔ دین میں رخصتوں کا علم حاصل کر کے بوقتِ ضرورت ان سے کام لے۔

1.1.2.9... رُہد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَقْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحدید: 23]

ترجمہ: ”یہ اس لیے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے۔ اس پر تم غم میں نہ پڑو اور جو چیز اللہ تمہیں عطا فرمادے، اس پر تم اتراؤ نہیں“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ہے کہ: ”أَوَّلُ صَلَاحٍ هَذِهِ الْأُمَّةِ بِالْيَقِينِ وَالزُّهْدِ، وَأَوَّلُ فَسَادِهَا بِالْبُخْلِ وَالْأَمَلِ“ [شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: 10844]

ترجمہ: ”اول بہتری اس امت کی یقین اور زہد ہے اور اول بگاڑ اس امت کا بخل اور طولِ امل ہے“

◆ زہد کی حقیقت

آخرت کی نعمتوں کو سامنے رکھ کر اس دنیا میں تھوڑے پر قناعت کرنا زہد کی حقیقت ہے۔

◆ تشریح

زہد اصل میں دل کی آنکھوں سے آخرت کی نعمتوں کا دیکھنا ہے جو ایک عظیم نعمت ہے جس کا ذریعہ وہ نور اور علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب میں ڈالا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ساز و سامان مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر ہے اور آخرت ہی بہتر اور پائیدار ہے۔ جس وقت یہ نور حاصل ہو جاتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلے میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی کہ بیش قیمت جو اہر کے مقابلے میں پھٹے پرانے چیتھڑے کی ہو کرتی ہے اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت و کفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے، پس زاہد اتنی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کہ مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ نیز زہد ترکِ لذات کا نام نہیں۔ بلکہ محض تقلیلِ لذاتِ زہد کے لیے کافی ہے۔ یعنی لذات میں انہماک نہ ہو، نفسِ نفیس کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رہنا زہد کے منافی ہے۔ ورنہ بلا تکلف و بلا اہتمام خاص کے لذات میسر ہو جائیں تو حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ ان پر شکر کرنا چاہیے۔ نفس کو خوب آرام سے رکھے اور اس سے کام بھی لے کہ:

مزدور کو خوش رکھنا کہ کام اس سے ہے لینا

حقیقت یہ ہے کہ جن کی نظر اللہ پر ہوتی ہے ان کی نظر میں سونا چاندی تو کیا دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے

لیے دنیا کو پسند نہیں فرمایا۔ لہذا مخلوق کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ متاعِ دنیا ہے۔ سب سے امید قطع کر دی جائے۔ جو شخص ایسا کرے گا راحت میں رہے گا۔ کیونکہ زہد سے قلب اور بدن دونوں کو راحت حاصل ہوتی ہے۔

زُہد حاصل کرنے کا طریقہ

دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دائمی نعمتوں کو اپنے سامنے رکھ کر اس میں غور کرے کہ عقلمندی کیا دنیا کی طلب میں آخرت سے ہاتھ دھونے میں ہے یا دنیا میں؟ جتنا اللہ تعالیٰ دے اس پر قناعت کر کے آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس مراقبہ سے ان شاء اللہ وہ علم اللہ تعالیٰ دل میں القا فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

1.1.2.10... توکل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ [العنکبوت: 51]

ترجمہ: ”اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ

فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2516]

ترجمہ: ”جب کچھ مانگو تو اللہ ہی سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہو“ یہ حدیث شریف دیکھی جائے۔ یہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [الفاتحہ: 4] کی تفسیر ہے۔

◆ حقیقت توکل

سب کی بجائے مسبب الاسباب پر نظر رکھنا اور اس سے اپنی امیدیں وابستہ کرنا توکل ہے۔

◆ تشریح

توکل کا مطلب کسی کو تکلف اپنا وکیل بنانا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کام کو خود نہیں سمجھ سکتے اس کو دوسروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بتلانے کے موافق

کرتا رہے۔ لہذا توکل یہی ہے کہ ضروری تدبیر کر کے نتیجہ دل سے خدا کے سپرد کیا جائے کہ وہی جانتا ہے کہ کس چیز میں ہماری خیر ہے اس کے تین ارکان ہیں:

(1) معرفت۔

(2) حالت۔

(3) اعمال۔

اب ان تینوں کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے۔

رکن اول معرفت ہے۔ دل پر توحید کا مضمون جب کھل جائے اور اس کے ساتھ دل مانوس ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی جب معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو دل غیر اللہ کے تعلق سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ عارف اپنے دل میں صرف اللہ تعالیٰ کو موثر سمجھتا ہے اور غیر اللہ کو غیر موثر۔ توکل اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

دوسرا رکن پہلے رکن کا نتیجہ ہے یعنی سالک اپنا کام خدا کے حوالے کر دیتا ہے اور قلب کو مطمئن رکھتا ہے اور غیر اللہ کی طرف قطعی التفات نہیں کرتا۔ اگر کسی سبب کو اختیار کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے، ورنہ خود اس کا دل سبب کو اختیار کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

تیسرا رکن دوسرے رکن کا نتیجہ ہے کہ سالک خدا پر جو مسبب الاسباب ہے نظر رکھتے ہوئے اس کی مرضی کے مطابق سبب اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس سبب کو موثر نہیں سمجھتا بلکہ خدا کے حکم پر اس کی نظر ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارادے کو اپنے ساتھ کرنے کے لیے دعا اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتا ہے۔ سبب سے نہیں بھاگتا بلکہ سبب میں دل کے مشغول ہونے سے بھاگتا ہے۔ جاہلوں کا خیال ہے کہ توکل تو محنت مزدوری اور کسب کو چھوڑ دینے کا نام ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے کار بن کر بیٹھ جائے، اگر بیمار ہو تو علاج نہ کرائے، بے سوچے سمجھے اپنے آپ کو خطرات اور ہلاکت میں ڈال دیا کرے کہ کہیں آگ میں گھس جائے اور کہیں شیر کے منہ میں ہاتھ دے دے، تب متوکل کہلائے گا۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام

ہے اور شریعت ہی توکل کی خوبیاں بیان کر رہی ہے۔ پھر بھلا جس بات کو شریعت خود حرام بتلائے اسی کی رغبت و حرص دلائے، یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا توکل تو بچہ بھی کر سکتا ہے کہ کچھ بھی پاس نہ ہو اور کہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اصل توکل تو وہ ہے کہ بینک بھرے ہوئے ہوں لیکن ان پر نظر نہ ہو، نظر اللہ پر ہو اور یہ سمجھے اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کام بنے گا ورنہ کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔

توکل حاصل کرنے کا طریقہ

اس کی عنایتوں اور وعدوں اور اپنی گذشتہ کامیابیوں کا یاد کرنا اور ان کو سوچنا۔

1.1.2.11... قناعت

◆ حقیقت قناعت

لذات کی تحصیل میں مبالغے سے اپنے نفس کو روکنا قناعت کی حقیقت ہے۔ اگر کسی لذت والی چیز کی طرف طبعی میلان ہی نہ ہو تو یہ غیر اختیاری ہے۔ جس کو یہ حاصل ہے وہ امتحان سے بچا ہوا ہے لیکن خود اس پر اجر نہیں ہے۔ لیکن اگر میلان تو ہو لیکن عقلاً اپنے نفس کو یہ سمجھائے کہ یہاں کی چیزیں فانی ہیں۔ ان میں مشغول ہونے سے سوائے پریشان ہونے کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح اپنے نفس کو مجاہدات کے ذریعے تھوڑے پر راضی کرتا ہے۔ اس سے جو قناعت حاصل ہو وہ مطلوب اور ماجور ہے۔ چونکہ یہ زہد کا نتیجہ ہے اس کے لیے زہد کے باب کا مطالعہ کیا جائے۔

1.1.2.12... حلم

◆ حقیقت حلم

یہ غضب کی ضد ہے۔ نفس کا ناگوار بات پر بھڑکنے سے رکنا حلم کہلاتا ہے۔ جس شخص میں حلم ہوتا ہے وہ حلیم کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں کے پیش نظر ناگوار باتوں سے درگزر فرماتے رہتے ہیں۔ پس حلیم شخص بھی اپنے غصے پر قابو پا کر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جس کا ہمیں حلم بھی ہے۔

◆ حِلْم حاصل کرنے کا طریقہ

غصے کا زائل کرنا اور غصے کا علاج بار بار سوچنا جو کہ اخلاقِ رذیلہ کے بیان میں ہو چکا ہے۔

1.1.2.13... صبر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا﴾ [آل عمران: 200]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! صبر اختیار کرو“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مَحَبَّبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءٌ سَرَّاءٌ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7692]

ترجمہ: ”مؤمن پر تعجب ہے کہ اس کی ہر بات میں بہتری ہے اور یہ کسی کو میسر نہیں مگر مؤمن ہی کو، اگر اس کو خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے پس وہ اس کیلئے خیر بن جاتی ہے۔ اگر اس کو سختی پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر بن جاتی ہے“

◆ حقیقتِ صبر

انسان کے اندر دو قوتیں ہیں۔ ایک دین پر ابھارتی ہے اور دوسری ہوائے نفسانی پر۔ سو پہلی قوت کو دوسری قوت پر غالب کرنا صبر ہے اور اس کی حقیقت ہے: ”حَبْسُ النَّفْسِ عَلَى مَا تَكْرَهُ“، یعنی ناگوار بات پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا آپے سے باہر نہ ہونا۔

◆ تشریح

صبر کی تین قسمیں ہیں:

- (1) عمل کی پابندی پر صبر۔
- (2) عمل کرتے وقت صبر۔
- (3) کسی عمل کے نہ کرنے پر صبر۔

عمل كى پابندى پر صبر يہ ہے كه نفس كو كسى كام پر روك لينا يعنى اس پر جم جانا اور قائم رہنا۔ مثلاً نماز، زكوٰۃ وغيره كى پابندى كرنا اور بلا ناخه ان كو ادا كرتے رہنا۔

اور عمل كرتے وقت صبر يہ ہے كه عمل كے وقت نفس كو دوسرى طرف التفات كرنے سے روكنا، طاعات بجالانے كے وقت ان كے اركان كو مع آداب كے اطمینان سے ادا كرنا اور ہمہ تن متوجہ ہو كر كام كو، بجالانا، مثلاً نماز پڑھنے كھڑے ہوئے يا ذكر ميں مشغول ہوئے تو نفس كو يہ سمجھا ديا كه تم اتنى دير تك سوائے نماز يا ذكر كے اور كوئى كام نہيں كر سكتے، پھر دوسرے كاموں كى طرف توجہ كرنا فضول ہے۔ اتنى دير تك تجھ كو نماز يا ذكر يہى كى طرف متوجہ رہنا چاہيے۔

تيسرى قسم يعنى كسى عمل كے نہ كرنے پر صبر يہ ہے كه نفس كو اللہ تعالى كى منع كى ہوئى باتوں سے روكے اور ان سے بچے۔ نيز حالات دو قسم كے ہوتے ہيں۔

◆ نعمت اور مصيبت

نعمت سے مسرت ہوتى ہے اور مسرت كى وجہ سے منعم كے ساتھ محبت ہو جاتى ہے۔ بخلاف مصيبت كے كه اس ميں ناگوارى ہوتى ہے اور صبر كا موقع مصيبت ہے اور مصيبت كہتے ہيں اس حالت كو جو نفس كو ناگوار ہو۔ اس كى دو قسميں ہيں: ايك صورت مصيبت اور دوسرى حقيقت مصيبت۔ جس سے انقباض و پريشانى بڑھے وہ تو گناہوں كى وجہ سے ہے اور حقيقت مصيبت ہے اور جس سے تعلق مع اللہ ميں ترقى ہو، تسليم و رضا زيادہ ہو، وہ حقيقت مصيبت نہيں بلکہ صورت مصيبت كى ہے۔ عارفين كو مصيبت كا احساس تو ہوتا ہے بلکہ بوجہ ادراك لطيف ہونے كے دوسروں سے زيادہ احساس ہوتا ہے۔ مگر ان كا رنج و غم حد سے نہيں بڑھتا كيونكہ اس ميں ان كى نظر اللہ تعالى پر ہوتى ہے۔ مصائب سے بہت سے گناہوں كا كفارہ ہو جاتا ہے۔ ايك حديث مبارکہ ميں آتا ہے: ”مَا مِنْ شَيْءٍ يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ حَتَّى الشُّوْكَةِ تُصِيبُهُ إِلَّا كَتَبَ اللَّهُ لَهُ بِهَا حَسَنَةً أَوْ حَطَّتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ“ [صحیح مسلم، حديث نمبر: 6732]

ترجمہ: ”كوئى بھى مصيبت نہيں جو مومن پر آتى ہے۔ حتى كه وہ كاٹنا بھى جو اسے

چبھتا ہے تو اللہ اس کے بدلے اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہے یا اس کی وجہ سے اس کی کوئی غلطی معاف کر دی جاتی ہے۔“

ابوداؤد شریف میں ہے کہ بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندے کو خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجہ عالیہ کو پا لیتا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللَّهِ مَنزِلَةٌ لَمْ يَلْغُهَا بِعَمَلِهِ ابْتِلَاءُ اللَّهِ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَدَدِهِ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلَى ذَلِكَ حَتَّى يُبْلِغَهُ الْمَنزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى“ [سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 3090]

ترجمہ: ”بے شک جب کسی بندے کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی درجہ مقدر ہو چکے تو پھر بندہ اس درجہ کو اپنے عمل کے ذریعے سے نہ پہنچ سکے، تو اللہ تعالیٰ اس پر تکلیف بھیجتا ہے اس کے بدن میں یا اس کے مال میں یا اس کے بچوں میں، پھر اس کو صبر دیتا ہے یہاں تک کہ اس درجہ کو پہنچا دیتا ہے جو اس کے واسطے اللہ عز و جل کی جانب سے مقدر ہو چکا ہے“

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا

إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ [البقرہ: 156]

ترجمہ: ”یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ مطلب یہ ہے کہ مصیبت اور غم کے وقت زبان کو ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کے ورد میں مشغول کیا جائے اور دل کو اس کے معنی کے تصور میں مشغول کیا جائے کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اپنے مملوک میں اختیار ہے۔ غلام کو چاہیے کہ مالک کے تصرف پر راضی رہے۔ اس لیے اس موقع پر تصرفِ حق پر راضی رہنا چاہیے۔ مصیبت کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کریں تاکہ اپنی خطاؤں کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشان نہ ہوں، کیونکہ اپنی خطاؤں پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی، بلکہ انسان خود نادام ہوتا ہے کہ میں اس قابل تھا۔ پھر اجر کو یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ

نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے۔ یہ یاد کر کے غم کو ہلکا کریں اور مصیبت میں ثابت قدم رہیں۔ خدا تعالیٰ سے شکایت نہ کریں۔ کوئی بات ایمان اور اسلام کے خلاف دل اور زبان پر نہ لائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ خیال خطرناک ہے۔ اس سے تعلق ضعیف ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے۔ شریعت نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے۔ اس پر کار بند رہیں۔ مصائب میں واہی تباہی بکنے سے بالکل بچیں۔ آجکل یہ ایک مسئلہ ہے کہ اکثر اوقات غلطی اپنی ہوتی ہے بلکہ فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن گناہ کو گناہ سمجھا ہی نہیں جا رہا ہوتا، مثلاً کسی نے داڑھی نہیں رکھی ہوئی اور برملا کہے کہ مجھ سے ایسا کیا گناہ ہو گیا۔ تو ایسے میں خلاصی کی یہی صورت ہے کہ استغفار کو لازم پکڑے۔ مصائب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ترقی درجات کے لیے اللہ پاک نے آزمائش بھیجی ہے تو اس کو برداشت کریں اور اس کے ملنے والے ثواب کو یاد رکھیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے۔ اس میں نفع ضرور ہو گا۔ آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی اگرچہ دنیوی نفع ابھی سمجھ میں نہ آئے۔

◆ صبر کو حاصل کرنے کا طریقہ
خواہشات اور نفسانی جذبات کو ضعیف و کم زور کرنا۔

1.1.2.14... شکر

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿وَأَشْكُرُوا لِي﴾ [البقرہ: 152]

ترجمہ: ”اور میرا شکر ادا کرو“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”إِنْ أَصَابَتْهُ

مَرَأَةٌ شَكْرًا“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7692]

ترجمہ: ”اگر مؤمن کو خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے“

◆ شکر کی حقیقت

نعت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنا، جس کا اثر منعم سے خوش ہونا اور تعمیلِ حکم میں سرگرمی دکھانا ہے۔

◆ تشریح

نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنے سے دو باتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسرا اس کا ممنون ہو کر اس کی خدمت گزاری اور حکم پر عمل کرنے میں سرگرمی دکھانا۔ یعنی جو حالت طبیعت کے موافق ہو خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، اس حالت کو دل سے خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھنا، اس پر خوش ہونا، اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا، زبان سے خدا تعالیٰ کی تعریف کرنا اور اس نعمت کا جو ارج یعنی اعضا سے گناہوں میں استعمال نہ کرنا بلکہ اس نعمت کو اس کی رضامندی میں استعمال کرنا شکر ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا کیا چیز کس کس کام کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ ان آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور علم دین کی کتابوں کو پڑھنے اور آسمان وزمین جیسی بڑی مخلوقات کا اس غرض سے مشاہدہ کرنے میں صرف کرے کہ یا تو عبرت حاصل ہو اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے آگاہی یا علم حاصل ہو، جس سے خالق کی عظمت کا پتا چلے اور وہ جو ہم سے چاہتا ہے۔ وہ معلوم ہو۔ نیز ستر کے دیکھنے اور غیر عورت پر نظر ڈالنے سے اور دیگر ممنوعات سے روکے رکھے۔ اسی طرح کان بھی نعمت ہیں ان کانوں کا شکر یہ ہے کہ ان کو ذکرِ الہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور ہجو، لغو اور فضول کلام سننے سے روکے۔

زبان کا یہ شکر ہے کہ اس کو یادِ خدا، حمد و ثنا اور اظہارِ شکر میں مشغول رکھے اور تنگ دستی اور تکلیف میں شکوہ شکایت سے باز رکھے۔ اگر کوئی حال بھی پوچھے تو شکایت کا کلمہ زبان سے نہ نکلنے پائے، کیونکہ شہنشاہ کی شکایت ایسے ذلیل اور بے بس غلام کے سامنے کرنا جو کچھ بھی نہیں کر سکتا، بالکل فضول اور معصیت میں داخل ہے اور اگر شکر کا کلمہ نکل گیا تو طاعت میں شمار ہو گا۔ صرف زبانی الحمد للہ کہنا، جب کہ دل میں منعم اور نعمت کی قدر نہ ہو، محض درجہ عنوان میں ہے۔ یہ چھلکا ہے جس میں گری نہیں۔

یعنی محض الفاظِ شکر ہیں۔ معنًا شکر نہیں ہے اور جب معنًا شکر نہیں تو اس کی مثال بادام کے نرے چھلکے جیسی ہے جس میں گری نہ ہو کہ محض چھلکے کو بادام نہیں کہیں گے۔

اسی طرح ہر عمل کا ایک مغز اور روح ہے اور ایک پوست اور صورت ہے۔ پس شکر کی روح یہ ہے کہ منعم اور نعمت کی دل سے قدر ہو۔ ابتدائی درجہ شکر تو مرتبہ عقلی ہے کہ حق تعالیٰ کو منعم حقیقی جانے اور عقلاً اس کی قدر پہچانے اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس کا اثر طبع، جو ارح اور حرکات و سکنات میں نمایاں ہو، یعنی تمام اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق و معاشرت وغیرہ شریعت کے مطابق ہوں۔

◆ شکر حاصل کرنے کا طریقہ

حق تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچنا اور یاد کرنا اور ہر نعمت کو اس کی طرف سے جاننا۔ اس سے رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی اور شکر کا درجہ کاملہ نصیب ہو جائے گا۔ زبان سے بھی شکر کے کلمات اس طرح کہنا کہ دل اس کے ساتھ ہو۔ کہتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ پس جب انسان غور و فکر اور مجاہدے سے اپنی حقیقت جان لے کہ میں کتنا کمزور ہوں، کتنا بے حقیقت ہوں۔ میرے سارے جو ارح، صلاحیتیں، اوقات اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ تو پھر جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر نظر ہوتی ہے تو دل میں بے اختیار شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے میرے جسم کے بالوں کے برابر منہ عطا فرمائے اور ہر منہ میں ستر زبانیں ہوں اور سب سے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کروں، تو اس نعمت کا شکر کیسے ادا کروں گا کہ اس نے مجھے اتنی زبانیں دی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا تو محال ہے لیکن اس کی طلب کرنا اور اپنے آپ کو ناشکری سے بچانا اور اس سب کچھ کو کم سمجھنا یہ شکر کے طور پر قبول ہو جائے، اس کی امید کی جاسکتی ہے۔

◆ شکر کے فائدے

شکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے کیونکہ شکر

کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔ نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَكِنَّ شَكَرْتُمْ لَا زَيْدًا لَكُمْ﴾ [ابراہیم: 7]

ترجمہ: ”اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا“ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ شکر نعمتوں کا بیمہ ہے۔ کیونکہ شکر کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ جو نعمتیں موجود ہیں کم از کم وہ تو باقی رہیں گی۔ کیونکہ یہ بڑھوتری کا سب سے کم درجہ ہے۔ ورنہ امید کرنی چاہیے کہ ان میں اضافہ ہوگا۔ پس بندے کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا رہے۔ اسی میں دونوں جہانوں کا فائدہ ہے۔

1.1.2.15... صدق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ [الحجرات: 15]

ترجمہ: ”ایمان لانے والے تو وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانا ہے۔ پھر کسی شک میں نہیں پڑے اور جنہوں نے اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں“ اور حدیث شریف میں ہے کہ: ”عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: سَمِعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَهُوَ يَلْعَنُ بَعْضَ رَقِيقِهِ فَأَلْتَفَتَ إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ: يَا أَبَا بَكْرٍ لَعَانِينَ وَصِدِّيقِينَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ، فَأَعْتَقَ أَبُو بَكْرٍ يَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِيقِهِ وَجَاءَ إِلَيْهِ فَقَالَ: لَا أَعُوذُ بِرَسُولِ اللَّهِ“ [نوادير الاصول في احاديث الرسول، ج 1، ص: 364]

ترجمہ: ”نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ اپنے کسی غلام پر لعنت کر رہے ہیں آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ صدیق اور لعنت کرنے والے ہر گز نہیں رب کعبہ کی قسم۔ پس اس دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض غلاموں کو آزاد کیا اور آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اب ایسا نہ کروں گا یا رسول اللہ ﷺ“

◆ حقیقتِ صدق

جس مقام کو حاصل کرے کمال کو پہنچا دے کہ اس میں کسر نہ رہے۔

◆ تشریح

صدق کے معنی پختگی کے ہیں۔ اسی لیے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں پختگی حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ شریعت میں صدق عام ہے۔ اس میں احوال کو بھی شمولیت ہے۔ افعال کو بھی، اقوال کو بھی۔ اقوال کا صدق یہ ہے کہ بات پکی اور سچی ہو، یعنی واقعہ کے مطابق ہو۔ جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل شریعت کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے مطابق ہوں، اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے اور احوال کا صدق یہ ہے کہ احوال سنت کے مطابق ہوں۔ پس جو احوال خلاف سنت ہیں وہ احوال کا ذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے مطابق ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال میں یہ بھی ہے کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے۔ یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی، پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا، جس کو تلوین کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیے کہ جو حالت طاری ہو وہ مقام ہو جائے۔ اصطلاح میں اسی کو مکمین کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طاعت کا ارادہ ہو اس میں کمال کا درجہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً نماز کو اس طرح پڑھنا کہ جس کو شریعت نے صلوٰۃ کاملہ کہا ہے۔ یعنی اس کو مع آداب ظاہرہ و باطنہ کے ادا کرنا۔ اس طرح تمام طاعات میں جو درجہ کمال کا شریعت نے بتایا ہے اس کا اختیار کرنا صدق ہے۔

صدق کو حاصل کرنے کا طریقہ

صدق ہر حال، حال اور فعل میں کمال کے جاننے پر موقوف ہے۔ کیونکہ اگر کمال

کاپتا نہیں ہو گا تو اس کو حاصل کیسے کیا جاسکے گا۔ لہذا ہمیشہ نگران رہے۔ اگر کچھ کمی ہو جائے تو اس کا تدارک کرے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ کمال حاصل ہو جائے گا۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ صادقین کے ساتھ رہے اور ان کی نگرانی میں اپنا کام کرے اور ان میں جس کے ساتھ مناسبت ہو، اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر کے اس کو اپنے قول و فعل اور حال سے باخبر رکھے کہ وہی اس میں کمال کی صحیح نشاندہی کرنے والا اور اس کے حصول کی آسان ترکیب بتانے والا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنتِ عادیہ یہ ہے کہ اکثر طالبن کی اس طرح اپنے فضل سے رہنمائی فرمادیتے ہیں اور ان کو جلد یا بدیر مقامِ صدق پر سرفراز فرمادیتے ہیں۔

1.1.2.16... تو اَضَع

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے کہ: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: 63]

ترجمہ: ”اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں“ مطلب یہ ہے کہ ان کے مزاج میں تمام امور میں تواضع ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَنْ تَوَاضَعَ لِلَّهِ رَفَعَهُ اللَّهُ“ [شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: 8140]

ترجمہ: ”جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا کرے گا“

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

◆ تواضع کی حقیقت

تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایک کمزور انسان سمجھے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی عظمت پیش نظر ہو۔ اپنی کمزوریوں پر ایسی نظر ہو کہ اپنی طرف بڑائی کی نسبت سے سچ مچ دور ہو۔ اس کا اصل مجاہدہ نفس ہے اور یہ تکبر کی ضد ہے۔

◆ تشریح

تواضع صرف اس کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو خاکسار، نیاز مند، ذرہ بے مقدر کہہ دیا اور بس۔ بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں ذرہ بے مقدر کہہ کر برا بھلا کہے اور ذلیل کرے تو ہم میں انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھائیں کہ ہم جب واقعی ایسے ہیں تو پھر برا کیوں مانتے ہیں اور کسی کی مذمت سے ہمیں کوئی رنج و اثر نہ ہو۔ یہ تو تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ تعریف اور برائی عقلاً برابر ہو جائے۔ کیونکہ طبعاً تو مساوات ہو ہی نہیں سکتی، یہ تو غیر اختیاری ہے۔ البتہ اختیاری امور میں ہمیں تواضع اختیار کرنی چاہیے اور اسی کا انسان مکلف بھی ہے۔ اتفاق کی اصل تواضع ہے۔ جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں نا اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ تواضع میں جذب اور کشش کی خاصیت ہے۔ تواضع کی طرف خود بخود کشش ہوتی ہے بشرطیکہ صحیح تواضع ہو۔

◆ تواضع حاصل کرنے کا طریقہ

انسان جب تک نا سمجھ ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ادراک نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، صلاحیتوں اور توفیقات کو اپنا سمجھ کر پھول جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اور جس طرح دی ہیں اس طرح لے بھی سکتا ہے۔ پس انسان کا اپنے اندر یہ سمجھ پیدا کرنا اور اپنی حیثیت کا مشاہدہ کرنا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایسا دھیان حاصل کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی ہر وقت پیش نظر اور مستحضر رہے۔ یہی تواضع کو حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کو تکبر سے نفرت ہے۔ لہذا متکبر سے ضرور نفرت ہوگی اور اللہ تعالیٰ تواضع و عاجزی پسند فرماتے ہیں۔ لہذا متواضع کو بھی پسند فرمائیں گے۔ ذکر کی کثرت، موت کی یاد اور ان حضرات سے ملنا جن میں تواضع ہو، تواضع حاصل کرنے کے لیے مفید اعمال ہیں۔

1.1.2.17... تفویض

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَأَفْوِضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ [الغافر: 44]

ترجمہ: ”اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یقیناً اللہ سارے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثُ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ، وَإِذَا آَمَسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثُ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ“ [سنن ترمذی: 2333]

ترجمہ: ”جب صبح کرو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور جب شام کرو تو صبح کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ۔“

◆ تفویض کی حقیقت

اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا کہ جو وہ چاہیں تصرف کریں۔ اپنے لیے کوئی حالت تجویز نہ کرنا یعنی خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے، تدبیر کرے اور نتیجے کو خدا کے سپرد کر دے۔

◆ تشریح

تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہ رکھیں۔ تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور جن امور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں ان میں تو ابتدا ہی سے تفویض و تسلیم اختیار کرے۔ اپنی طرف سے کوئی حالت یا نظام تجویز نہ کرے۔ تجویز ہی تمام پریشانیوں کا سبب ہے۔ کیونکہ ہم نے ہر چیز کا ایک خاص نظام اپنے ذہن میں وضع کر رکھا ہے اور چاہتے ہیں کہ ہر کام اس نظام کے مطابق ہو۔ لیکن جب کوئی کام اس نظام کے خلاف واقع ہوتا ہے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہوتا ہے۔ تو غیر اختیاری امور کے لیے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ اسی لیے اہل اللہ نے تجویز چھوڑ کر یہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔

تجھ پر فدا ہو جاں مری، زندہ رکھے تری عطا

دل عشق میں مبتلا ترے، دل چاہے بس تری رضا

یعنی زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے اور اگر موت دیں تو بھی آپ پر فدا، چونکہ جب دل ہی آپ پر آگیا ہے تو اب جو بھی آپ کی مرضی ہو، تسلیم ہے۔ الغرض اپنی تجویز کو دخل نہ دے اس طرح تربیت کے سلسلہ میں بھی اپنی تربیت کو خدا کے سپرد

کرے کہ جس طرح چاہے وہ تربیت کرے، حالات و کیفیات عطا کریں یا سب کو سلب کریں، اپنی تجویز کو خدا تعالیٰ کی تجویز میں فنا کر دیں، یعنی کامل عبدیت اختیار کریں۔

◆ تفویض کی صفت حاصل کرنے کا طریقہ

حق تعالیٰ کے حکیم اور کریم ہونے کا مراقبہ اس مقصد کے لیے بہت مفید ہے۔ چونکہ حکیم ہے اس لیے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے اور کریم ہے اس لیے اس کے ہر کام میں ہماری خیر ہے۔ جب کوئی خلاف طبع ناگوار واقعہ پیش آئے تو فوراً یہ سوچے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے جس میں لازماً کوئی حکمت اور مصلحت ہے۔ ابتدا میں تکلف سے یہ بات حاصل ہوگی پھر سوچتے رہنے سے تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے اور پھر یہ حالت اہل اللہ کے لیے طبعی بن جاتی ہے۔

1.1.2.18... رضا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے: ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [البیہ: 8]

ترجمہ: ”اللہ ان سے خوش ہو گا اور وہ اس سے خوش ہوں گے“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ آدَمَ رِضَاةٌ بِمَا قَضَى اللَّهُ لَهُ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2151]

ترجمہ: ”آدمی کی سعادت سے ہے راضی رہنا اس پر جو اس کے لیے اللہ نے مقرر کر دیا ہو“

◆ رضا کی حقیقت

قضا پر اعتراض نہ کرنا، نہ زبان سے نہ دل سے۔

◆ تشریح

رضا بالقضا کا بعض مرتبہ ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی۔ پس اگر مصیبت کا احساس ہی نہ ہو تو رضا طبعی ہے اور اگر مصیبت کا احساس باقی رہے تو رضا عقلی ہے۔ اول رضا طبعی حال ہے جس کا بندہ مکلف نہیں ہے اور ثانی رضا عقلی مقام ہے جس کا بندہ مکلف ہے۔ قضا پر راضی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف

تو محسوس ہوتی ہے مگر چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے ثواب پر مطلع کر دیا ہے۔ اس لیے طبیعت اس تکلیف کو بلا تکلف گوارا کرتی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لیے تلخ دوا بتائے یا آپریشن کرانے کی ہدایت کرے، تو اگرچہ اس تلخ دوا کھینا اور آپریشن کرنا تکلیف کی باتیں ہیں۔ مگر چونکہ اس کے ساتھ حاصل ہونے والے عمدہ نتیجہ یعنی صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے۔ لہذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی بلکہ اس کا احسان مند و ممنون رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کیے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر مرحمت ہو گا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہو گا جس کے مقابلے میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ تو اس یقین سے وہ ضرور مسرور و شاداں ہو گا۔ جس وقت مولائے حقیقی کی جانب سے جو عطا ہوتا ہے۔ اس وقت کے وہی مناسب ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کی تمنا نہیں چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ بظاہر ہمارے نقصانات ہی کو ہمارے لیے بہتر سمجھ رہے ہیں تو ہم کو اس میں صدمہ کی کون سی بات نظر آئی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے جیسا بنا دیا ہے اس کے لیے وہی مناسب تھا۔ گو ہر شخص دوسروں کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا۔ جس کی وجہ سے اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی۔ لیکن غور کر کے دیکھے اور سوچے تو اس کو معلوم ہو گا کہ میرے لیے مناسب حالت وہی ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ نے مجھ کو رکھا ہے۔

البتہ دعا کرنا خلافِ رضا نہیں۔ اہل اللہ محض حکم کی وجہ سے اظہارِ عبدیت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس غرض سے دعا نہیں کرتے کہ ہم نے جو مانگا ہے ضرور ہمیں وہی مل جائے۔ بلکہ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ خواہ قبول ہو یا نہ ہو۔ قبول نہ ہونے سے شاک اور تنگ دل نہیں ہوتے ہیں۔ یہی رضا کی علامت ہے۔

◆ صفتِ رضا حاصل کرنے کا طریقہ

یہ آثارِ محبت میں سے ہے۔ لہذا اس کے لیے کوئی جداگانہ طریق نہیں ہے۔ محبت کے ساتھ رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب محبت ہو جاتی ہے تو پھر بقول شاعر

سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

1.1.2.19... فنا

◆ حقیقتِ فنا

فنائے ذات یعنی اپنے آپ کو مٹانا۔ اسی کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں۔ اس میں عبدیتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے جس سے افعالِ ذمیرہ و ملکاتِ رذیلہ زائل ہو کر معاصی ترک ہو جاتے ہیں اور قلب سے غیر اللہ کی محبت نکل جاتی ہے۔ اس سے حرص، طولِ امل، کبر و عجب و ریاء وغیرہ جو سب ذات کے ساتھ وابستہ چیزیں ہیں۔ ان کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

◆ صفتِ فنا حاصل کرنے کا طریقہ

ملکہِ یادداشت کو اتنا راسخ کرنا کہ غیر اللہ کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہ رہے۔ اس کی اصل ہے جس کو حاصل کرنے کا طریقہ مجاہدہ اور کثرتِ ذکرِ لسانی و قلبی ہے۔

◆ فناء الفنا (یعنی فنا کا فنا)

ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اتنی خود رائی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ یہ تکبر پیدا کرتا ہے اور ایک وہ مبارک لوگ ہیں جو اپنی ذات کو اس حد تک بھول جاتے ہیں کہ ان کو اپنی فنایت کا بھی علم نہیں ہوتا۔ ان کو صرف اللہ یاد ہوتا ہے اور اسی کی خوشنودی میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہر عمل کے لیے تیار رہتے ہیں اور اس معاملے میں وہ دوسروں سے زیادہ ہوش رکھتے ہیں۔ اس لیے اس کو بقا بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ بے خودی جو فنا میں تھی وہ بھی نہ رہی یعنی جیسا التفات اور استحضار غیر کا پہلے تھا وہ نہ رہا۔ غیر دل سے نکل گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہی تو کمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے عظیم سانحے کو برداشت کیا اور بے خودی میں نہ گئے، مکمل ہوش میں رہے۔ حقائق کا ادراک کیا اور اس صورتِ حال میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم تھا وہ پورا کر کے دکھایا اور وہ آیتِ مبارکہ ان کو اچھی طرح یاد رہی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا ذکر تھا۔ اس آیت کا پڑھنا تھا کہ باقی سب صحابہ کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہو گیا۔

اس کے حاصل کرنے کا طریقہ محبتِ الہی ہے۔ جو اس کو اپنے سے بیگانہ اور اللہ تعالیٰ

کا دیوانہ کر دے۔ کیونکہ اصل پاگل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں دیوانہ نہیں اور اصل عقلمند وہ ہے جو نفسانی عقل سے پاک ہے۔

ہے وہ دیوانہ جو دیوانہ نہیں
ہے وہ فرزانہ جو فرزانہ نہیں

20.2.1.1... دُعا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ [الغافر: 60]
ترجمہ: ”اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا بیشک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں۔ وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے“

◆ دعا کی حقیقت

اس کی حقیقت نیاز مندی اور بندگی ہے۔ یعنی اپنی حاجت اور احتیاج کو پیش کرنا کہ اے اللہ! ہمیں یہ دے دے۔ قرآن و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعائیں عبادت ہے خواہ کسی قسم کی ہو، دینی ہو یا دنیوی۔ مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو، خواہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی سے بڑی چیز کی۔ ترمذی شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے مانگا کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لَيْسَ أَلْأَحَدُ كُمْ رَبُّهُ حَاجَتُهُ كُلُّهَا حَتَّى يَسْأَلَ شَيْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ“ [صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: 894]

ترجمہ: ”تم میں سے ہر ایک اپنی ساری حاجتیں اور ضرورتیں اپنے رب سے مانگے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ اگر ٹوٹ جائے تو اسے بھی اللہ ہی سے مانگے“ اور دعا کی خاص بات یہ ہے کہ جتنی بھی عبادتیں ہیں۔ اگر وہ دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں۔ مگر دعا ایک ایسی عبادت ہے کہ یہ اگر دنیا کے لیے بھی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے۔ مثلاً مال مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے، تب بھی ثواب کا مستحق بنے گا۔ حدیث شریف میں ہے: ”مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللَّهَ يَعْظَبْ عَلَيْهِ“ [سنن ترمذی: 3373]

ترجمہ: ”جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں“ اور یہی آیتِ بالا سے بھی مفہوم ہوتا ہے نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو برابر مانگتا رہے اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔

ہر تدبیر میں انسان اپنے جیسے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قلاً یا حالاً اور دعا میں ایسی ذات سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور عقل بھی یہی کہے گی کہ جس کی قدرت سب کی قدرتوں پر غالب ہے اسی سے مانگنا زیادہ کمال اور نفع رساں ہے۔ پس یقیناً یہ تدبیر ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ کوئی بھی تدبیر حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ لہذا جو شخص حق تعالیٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہو گا۔

دعا صرف غیر اختیاری امور کے ساتھ خاص نہیں ہے جیسا کہ عام خیال کیا جاتا ہے کہ جو معاملہ انسان کے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے۔ بلکہ اختیاری امور میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے۔ اصل کام تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب و علامات محض بندوں کی تسلی اور دوسری حکمتوں کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔

◆ ضرورتِ دُعا

دعا کے علاوہ جتنے اسباب ہیں یا وہ دنیا کے لیے ہیں یا آخرت کے لیے مثلاً زراعت، تجارت وغیرہ کے لیے جو اسباب ہیں۔ ان کا اصل مقصود دنیا ہے چاہے حسن نیت سے اس کا اجر آخرت میں بھی ملے اور اسباب شرعیہ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ سے آخرت مقصود ہے چاہے وہ نتیجے کے لحاظ سے دنیا کے لیے بھی مفید ہوں، یعنی ان میں دنیا کی نیت نہیں کی جاسکتی ہے۔ صرف دعا ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں دنیا کی بھی نیت ہو تو بھی آخرت میں مفید ہے اور آخرت کے لیے ہو تو وہ تو ہے ہی، جس سے بوجہ اس جامعیت کے اس کی وقعت و عظمت ظاہر ہے۔ اس لیے قرآن مجید و حدیث میں نہایت درجہ اس کی ترغیب و فضیلت و تاکید جا بجا وارد ہے۔ ابو داؤد شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ”إِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيُّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي مَنْ عَبَدَهُ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ أَنْ يَزِدَّهُمَا صِفْرًا“ [سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: 1490]

ترجمہ: ”تمہارا رب بہت باحیا اور کریم (کرم والا) ہے۔ جب اس کا بندہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹاتے ہوئے اسے اپنے بندے سے شرم آتی ہے“

ترمذی شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ثَلَاثٌ لَا تَرُدُّ دَعْوَتَهُمْ، الْإِمَامُ الْعَادِلُ، وَالصَّائِمُ حِينَ يَفْطِرُ، وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ يَزِفَعُهَا فَوْقَ الْعَمَامِ، وَتُفْتَحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَيَقُولُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: وَعِزَّتِي لَا نَصْرَ نَتَكُ وَكُوْبَعَدَا حِينٍ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2526]

ترجمہ: ”تین لوگ ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی: ایک روزہ دار، جب تک کہ روزہ نہ کھول لے، (دوسرے) امام عادل، (تیسرے) مظلوم، اس کی دعا اللہ بدلیوں سے اوپر تک پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور رب کہتا ہے: میری عزت (قدرت) کی قسم! میں تیری مدد کروں گا۔ بھلے کچھ مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔“

نیز ابن ماجہ شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لَا يَزِيدُ الْقَدْرَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمْرِ إِلَّا الْبِرُّ، وَإِنَّ الْعَبْدَ لِيُحْرَمَ الرِّزْقَ بِالدُّنْبِ يُصِيبُهُ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 22413]

ترجمہ: ”نیک ہی عمر کو بڑھاتی ہے اور تقدیر کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں ٹال سکتی اور کبھی آدمی اپنے گناہ کی وجہ سے ملنے والے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“

اور ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے: ”كَيْسَ شَيْءٍ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى مِنَ الدُّعَاءِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3370]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قدر و منزلت کی نہیں“ اور مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الدُّعَاءُ سِلَاحٌ

الْمُؤْمِنِينَ وَعِمَادِ الدِّينِ وَنُورِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ“ [متدرک حاکم، حدیث نمبر: 1812]

ترجمہ: ”دعا مسلمان کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے“ دعا میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے معمولی تدبیر بھی موثر ہو جاتی ہے۔ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہو گا۔ بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف ہوائی ہوتا ہے۔ اس لیے دعا کے ذریعے سلوک بھی آسانی کے ساتھ ملے ہو جاتا ہے یعنی جو برکات یعنی اللہ تعالیٰ کا دھیان ذکر سے حاصل کیا جاتا ہے وہ دعا سے جلدی حاصل ہو جاتا ہے۔

دعا میں ایک نفع یہ بھی ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائے گا کیونکہ جب اس سے سوال ہو گا کہ تم نے حق کا اتباع کیوں نہیں کیا؟ یہ کہہ دے گا کہ میں نے طلبِ حق کے لیے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے، میں نے ان سے بھی عرض کر دیا تھا کہ مجھ پر حق واضح ہو جائے۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے نا تمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

◆ قبولیتِ دعا اور اس کا طریقہ کار

احادیثِ شریفہ میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ سب سے بڑی چیز ہے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے۔ اس کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے۔ کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے۔ عوام سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے۔ بس دو تین دعائیں یاد کر لی ہیں۔ نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں، نہ خشوع ہے نہ خضوع ہے، یہ تو ایک غلطی ہوئی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ دعا کے نہ قبول ہونے سے شیطان یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو سب تدبیروں سے کم ہے۔ دیکھو اتنا عرصہ دعا کرتے گزر گیا قبول ہی نہ ہوئی۔ مگر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو دعا میں اڑ جائے اور پھر عطا نہ ہو خواہ سردست اس کو دے دیں یا آئندہ کے لیے

جمع کر دیں۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا: ”مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا
إِنْتُمْ، وَلَا قَطِيعَةٌ رَحِمَهُ، إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا أَحَدَى ثَلَاثٍ: إِمَّا أَنْ تُعْجَلَ لَهُ
دَعْوَتُهُ، وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ، وَإِمَّا أَنْ يُصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السَّوَاءِ
مِثْلَهَا“ [مسند احمد، حديث نمبر: 11133]

ترجمہ: ”جو مسلمان بھی دعا کرتا ہے بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ
اسے تین چیزوں میں سے ایک ضرور عطا فرماتا ہے: یا تو اس کی دعا سوال کے مطابق اسی
وقت قبول ہو جاتی ہے۔ یا آخرت میں اس کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ یا اس جیسی کوئی
تکلیف جو پہنچنے والی ہوتی ہے۔ اسے دور کر دیتا ہے“ اس سے معلوم ہوا کہ دعا قبول ضرور
ہوتی ہے مگر صورتیں اس کی مختلف ہیں کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی آنے والی
تکلیف اس دعا کی بدولت ٹل جاتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر
آخرت میں جمع کر کے آخرت میں دیا جائے گا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ آخرت
میں دعا کا ثواب دیکھ کر مومن تمنا کرے گا کہ کاش میری سب دعائیں آخرت میں ہی
ذخیرہ رہتیں دنیا میں ایک بھی نہ ملتی۔ جیسے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ فِي ذَلِكَ الْمَقَامِ: يَا لَيْتَهُ لَمْ يَكُنْ عَجَّلَ لَهُ
شَيْءٌ مِّنْ دَعَائِهِ“ [المستدرک للحاکم، حديث نمبر: 1819]

ترجمہ: ”اس مقام پر بندہ سوچے گا: کاش میری کوئی بھی دعا دنیا میں پوری نہ ہوتی
ہوتی، پس یقین کر لینا چاہیے کہ ہماری سب دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ
ہر چیز کی مصلحت کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ
جس نعمت کی ہم درخواست کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب
ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔ جیسے اگر کوئی طبیب سے درخواست
کرے کہ میرا علاج مسہل سے کر دیجیے تو اصل منظوری تو علاج کا کر دینا ہے گو مسہل
نہ دے اور دوسری منظوری مسہل دینا ہے اگر یہ مفید ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے:

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ [البقرہ: 186]

ترجمہ: ”جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں“ یعنی جب کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر توجہ کرتے ہیں۔ بے توجہی نہیں کرتے۔ آیت مذکورہ میں یہ فرمایا گیا کہ پس جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہیں ہوگا تو وہ ضرور پوری ہوگی۔ ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا۔

سو یہ تو اصل کامیابی ہے۔ پس اجابتِ دعا جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست کا لے لینا ہے اور اس پر توجہ کرنا ہے۔ یہ اجابت یقینی ہے اس سے کبھی محرومی نہیں ہوتی۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے۔ یہ اگرچہ ممکن ہے لیکن اس کا وعدہ نہیں۔

◆ دعا کے آداب

احادیثِ معتبرہ میں دعا کے لیے چند آدابِ تعلیم فرمائے گئے ہیں جن کو ملحوظ رکھ کر دعا کرنا بلاشبہ کامیابی کی کنجی ہے اور جن کی رعایت کے بعد دعا کا قبول نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی عادت کے خلاف ہے۔ اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ ان آداب کا خیال رکھ کر دعا کی جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام یا بعض آداب کو جمع نہ کر سکے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ دعائی چھوڑ دے۔ بلکہ دعا تو ہر حال میں مفید ہی مفید ہے اور ہر حال میں حق تعالیٰ سے قبولیت کی امید رکھنی چاہیے۔ یہ آداب مندرجہ ذیل ہیں۔

سب سے بڑا ادب یہ ہے کہ رزق حلال ہو۔ رزق حرام سے اپنے آپ کو بچائے کیونکہ رزق حرام دعا کے قبول نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کے علاوہ جو آداب ہو سکتے ہیں ان میں وضو کرنا، قبلہ رخ ہونا، دو زانو بیٹھنا، دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا، اخلاص اور ادب و تواضع کے ساتھ دعا کرنا، دعا کے لیے اول و آخر حمد و ثنا اور درود شریف پڑھنا، اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرنا، دعا کے وقت انبیائے کرام علیہم السلام اور دوسرے مقبول بندوں کے ساتھ توسل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ! ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما۔ ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ رغبت و شوق اور عزم کے ساتھ دعا کرنا یعنی یہ نہ کہے کہ یا اللہ! اگر تو چاہے تو میرا

کام پورا کر دے۔ بلکہ قبولیتِ دعا کی امید قوی رکھے۔ کسی ناجائز چیز، گناہ اور محال چیز کی دعا نہ کرے۔ اپنی سب حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور مخلوق پر بھروسہ نہ کرے۔ دعا کے آخر میں آمین کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے۔ قبولیتِ دعا میں جلدی نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول نہیں ہوئی۔

◆ دعا اور اسباب

ان میں اعتدالِ اصل طریقہ نبویہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت فرمائی ہے۔ اس لیے دعا کرنے والے کو چاہیے کہ نہ دعا کے بھروسہ پر اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا منہمک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔ آخر دعا بھی تو ایک سبب ہے۔ اس لیے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ باقی اسباب کا خیال تو رکھا جائے لیکن اس اصل سبب کی طرف دھیان نہ ہو۔ عوام میں اس طرف سے بڑی غفلت ہے۔ تعویذ وغیرہ پر تو عوام کو بہت یقین ہوتا ہے جس کو ثابت کرنا محنت طلب کام ہے۔ لیکن دعا جو قرآن و حدیث سے یقینی طور پر بلا غبار ثابت ہے اور تمام انبیاء، صدیقین اور اولیاء کا لازمی طریقہ رہا ہے۔ اس کی قدر نہیں کی جاتی اور اگر دعا کے لیے کہتے ہیں تو پھر اسباب کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ بعض لوگ تو یہ ظلم کرتے ہیں کہ دعا کو ایک سبب بھی نہیں مانتے، اس لیے دعا سے محروم ہیں اور بعض اپنے اختیاری امور جن میں اسباب کے اختیار کرنے کے ساتھ دعا کا حکم ہے اس کو صرف دعا سے کروانا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اس لیے اس بندگی کا تقاضا ہے کہ ہم شریعت کے مطابق اسباب کا بھی ڈٹ کر استعمال کریں اور ان اسباب پر ہمارا بھروسہ نہ ہو، مسبب الاسباب پر بھروسہ ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے ان اسباب کے مؤثر ہونے کی دعا بھی کی جائے۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیز مانگنے سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہونگے کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہر بڑی چیز چھوٹی ہے۔ اس کے نزدیک عرش اور نمک کی ڈٹی برابر ہے۔ دعا میں اگر دل نہ لگتا ہو تو دل کو اس طرح سمجھا دیں کہ دنیا میں بعض اسباب میں نفع یقینی نہیں ہوتا، لیکن ہم اس امید پر کہ شاید اس سے نفع ہو جائے ہمت

سے کام لیتے ہیں۔ گو آخر میں خسارہ ہی ہو جائے یعنی خسارہ کا خطرہ ہوتا ہے جیسے تجارت وغیرہ میں۔ جب کہ دعا میں تو کسی قسم کے نقصان کا احتمال ہی نہیں ہے۔ پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے؟

1.1.2.21... خشوع

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خِشْعُونَ﴾ [المؤمنون: 2]

ترجمہ: ”جو اپنی نماز میں دل سے جھکنے والے ہیں“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”فِيصَلِّي رَكَعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 576]

ترجمہ: ”پھر دو رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ اپنے دل اور چہرہ سے اس کی طرف متوجہ رہے“

◆ حقیقتِ خشوع

کسی نیک عمل میں بطور مقصودیت کسی غیر اللہ کا قلب میں حاضر نہ ہونا اور نماز میں کسی غیر مطلوب چیز کی طرف التفات کا نہ ہونا خشوع کہلاتا ہے۔ خشوع لغت میں مطلق سکون کو کہتے ہیں اور شرعاً اعضا کے سکون کے ساتھ سکونِ قلب (جس کی حقیقت حرکتِ فکریہ کا انقطاع ہے) کو جتنا اختیار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ حاصل کرنا خشوع ہے۔ جس طرح اعضا کا سکون بقدرِ قدرت ممکن ہے مثلاً صحیح اور قوی آدمی اس پر قادر ہے کہ نماز میں کوئی حرکت نماز کے علاوہ صادر نہ ہونے دے، وہ اس کا مکلف ہو گا اور جو کسی درجہ میں معذور ہے مثلاً غلبہ درد کے وقت اس پر قابو نہیں۔ جب درد اٹھے گا بے چین ہو کر بیچ و تاب کھائے گا۔ اس لیے وہ اس درجہ سکون کا مکلف نہ ہو گا۔ البتہ جب درد نہ اٹھے تو وہ از سر نو اس سکون کا مکلف ہو گا۔ اسی طرح سکونِ قلب بھی بقدرِ قدرت مطلوب ہے۔ مثلاً جو شخص تشویش کے تمام اسباب سے محفوظ ہو وہ حرکاتِ فکریہ کے کلی انقطاع پر قادر ہے۔ اس لیے وہ اس کا مکلف ہو گا اور جو تشویش کے اسباب میں مبتلا ہو وہ ایسے انقطاع پر قادر نہیں۔ اس لیے وہ اس درجہ کا مکلف بھی نہ ہو گا۔ البتہ جتنا وقت تشویش سے سکون کا میسر ہو گا یعنی وہ تشویش تخیل پر غالب نہ ہو، اس وقت میں اس کا مکلف ہو گا۔ یہ تو اس کا اصل مفہوم ہے۔ اب اس مقام پر ایک باریک

بات ہے جو زیادہ قابلِ اعتنا ہے اور اس میں زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر صاحبِ معاملہ کو ایسی بصیرت نہ ہو تو اس کو کسی مُصلِحِ تجربہ کار سے مشورہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اس حرکتِ فکریہ کو قطع کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ انقطاعِ براہِ راست حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل کو یا تو کسی ایک محمود چیز کی طرف قصداً متوجہ کر دیا جائے جو نماز کے خلاف نہ ہو، مثلاً ذاتِ حق کی طرف برابر متوجہ رہے۔ اگر خیال نہ جننے کی وجہ سے اس پر قادر نہ ہو تو یہ تصور کرے کہ میں کعبہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں یا پھر غور و خوض میں دل کو مشغول کرے۔ مثلاً نماز میں جو اذکار و قرأت پڑھ رہا ہے ان کی طرف توجہ رکھے کہ میں یہ الفاظ پڑھ رہا ہوں۔ یا ان کے معانی کی طرف توجہ رکھے۔ چونکہ نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے یہ توجہ دوسرے خطرات (یعنی خیالات و وساوس) کے آنے سے مانع ہو جائے گی۔

◆ سکونِ قلب کو حاصل کرنے کا طریقہ

دراصل ہر شخص کی استعداد جدا ہے۔ کسی کے لیے ایک تصور نافع ہے تو کسی کے لیے دوسرا تصور۔ بعض اوقات صاحبِ معاملہ بصیرت اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے لیے ایک طریقے کو اختیار کرتا ہے اور وہ طریقہ اس کی طبیعت کے مناسب نہیں ہوتا، لہذا اس کو اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا اور بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس غلط گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خشوعِ فعلِ اختیاری نہیں ہے۔ نتیجتاً اس کا اہتمام بالکل چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس کی برکت سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے اپنے لیے مناسب طریقے کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسری غلطی جو اس سے اشد ہے۔ یہ ہوتی ہے کہ تعین کے بعد جس طریقے کو اختیار کیا گیا ہے اس میں کاوش زیادہ کرنے لگتا ہے اور اس کا منظر اور متوقع رہتا ہے کہ دوسرا کوئی خیال بالکل نہ آئے اور اس کے لیے طبیعت پر زور ڈالتا ہے حتیٰ کہ کلال و ملال کی نوبت پیش آتی ہے جس کا نتیجہ وہی یاس اور ناامیدی ہے کہ خشوع کو حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے زیادہ کاوش نہیں کرنی چاہیے۔ بس سرسری معتدل توجہ کافی ہے۔ اگر اس توجہ کے ساتھ کوئی دوسرا خطرہ (وسوسہ) آجائے تو وہ غیر اختیاری ہو گا اور مضر نہ ہو گا۔ جیسے کسی خاص صفحہ میں کسی

خاص لفظ پر قصداً نظر کی جائے تو یقینی بات ہے کہ وہ شعاعیں بلا قصد دوسرے کلمات پر بھی پہنچ جاتی ہیں۔ مگر اس کا قصد نہیں ہوتا۔

تیسری غلطی سب سے بڑھ کر یہ ہوتی ہے کہ دوسرے خیال کے آنے کے ساتھ یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ خیال قصداً آیا یا بلا قصد، سو یہ فیصلہ محض بیکار ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ قصداً آگیا تو اب گزشتہ کی تلافی تو نہیں ہو سکتی، بس آئندہ کے لیے اپنے خیال کو درست رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اپنی توجہ اب بہتر کر لے، کیونکہ یہی ہو سکتا ہے اور اس کا ہی حکم ہے۔ اصل میں جو توجہ خیالات کو روکے وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ غور و خوض مختلف اشیاء کی طرف ہو۔ دوسرا یہ کہ کسی ایک چیز کی طرف دھیان جائے، چاہے اس میں غور و خوض نہ ہو۔ پس جس شخص کو آیات و اذکار کے معانی بلا خوض ذہن میں آتے ہوں، مثلاً کوئی پکا حافظ ہے اور عالم بھی ہے۔ وہاں نہ غور و خوض کا وجود ہے اور نہ ہی جس چیز میں فکر سے کام لیا جا رہا ہو وہ ایک چیز ہے۔ اس لیے توجہ کی کوئی قسم نہ پائی گئی، پس اس سے خیالات منقطع نہیں ہوں گے۔ بخلاف اس شخص کے جس کو سوچنے سے معنی یاد آتے ہیں۔ اس شخص کی توجہ قاطع خطرات ہوگی۔ پس ایسے شخص کے لیے دوسری توجہ کی ضرورت ہوگی یعنی شے واحد کی طرف، خواہ وہ شے واحد کچھ بھی ہو ذات حق ہو یا کعبہ پر نظر یا کچھ اور اور توجہ الی الحق یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا اجمالاً تصور رکھے چاہے جس طریق سے بھی بے تکلف ذہن میں آجائے۔ زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ یا ان کے کسی فعل کا تصور رکھے مثلاً یہ کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک چیز کی طرف توجہ کا ایک طریقہ جو بہت آسان بھی ہے اور بے حد نافع بھی، یہ ہے کہ اپنی تمام طاعات صلوٰۃ و تلاوت و اذکار بلکہ مباح افعال میں بھی اس کا تصور رکھے کہ یہ سب عنقریب حق تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے اس لیے ان میں کوئی ایسا اختیاری فعل نہ ہو کہ یہ پیشی کے قابل نہ رہے۔ بس اتنا تصور کافی ہے۔ ابتداً تو استحضار ضعیف ہو گا لیکن کوشش کے بعد ان شاء اللہ اس میں دوام اور پختگی آئے گی۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ”عَنْ قَابُوسِ بْنِ أَبِي ظَبْيَانَ، أَنَّ أَبَاهُ، حَدَّثَهُ قَالَ: قُلْنَا لِابْنِ عَبَّاسٍ: أَرَأَيْتَ قَوْلَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ (مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ)“ [الأحزاب: 4] مَا عَنِ بِيْذَلِكَ؟ قَالَ: ”قَامَ نَبِيُّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ مَا يُصَلِّي فَنَظَرَ حَظْرَةً، فَقَالَ الْمُنَافِقُونَ الَّذِينَ يُصَلُّونَ مَعَهُ: أَلَا تَرَى أَنَّ لَهُ قَلْبَيْنِ، قَلْبًا مَّعَكُمْ وَقَلْبًا مَّعَهُمْ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3199]

فَأَنْزَلَ اللَّهُ {مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ}“ [الأحزاب: 4]

ترجمہ: ”ابو ظبیان کہتے ہیں کہ ہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: ذرا بتائیں اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ﴾“ ”اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں“ کا کیا معنی و مطلب ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نبی اکرم ﷺ ایک دن نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ ﷺ کو کچھ خطرہ گزرا، آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے والے منافقین نے کہا: کیا تم دیکھتے نہیں ان کے دو دل ہیں ایک تم لوگوں کے ساتھ اور ایک اوروں کے ساتھ ہے۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ﴾ نازل فرمائی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ بات درست نہیں کہ کسی بھی چیز کا نماز میں خیال نہ آنا نماز میں خشوع کی شرط ہے۔ البتہ اپنے اختیار سے کسی لایعنی بات میں غور و فکر کرنا خشوع کے خلاف ہے۔ غرض خطرات اور وساوس کا لانا تو اختیاری ہے۔ پس نماز میں یہ خشوع کے خلاف ہو گا اور خطرات کا آنا غیر اختیاری ہے اس لیے اس سے نماز میں خشوع پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہر شخص صرف اتنے کا مکلف ہے کہ وہ نماز میں وساوس اور خیالات کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس میں چونکہ مشقت ہے اس لیے بعض دفعہ خطرہ والی نماز بے خطرہ والی نماز سے افضل و اکمل ہوتی ہے کہ خطرات کو دفع اور قلب کو جمع کرنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے جس کی وجہ یہی مشقت ہے۔ کیونکہ ایک مطلوب امر کے لیے ہے۔

غرض کمال توجہ کے منافی وہ وساوس و خیالات ہیں جو اختیاری ہوں۔ پھر اگر وہ وساوس اختیاریہ مباحات کے درجے کے ہیں تو ان سے گناہ تو نہ ہو گا۔ البتہ اس سے خشوع ناقص

ہو جائے گا اور اگر وہ تصورات حرام ہیں تو ان سے گناہ بھی ہوگا۔ چنانچہ نص میں وارد ہے:

﴿وَأَنْ تَبْذُرُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوا بِمَا نَسِبَ اللَّهُ بِهِ اللَّهُ﴾ [البقرہ: 284]

ترجمہ: ”اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں۔ خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا“ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوگا۔

لیکن حدیث سے تفسیر معلوم ہوئی کہ مراد وساوسِ اختیاریہ ہیں جو درجہ عزم میں ہوں

اور اس کے بعد ﴿لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرہ: 286]

ترجمہ: ”اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا“ اس

آیت نے بالکل صاف کر دیا کہ وسعت سے زیادہ پر مواخذہ نہیں اور وساوسِ اضطرابیہ

وسعت سے خارج ہیں۔ پس وساوسِ غیر اختیاریہ سے بالکل مطمئن رہیں۔ کیونکہ

شیطان ضابطہ سے کام کرتا ہے۔ جن سے گناہ بلا واسطہ نہیں کرا سکتا یعنی اتقیا سے، ان

کو وہ عبادت کے وقت وساوس میں مبتلا کرتا ہے اور اس طرح سے پریشان کرتا ہے۔

تاکہ وساوس سے گھبراکر یہ عبادت ترک کر دیں۔ مگر جو محقق ہیں وہ اس سے ہرگز

نہیں گھبراتے۔ وہ تو وساوس آنے کے وقت کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی

سب چالیں ختم ہو کر وسوسہ پر رہ گئیں، بلکہ وہ گھبرانے کی بجائے شیطان سے کہتے ہیں

کہ آجتنے وسوسے ڈال سکتا ہے ڈال لے، ہمارا کچھ نقصان نہیں۔ عام لوگ اس کے دفع

کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر محققین فرماتے ہیں کہ دفع کے قصد سے بھی اس کی طرف

توجہ نہ کریں، بلکہ جب وسوسہ آئے اس وقت مقصود کی طرف توجہ کی تجدید کریں اور

وسوسہ کے نہ لانے کا قصد کریں اور نہ دفعیہ کا کیونکہ دفع توجہ کے بغیر ہوگا نہیں۔ لہذا

دفع وسوسہ کا قصد کرنے سے اس کی طرف اور توجہ بڑھے گی۔ گھٹے گی نہیں۔ پھر جب

شیطان اس کو وسوسہ کی طرف متوجہ پائے گا تو وہ اور زیادہ وسوسے ڈالے گا۔

◆ ضرورتِ خشوع

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الْمَرِيَانِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنْ

الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ
فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَيْدٌ مِنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿16﴾ [الحمد: 16]

ترجمہ: ”جو لوگ ایمان لے آئے ہیں۔ کیا ان کے لیے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اتر رہے اس کے لیے پسج جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر ایک لمبی مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور (آج) ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں!“ یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آئیں۔ اس خشوع کے نہ ہونے پر کیسی وعید ہے۔ یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کر دیا ہے کہ ایسے نہ بنو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ترک خشوع کیسی بری چیز ہے کہ جس کے باعث آدمی کافروں سے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا کہ: ﴿فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ [الحمد: 16]

ترجمہ: ”ان کے دل سخت ہو گئے“ یہ قساوتِ قلبی ایسی بری چیز ہے کہ اس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے: ﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مَنْ ذَكَرِ اللَّهُ أَوْلِيَّكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ [الزمر: 22]

ترجمہ: ”بربادی ان کی ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہو چکے“ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ أْبَعَدَ النَّاسِ مِنَ اللَّهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2411]

ترجمہ: ”بے شک سب سے زیادہ دور اللہ سے قساوت والا دل ہے“ پس خشوع حاصل کرنے کی تاکید کرنا جیسا کہ آیت میں ہے اور (اس کی ضد یعنی) قساوت کی برائی کرنا جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہے۔ اس کے ضروری اور واجب ہونے کے لیے کھلی دلیل ہے۔ پس ہر ایک کے لیے لازم ہے کہ وہ دل میں خشوع پیدا کرے۔

اسبابِ خشوع

اگر صفتِ خشوع موجود ہے تب تو اس کے لیے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں ہے تو خود اس کے حاصل کرنے کے لیے چار اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے ظاہری آثار

یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے، بات چیت میں اور معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو، بدلہ لینے کی فکر میں نہ رہے۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرے اور آواز پست ہو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھایا جائے۔ یہ خوف پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی مناسب وقت تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی نافرمانی کی حالت اور پھر خداوند کریم کی نعمتیں سوچے کہ نافرمانی کے سبب کہیں یہ موقوف نہ ہو جائیں اور عذابِ آخرت اور قیامت کی ہولناک باتوں، پل صراط، میزان اور دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے تو ان شاء اللہ بہت فائدہ ہو گا۔ کیونکہ اس کو خوف کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خوف سے خشوع پیدا ہو گا۔

چوتھا سبب خشوع کے پیدا ہونے کا یہ ہے (اور یہ کتابوں وغیرہ سے بھی فراغت کے بعد ضروری ہے) کہ اگر ظاہری علم کے حاصل کرنے میں دس سال ختم کیے ہیں تو باطن کی درستی میں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کر دیجئے، یعنی کم از کم دس مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں خرچ کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجئے۔ خداوند کریم کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں۔

اعمال میں خشوع حاصل کرنے کا طریقہ

خشوع کے لیے عمل کی ابتدا میں توجہ کافی ہے۔ ہر ہر لفظ پر ضروری نہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے یہ خیال کریں کہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے تلاوت کرتا ہوں، یہ کافی ہے۔ ہر ہر حرف پر ایسی توجہ ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں یہ قید بھی ہے کہ جب تک اس کی مخالف بات کی طرف توجہ نہ ہو اس وقت تک اسی پہلے توجہ کو حکماً باقی سمجھا جائے گا۔ جیسا کہ انسان چلنے سے پہلے یہ ارادہ دل میں کر لے کہ جامع مسجد کی طرف چلتا ہوں۔ بس اتنا کافی ہے۔ ہر ہر قدم پر یہ ارادہ ضروری نہیں۔ ورنہ چلنا دشوار ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی دوسری جانب ایسی توجہ جو اس

توجہ کے خلاف ہو، پائی جائے، تو پھر پہلی توجہ ختم سمجھ کر نئے سرے سے اپنے ارادے کی تجدید کی جائے گی۔

طبیعت کو مجبور کرنے سے اعمال مثلاً نماز میں خشوع حاصل ہوتا ہے اور انسان اسی کا مکلف ہے۔ طبیعت کو مجبور کرنا مجاہدہ ہوتا ہے اور مجاہدے کے ساتھ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک بغیر مجاہدے کے عمل سے افضل ہے۔ جو زیادہ مفید ہے۔ اگر غفلت سے ادھر ادھر کے پریشان خیالات موجود ہوں تو پھر بہ تکلف نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور یہی مجاہدہ جاری رہے گا۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہونے لگے تو یہ مطلوب نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ”وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 1898]

ترجمہ: ”جو شخص قرآن شریف پڑھنے میں رکتا ہے اور اس پر دشوار بھی ہے۔ تو اس کو دو ہر اواب ہوگا“ (یعنی ایک ثواب تو پڑھنے کا اور دوسرا محنت اور مجاہدہ کا۔) اس سے ان لوگوں کی پریشانی دور ہونی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوشش سے نماز میں خشوع قائم رکھنا ہوتا ہے۔ ہمیں خود بخود خشوع حاصل نہیں ہے۔

خشوع کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ

پہلا طریقہ یہ ہے کہ بچتہ حافظوں کی طرح نہ پڑھا کریں بلکہ ایسے ناظرہ خواں یا حافظ کی طرح پڑھیں جس کا قرآن کچا ہو۔ تو جس طرح ایسا ناظرہ خواں یا حافظ ہر لفظ کو دیکھ کر یا سوچ کر ادا کرتا ہے اور لفظ لفظ پر دھیان کر کے پڑھتا ہے۔ اسی طرح نماز میں ہر ہر لفظ پر مستقل توجہ اور ارادہ کیا کریں اور جو قول و فعل نماز میں صادر ہو وہ توجہ اور قصد سے ہونا چاہیے۔ محض مشق اور یاد سے نہ ہو مثلاً زبان سے ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ“ کہا تو اس کی طرف مستقل توجہ ہو کہ میں زبان سے کہہ رہا ہوں۔ پھر ”وَبِحَمْدِكَ“ کہا تو اسی طرح اس کی طرف توجہ اور قصد ہو۔ اسی طرح آخر نماز تک۔ پس اس طرح کرنے سے برابر پوری نماز میں توجہ طاعت کی طرف رہے گی اور ایک طرف جب توجہ ہوتی ہے تو دوسری طرف نہیں ہوتی۔ لہذا یقیناً اس سے غیر صلوات کی طرف توجہ نہ ہوگی اور

حضورِ کامل میسر ہو گا اور حضور کے لیے اعضا کو مطلوبہ حالت میں رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ چہرہ پھیرنے سے نظر جب بھٹکے گی تو خیالات منتشر ہوں گے۔

◆ آسان طریقہ

یہ تصور رکھیں کہ میں خداوند کریم کے سامنے ہوں اور خداوند کریم سن اور دیکھ رہے ہیں۔ لقاء رب اور رجوع الی اللہ کا استحضار کریں۔ اس طریقے سے خشوع جلد حاصل ہو جائے گا۔

2.22.1.1... تبلیغ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: 104]

ترجمہ: ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں“ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ“ [سنن ابن ماجہ: 4004]

ترجمہ: ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو“

◆ تبلیغ کی حقیقت

امر بالمعروف یقیناً واجب ہے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے اور یہ حکم سب کو عام ہے۔ مگر اس میں ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اس کی دو قسمیں ہیں ایک خطابِ عام اور دوسرا خطابِ خاص۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے۔ یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتی اور امر بالمعروف (تبلیغ) عام ہے۔ یعنی وعظ کہنا سب کے ذمہ فرض نہیں ہے۔ بلکہ صرف علما پر واجب ہے۔ مسلمین مگر عوام مسلمین کے ذمہ سفر خرچ و دیگر اسباب کا مہیا کرنا ہے۔ امر بالمعروف کا مدار قدرت پر ہے۔ یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ اتنی تبلیغ واجب ہے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز، روزہ اور دیگر ضروریات دین کی نصیحت کریں۔ خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کو احکام

شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کے لیے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جوان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث شریف میں ہے: ”مُرُوا صَبِيَانَكُمْ بِالصَّلَاةِ، إِذَا بَلَغُوا سَبْعًا وَآخِرَ نِيَّوَهُمْ إِذَا بَلَغُوا عَشْرًا“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 6689]

ترجمہ: ”تم اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا امر کرو جب کہ ان کی عمر سات سال ہو اور دس سال کی عمر میں مار کر پڑھاؤ“ غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو امورِ خیر کا حکم کرے اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿الَّذِينَ اَنْ مَكَتَهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَامْرَاٍ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [النُّج: 41]

ترجمہ: ”یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں اور برائی سے روکیں“

ان سب کا نچوڑ یہ ہوا کہ جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر قادر ہے یعنی قرآن سے غالب گمان رکھتا ہو کہ اگر امر و نہی کروں گا تو مجھ کو کوئی قابلِ اعتبار نقصان لاحق نہیں ہوگا۔ اس کے لیے امورِ واجبہ میں امر و نہی کرنا واجب ہوگا اور امورِ مستحبہ میں مستحب۔ مثلاً نماز پینگانہ فرض ہے۔ ایسے شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے اور نوافل مستحب ہیں ان کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا۔ جو شخص کسی وجہ سے تبلیغ پر قادر نہ ہو، اس پر امورِ واجبہ میں بھی تبلیغ کرنا واجب نہیں۔ اس کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ تارکِ امورِ واجبہ کو دل سے برا سمجھے۔ البتہ اگر ہمت کرے گا تو ثواب ملے گا۔ پھر جس پر تبلیغ واجب ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ہاتھ سے قدرت ہے تو ہاتھ سے تبلیغ واجب ہے اور اگر زبان سے قدرت ہے تو زبان سے تبلیغ واجب ہے۔

ہاتھ سے تبلیغ کی اجازت صرف حکام کو ہے عوام کو نہیں۔ کیونکہ اس میں فتنہ کا احتمال ہے۔ پس اس سے فساد ہو سکتا ہے۔ جبکہ تبلیغ کا مقصد اصلاح ہے فساد نہیں۔

لیکن حکومت کی بھی قسمیں ہیں۔ باپ کو بیٹے پر اور شوہر کو بیوی پر حکومت حاصل ہے۔ اس لیے یہاں اگر ہاتھ سے تبلیغ ممکن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ترمذی شریف میں حدیث ہے: ”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أُولَئِكَ سَكَنَ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهُ فَلَا يَسْتَجَابُ لَكُمْ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2169]

ترجمہ: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم معروف (بھلائی) کا حکم دو اور منکر (برائی) سے روکو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے پھر تم اللہ سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔“ نیز ابو داؤد شریف کی روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوْا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَنْ يَعْتَهُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ“ [سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: 4338]

ترجمہ: ”جب لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی ظلم نہ روک دیں) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا عذاب لوگوں پر عام کر دے“

◆ تبلیغ کے آداب اور شرائط

- (1) جس چیز کی تبلیغ کرنی ہو اس کے احکامات تفصیل سے معلوم ہوں۔
- (2) اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے نصیحت نہ ہو بلکہ اس سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔
- (3) نصیحت کرتے ہوئے طریقہ مشفقانہ ہو۔
- (4) تبلیغ کے وقت صرف تبلیغ ہی کو مقصود سمجھے۔ ثمرات پر نظر نہ رکھے کیونکہ ان کا حصول غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری میں کاوش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔
- (5) وعظ میں کسی کو نشانہ نہ بنائے بلکہ سب کو مخاطب کرے۔
- (6) واعظ ہدایا وغیرہ لینے سے اجتناب کرے تاکہ بے لوث رہے۔ اس سے کام میں برکت ہوتی ہے۔

7) کسی بھی شخص کی مجمع عام میں اصلاح نہ کی جائے۔ کیونکہ اس سے اس کو واعظ سے بغض ہو سکتا ہے جس سے وہ ضد میں آکر مزید بگڑ سکتا ہے۔

8) واعظ کے لیے سختی اور درشتی کا طریقہ مناسب نہیں۔ بلکہ جتنی شفقت اور نرمی ہوگی فائدہ ہوگا۔ اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے۔ طاقت نہ ہو تو خطابِ خاص کی بجائے صرف خطابِ عام پر اکتفا کرے۔

◆ تبلیغ کا طریقہ

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيِّ

هِيَ أَحْسَنُ﴾ [النحل: 125]

ترجمہ: ”اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو“

سبیلِ رب سے مراد اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے جو کہ از روئے حدیث شریف صرف اسلام ہے۔ پس اس کی طرف بلانے کا آپ ﷺ کو حکم ہوا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں بتائی ہیں۔

1) حکمت کے ساتھ دعوت۔

2) دعوت بالموعظۃ الحسنہ۔

3) اچھے طریقے سے مجادلہ۔

گفتگو میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک اپنے دعویٰ پر دلائل قائم کرنا اور دوسرا مخاطب کے دلائل کا توڑ اور ابطال۔ پہلے کو دعوت بال حکمت کہیں گے اور دوسرے کو مجادلہ۔ اب ایک توضیح کے طور پر بتانا ہے جیسا کہ ڈھنڈورچی بادشاہ وقت کا حکم لوگوں تک پہنچاتا ہے کہ اس کا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ کون اس پر عمل کرتا ہے اور کون نہیں کرتا اور ایک باپ کا بیٹے کو سمجھانا ہے کہ اس میں غایت شفقت ہوتی ہے اور ایسے طریقے سے بات کی جاتی ہے کہ بیٹا کسی طریقے سے مان لے۔ اس کے لیے چاہے اس کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑے لیکن اس کو سمجھا کر چھوڑتا ہے۔ کیونکہ باپ اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا بیٹا خیر سے محروم ہو جائے۔ یہی موعظۃ الحسنہ کا اصل مطلب ہے کہ

واعظ ایسے طریقے سے بات کرے کہ مخاطبین کا دل پگھل جائے اور وہ عمل کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس میں واعظ صرف ضابطے کی خانہ پری نہیں کرتا۔ یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”موعظہ حسنة“ کا ربانی ارشاد ہوا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تمام زندگی اس پر عمل کرنے کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تمام زندگی اس طرح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے لیے ہر واعظ کو عافیت کے ساتھ لمبی عمر، صحیح فہم اور صحیح نیت نصیب فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حاصل کرنے کا طریقہ

فضائل تبلیغ اور اس کے چھوڑنے کے مواعید میں غور کرنا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے مانگنا اس کا طریقہ ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے سرفراز کیا ہو ان کی مجالس میں شرکت بھی اس کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

◆ ہماری تبلیغی جماعت

موجودہ تبلیغی جماعت چونکہ اہل حق کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے اور اس کے لیے اہل خیر نے بہت دعائیں کی ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، تاہم جیسا کہ انبیاء کے تشریف لے جانے کے بعد ان کے ماننے والوں نے انبیاء کی تعلیم کی جب حفاظت نہیں کی تو گمراہ ہو گئے۔ اس لیے جو اصول اکابر چھوڑ چکے ہیں ان پر جب تک ہم قائم رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ شامل حال رہے گی اور اگر ان پر عمل چھوڑ دیں تو پھر خطرہ ہے کہ خیر ہم سے اٹھ نہ جائے۔ اس لیے ہمیں اپنی جماعت میں مندرجہ ذیل کمزوریوں کی اصلاح کا جلد سے جلد بندوبست کرنا چاہیے۔

- 1) علمائے حق کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ نہ ہو بلکہ ہمیں اپنے آپ کو ان کا خادم سمجھنا چاہیے اور جو کچھ ہم کسی سے سنیں تو ان سے اس کی تصدیق کرواتے رہیں کہ وہ ٹھیک ہے یا غلط۔ تاکہ کہیں نا صحیحی سے ہم غلط باتوں کی تشہیر نہ کر رہے ہوں۔
- 2) ہمارے اکابر یعنی مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی فکر تھی کہ

ہمیں اپنے مشائخ کے ساتھ اپنی انفرادی اصلاح کے لیے تعلق رکھنا چاہیے اور ان سے اپنی اصلاح کروانی چاہیے کیونکہ اپنی اصلاح فرضِ عین ہے اور دوسروں کی اصلاح فرضِ کفایہ۔

(3) صرف اپنی جماعت کو خیر پر نہ سمجھیں بلکہ اہل حق کے جتنے کام ہیں ان سب کو حق پر سمجھتے ہوئے اپنا کام سمجھیں اور ان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ توڑ نہ ہو بلکہ ان کے لیے دل سے دعائیں کریں۔

(4) جو فضائل دین کے دوسرے کاموں کے لیے احادیثِ شریفہ میں وارد ہوں اور جماعت کے اکابر نے تاویل کے ساتھ ان کو تبلیغ کے کسی جزو کے لیے ثابت کیے ہوں تو ان کو بیان تو بے شک کیا جائے لیکن جن کاموں کے لیے یہ اصلاً ثابت ہوں ان سے ہم کسی طرح انکار نہ کریں کیونکہ یہ حدیثِ شریفہ کی معنوی تحریف میں آسکتا ہے جس سے ہم حق سے دور جاسکتے ہیں۔

مثلاً ہم اگر ایک دن اور ایک رات تبلیغ میں لگانے والے کے لیے یہ اجر بتاتے ہیں کہ اس کا اتنا اجر ہے کہ یہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔ یہ فضیلتِ اصل میں اس حدیثِ شریفہ سے لی گئی ہے جو جہاد کی فضیلت میں انس بن مالک سے مروی ہے: "كَعْدَوَْةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا" [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 2639]

ترجمہ: "اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے ایک صبح یا ایک شام سفر کرنا دنیا اور جو کچھ اس میں ہے۔ سے بڑھ کر ہے" اس کے لیے ہمارے بڑوں نے تبلیغ میں وقت لگانے کو پہلے جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا۔ پھر اس میں ایک دن اور ایک رات لگانے کو جہاد میں پہرہ دینے کا مشابہ قرار دیا اور پھر اس پر اس فضیلت کو قیاس کیا۔ یہاں پر اس قیاس کی نفی مراد ہرگز نہیں۔ اس پر قیاس کرنا ممکن ہے تبھی اکابر نے ایسا کیا ہے۔ کیونکہ فضیلت کے لیے ضعیف استدلال بھی کافی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس فضیلت کا اصلی جہاد فی سبیل اللہ میں پہرہ دینے کے لیے ہونے سے ہم نے انکار کیا تو یہ بلاشبہ اس حدیثِ شریفہ کی معنوی تحریف قرار پائے گی۔ اس طرح ہمارے ساتھی جب گشت میں چلنے والے حضرات کے

لیے یہ فضیلت بیان کرتے ہیں کہ گشت میں جانے والوں کے راستے میں فرشتے پر بچھاتے ہیں۔ اس فضیلت کی اصل وہ حدیث شریف ہے جس میں طالب علم کے راستے میں فرشتوں کے پر بچھانے کی فضیلت مذکور ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَصْعُقُ أَجْنَاحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَا يَطْلُبُ" [مسند احمد، حدیث نمبر: 18095]

ترجمہ: "اور فرشتے طالب علم سے خوش ہو کر اس کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں" اس طرح ہمارے ساتھی اپنے بیان کے لیے جمع ہونے والوں کے لیے اس فضیلت کو ثابت کرتے ہیں جس میں ذکر کرنے والوں کے بارے میں ذکر ہے کہ ان کے ارد گرد فرشتے جمع ہوتے ہیں اور وہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے والے بھی محروم نہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"إِنَّ لِلَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى مَلَائِكَةً سَيَّارَةً فَضُلًّا يَتَتَبِعُونَ مَجَالِسَ الذِّكْرِ فَإِذَا وَجَدُوا مَجْلِسًا فِيهِ ذِكْرٌ قَعَدُوا مَعَهُمْ وَحَفَّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِأَجْنِحَتِهِمْ حَتَّى يَمْلَأُوا مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَإِذَا تَفَرَّقُوا عَرَجُوا وَصَعِدُوا إِلَى السَّمَاءِ - قَالَ: فَيَسْأَلُهُمُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ (وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ) مِنْ أَيْنَ جِئْتُمْ؟ فَيَقُولُونَ: جِئْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادِكَ فِي الْأَرْضِ يُسْأَلُونَكَ وَيُكَبِّرُونَكَ وَيُهَلِّلُونَكَ وَيَحْمَدُونَكَ وَيَسْأَلُونَكَ - قَالَ وَمَاذَا يَسْأَلُونَ نَبِيَّ؟ قَالُوا: يَسْأَلُونَكَ جَنَّتِكَ. قَالَ: وَهَلْ رَأَوْا جَنَّتِي؟ قَالُوا: لَا أُمِّي رَبِّ. قَالَ: فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْا جَنَّتِي؟ قَالُوا: وَيَسْتَحِيرُونَكَ. قَالَ: وَمِمَّ يَسْتَحِيرُونَ نَبِيَّ؟ قَالُوا: مِنْ نَارِكَ يَا رَبِّ. قَالَ: وَهَلْ رَأَوْا نَارِيَّ؟ قَالُوا: لَا. قَالَ: فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْا نَارِيَّ؟ قَالُوا: وَيَسْتَغْفِرُونَكَ. قَالَ: فَيَقُولُ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ فَأَعْطَيْتُهُمْ مَا سَأَلُوا وَأَجْرْتُهُمْ مِمَّا اسْتَجَارُوا - قَالَ: فَيَقُولُونَ رَبِّ فِيهِمْ فَلَا نَ عِبْدٌ خَطَاةٌ إِنَّمَا مَرَّ جَلَسَ مَعَهُمْ - قَالَ فَيَقُولُ وَلَهُ غَفَرْتُ، هُمْ الْقَوْمُ لَا يَشْتَقِي بِهِمْ جَلِيسُهُمْ" [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7015]

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں جو (اللہ کی زمین میں) چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ اللہ کے ذکر کی مجلسیں تلاش کرتے ہیں۔ جب وہ کوئی ایسی مجلس پاتے ہیں جس میں (اللہ کا) ذکر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے پروں سے اس طرح ڈھانپ لیتے ہیں کہ اپنے اور دنیا کے آسمان کے درمیان (کی وسعت کو) بھر دیتے ہیں۔ جب (مجلس میں شریک ہونے والے) لوگ منتشر ہو جاتے ہیں تو یہ (فرشتے) بھی اوپر کی طرف جاتے ہیں اور آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ کہا: تو اللہ عزوجل ان سے پوچھتا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والا ہے: تم کہاں سے آئے ہو؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں (رہنے والے) تیرے بندوں کی طرف سے (ہو کر) آئے ہیں جو تیری پاکیزگی بیان کر رہے تھے، تیری بڑائی کہہ رہے تھے اور صرف اور صرف تیرے ہی معبود ہونے کا اقرار کر رہے تھے اور تیری حمد و ثنا کر رہے تھے اور تجھی سے مانگ رہے تھے، فرمایا: وہ مجھ سے کیا مانگ رہے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ آپ سے آپ کی جنت مانگ رہے تھے۔ فرمایا: کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے؟ انہوں نے کہا: پروردگار! (انہوں نے) نہیں (دیکھی) فرمایا: اگر انہوں نے میری جنت دیکھی ہوتی کیا ہوتا؟ (کس الحاح و زاری سے مانگتے؟) وہ کہتے ہیں: اور وہ تیری پناہ مانگ رہے تھے۔ فرمایا: وہ کس چیز سے میری پناہ مانگ رہے تھے؟ انہوں نے کہا: تیری آگ (جہنم) سے۔ اے رب! فرمایا: کیا انہوں نے میری آگ (جہنم) دیکھی ہے؟ انہوں نے کہا: اے رب! نہیں (دیکھی) فرمایا: اگر وہ میری جہنم دیکھ لیتے تو (ان کا کیا حال ہوتا؟) وہ کہتے ہیں: وہ تجھ سے گناہوں کی بخشش مانگ رہے تھے، تو وہ فرماتا ہے: میں نے ان کے گناہ بخش دیے اور انہوں نے جو مانگا میں نے انہیں عطا کر دیا اور انہوں نے جس سے پناہ مانگی میں نے انہیں پناہ دے دی۔ (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: وہ (فرشتے) کہتے ہیں: پروردگار! ان میں فلاں شخص بھی موجود تھا۔ سخت گناہ گار بندہ، وہاں سے گزرتے ہوئے ان کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ (آپ ﷺ نے) فرمایا: تو اللہ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اس کو بھی بخش دیا۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کے ساتھ بیٹھ جانے والا بھی محروم نہیں رہتا“

توبیان کے لیے اس فضیلت کو بیان کرنا جائز ہے۔ لیکن ذکر کے حلقوں سے اس کی اگر ہم نفی کریں تو یہ حدیث شریف کی معنوی تحریف کے زمرے میں آئے گا۔

1.1.2.23... تفکر

”إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ“ [المحل: 69]

ترجمہ: ”یقیناً ان سب باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سوچتے سمجھتے ہوں“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”فَأَيُّكُمْ مَا يَتَّقِي عَلَى مَا يُفْنَى“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 19698]

ترجمہ: ”پس باقی رہنے والی چیزوں کو فانی چیزوں پر ترجیح دو۔“

◆ حقیقتِ فکر

دو معلوم چیزوں کو ذہن میں حاضر کر کے اس سے تیسری بات اخذ کرنا تفکر کہلاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آخرت باقی ہے اور دنیا فانی ہے۔ اس سے یہ بات ذہن میں آئی کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقَعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا

سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: 190-191]

ترجمہ: ”بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔ (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں۔ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے“

ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ سے یہ بالکل واضح ہوتا ہے کہ مخلوقات اور

مختلف واقعات میں غور کر کے اس سے صحیح نتیجے تک پہنچنے کا کام لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور آخرت کے یقینی ہونے کا ادراک کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بخشش طلب کرنی چاہیے۔ ان فانی نعمتوں کی ان باقی نعمتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں ان باقی نعمتوں کی طلب میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مانگنا تو سب کچھ اللہ سے ہی ہے کہ وہی کارساز ہے۔ اس لیے اس دنیا کی ضروریات بھی اللہ سے ہی مانگنی چاہئیں۔ یہاں اس سے مطلب صرف یہ ہے کہ باقی کو فانی پر ترجیح دینی چاہیے۔ آپ ﷺ اسی لیے دائم الفکر رہتے تھے اور آپ ﷺ کا کمال درجے کا ہنسنا تبسم ہوتا تھا۔ کبھی بھی کھل کر نہ ہنستے تھے اور یہ بھی آپ ﷺ کا ہی حوصلہ تھا ورنہ جو احوال شدیدہ آپ ﷺ کے سامنے تھے ان کی وجہ سے تو شاید تبسم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ”تَوَتَعَلَّمُونَ مَا أَعَلَّمَهُ لَضِحَّتُمْ قَلِيلًا وَلَكَيْتُمْ كَثِيرًا“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4345]

ترجمہ: ”مجھے جو معلوم ہے اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا کرتے۔“

◆ تفکر کی ضرورت

”عَنْ عَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِلَّا لَا خَيْرَ فِي قِرَاءَةِ لَيْسَ فِيهَا تَدَبُّرٌ، وَلَا عِبَادَةٌ لَيْسَ فِيهَا فَهْمٌ“ [جامع الأصول فی أحاديث الرسول، حدیث نمبر: 8478]

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: (معتد بہ) نفع نہیں ایسے قرآن مجید پڑھنے میں جس میں فکر نہ ہو اور ایسی عبادت میں جس میں معرفت نہ ہو“ صوفیا کے طریق کا مدارِ اعظم یہی فکر ہے۔ لہذا خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اکابر کو بھی اپنے حال سے فارغ نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اپنا محاسبہ کر کے تغیر حال کی فکر کرنی چاہیے۔ فکر کی وجہ سے راستے خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں۔ سوچنے کی مثال حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گھڑی کی بال کمانی سے دی ہے کہ ہے تو مختصر سی لیکن تمام پرزوں کی حرکت اسی سے ہوتی ہے۔ اس طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہوتے ہیں۔ سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔

ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾ [البقرہ: 219]

ترجمہ: ”اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لیے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔“

اہل اللہ نے دنیا کی حقیقت میں فکر کر کے ہی آخرت کی حقیقت کو سمجھا ہے۔ اس لیے دنیا سے نفرت کرتے ہیں۔

◆ فکر کا طریقہ

نورِ ایمان (یعنی جن پر ایمان ہے) ان پر یقین کو کامل کرنے کا طریقہ ذکر و فکر ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ [الحشر: 18]

ترجمہ: ”اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے“ یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے کہ آج دن میں کتنے نیک کام کیے۔ جو نیک کام ہوئے ہیں ان پر خدا کا شکر کرے اور جو گناہ ہوئے ان پر توبہ استغفار کرے۔ جو بات کہے سوچ کر کہے اور جو کام کرے پہلے سے اس کا انجام سوچ لے۔ مراقبات کر کے بالخصوص مراقبہ موت اور اگر موت کی سوچ سے دل گھبرائے تو پھر مراقبہ حیات یعنی آخرت کی حیات کا مراقبہ کرے کہ وہاں کیسی کیسی لذتیں ہیں اور ان لذتوں کے حصول کا طریقہ یہ کہ ہم اللہ کو راضی کریں اور اس کی ناراضگی سے بچیں۔ اس سے اعمال کی لالچ پیدا ہوگی اور اعمال کی توفیق نصیب ہوگی۔

◆ حاصل کرنے کا طریقہ

دونوں چیزوں یعنی آخرت اور دنیا کی حقیقت کا ذہن میں رکھ کر اس میں غور کرنا ہی اس کا طریقہ ہے۔

1.1.2.24... تقویٰ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبہ: 119]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو“ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”التَّقْوَى هُنَا يُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ“ [شعب الایمان للسیوطی، حدیث نمبر: 6660]

ترجمہ: ”تقویٰ اس جگہ ہے اور آپ ﷺ نے اپنے قلب کی طرف تین بار اشارہ کیا۔“

◆ حقیقتِ تقویٰ

قرآن مجید میں جس قدر تقویٰ کا حکم اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔ غالباً کسی اور چیز کا اتنا ذکر نہیں ہے۔ اس سے اس کا مہتمم بالشان ہونا معلوم ہوا ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک ڈرنا دوسرا بچنا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو معاصی سے بچنا ہی ہے مگر سبب اس کا ڈرنا ہی ہے۔ کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے تو اس سے بچا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اول جب ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقْوَاهُ﴾ [آل عمران: 102]

ترجمہ: ”اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے“ کا نزول ہوا تو اس سے صحابہ کرام ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی حق تقویٰ لازم ہو گیا، حالانکہ شروع ہی سے تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔ حق تقویٰ کا معنی ایک تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق جیسا تقویٰ ہے وہ اختیار کرو۔ سو آیت میں یہ مراد نہیں۔ کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور جو چیز تحمل سے باہر ہو، اللہ تعالیٰ اس کا کسی کو مکلف نہیں بناتا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے۔ اس لیے صحابہ کرام نے اس آیت کو اس کے فوری حصول کا حکم سمجھا اور پھر یہ خوف ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی سے حاصل ہونا تو بڑا دشوار ہے۔ پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: 16]

ترجمہ: ”لہذا جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو“ یعنی جتنا تقویٰ تم سے

اس وقت ہو سکتا ہے اس وقت تو اس کو اختیار کرو، پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جائے۔ اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی۔

تقویٰ کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ کفر اور شرک سے بچے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے، پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے گا اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ درجہ احسان حاصل ہو جائے گا جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالسَّلَامَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [البقرہ: 177]

ترجمہ: ”نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سانکوں کو دیں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب کوئی عہد کر لیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں اور تنگی اور تکلیف میں نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں“

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تقویٰ کے سارے شعبوں کو جمع فرمایا ہے۔ اس میں بالکل ابتدا میں یہ فرمایا کہ دین سارے کا سارا صرف اس میں نہیں کہ نماز میں کس سمت کو منہ کرنا ہے۔ بلکہ یہ تو اس کا ایک جزو ہے جس کا تعلق نماز کے ساتھ ہے۔ ورنہ

اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔ اس کے بعد باقی تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، آسمانی کتابوں اور تمام انبیاء پر ایمان کا حکم ہے۔ یہ تو عقائد کے متعلق ہے پھر اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال کو مستحق لوگوں پر خرچ کرنے کا فرمایا جس سے حُبِ مال کا علاج انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ دل کی اصلاح کے متعلق ہے۔ پھر نماز کو قائم کرنے کا امر ہے جو بدنی اطاعت ہے۔ پھر زکوٰۃ دینے کا ہے جو مالی اطاعت ہے۔ اس کے بعد وعدے کو پورا کرنے کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے۔ غرض اس میں تمام تقویٰ کے شعبوں کو اجمالاً جمع کر دیا ہے۔ اسی لیے ”أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“ پر اس کو ختم کر دیا ہے۔

◆ اعمال تین قسم کے ہیں

ایک وہ جو دین میں نافع ہیں۔ ان کو تو کرنے کا حکم ہے چاہے فرض ہوں یا واجب کے درجہ میں ہوں یا سنت کے درجہ میں اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں۔ ان کو چھوڑنے کا حکم ہے خواہ حرام کے درجہ میں ہوں یا مکروہ کے درجہ میں اور بعض وہ ہیں جن کے کرنے کا حکم ہے ناچھوڑنے کا، یہ مباحات ہوتے ہیں۔ مباحات اپنے اثر کے لحاظ سے یا تو وہ دین کے لیے مفید ہیں جیسے حفظانِ صحت کے لیے چلنا پھرنا وغیرہ۔ یا مفید نہیں ہیں۔ پس جو دین میں مفید ہیں ان کو تو کرنا چاہیے گو کہ یہ واجب نہیں ہوں گے۔ البتہ مباح جب دین میں مفید ہو اور اس کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ مستحب ضرور ہوتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے اور وہ مباحات جو دین میں مفید نہیں ہیں وہ فضول ہیں اور فضولیات کا ترک کر دینا شرعاً مطلوب ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ”مِنْ

حُسْنِ إِسْلَامٍ الْمَرْءُ تَرَكُهُ مَا لَا يَغْنِيهِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2317]

ترجمہ: ”کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے“ جب فضولیات کے ترک کو حسنِ اسلام میں دخل ہے اور حسنِ اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہو گیا۔ گو ان کو حرام نہیں کہا جائے گا

لیکن فضولیات میں مشغولی کراہت سے خالی نہیں ہوگی پس جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ غرض یہ ہے کہ بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا ہے اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی برا ہے۔

بعض لوگ اسلام سے پہلے احرام حج میں اگر کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تو دروازے سے جانا ممنوع سمجھتے تھے اس لیے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس سے اندر جاتے تھے اور اس عمل کو فضیلت گردانتے تھے۔ حق تعالیٰ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْمُبْتُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأَتُوا الْمُبْتُوتَ مِنْ أَسْبَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [البقرہ: 189]

ترجمہ: ”اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو“

اس آیت سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوئی کہ جو شے شرعاً مباح ہو اس کو طاعت و عبادت اعتقاد کر لینا یا اس کو معصیت اور محل ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً قابل مذمت ہے۔ چنانچہ گھروں میں دروازوں سے آنا مباح تھا اس کو ان لوگوں نے معصیت سمجھا تھا اور دروازہ چھوڑ کر کسی اور طرف سے آنا بھی فی نفسہ مباح ہے اس کو ان لوگوں نے عبادت و فضیلت سمجھا تھا۔ اس پر حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور ان کے اعتقاد کو باطل اور مخالف تقویٰ کے ٹھہرایا اور تقویٰ کو واجب فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز سے واجب کا ترک اور خلاف لازم آئے گا وہ ضرور گناہ ہوگی۔ پس ان کے یہ دونوں اعتقاد گناہ ہوئے۔ اس قاعدہ سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا جو کہ عوام بلکہ خواص میں بھی شائع ہیں۔ نیز خیال رہے کہ ہر شے اور اعضا کا تقویٰ ہے۔ آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ بری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے۔ زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، کسی کو ستائے نہیں۔ اسی طرح ہاتھ کا تقویٰ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے، شہوت سے مس نہ کرے۔ پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ چل

کرنہ جائے۔ کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے، راگ باجے سے بچے۔ وضع میں بھی تقویٰ ہے کہ خلاف شریعت وضع نہ رکھے۔ پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں جو مذکور ہوئے اور ان اوصاف میں تمام اجزائے دین کا ذکر اجمالاً آگیا۔ دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ متقی وہی ہے جو دین میں کامل ہو، ظاہر میں بھی باطن میں بھی۔ لیکن یہ حاصل دل کے ایک عمل سے ہوتا ہے جو کہ اللہ سے ڈر ہے کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔

◆ حاصل کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا کی جائے اور پھر یہ سوچا جائے کہ میرا کوئی قول اور فعل اس کو ناپسند تو نہیں۔ یا یہ سوچے کہ کیا میں اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہو سکتا ہوں۔ پس جس جس چیز میں کوئی مسئلہ محسوس ہو اگر ظاہر سے متعلق ہو تو علمائے کرام سے اس کی تحقیق کرے اور اگر باطن سے متعلق ہے تو اپنے شیخ سے یا جس کو اپنے باطن کا راہبر بنایا ہے اس سے پوچھے۔ اللہ تعالیٰ کے قہر و عتاب کی آیتیں پڑھ کر ان چیزوں سے بچنا چاہیے جو اس عتاب کی وجہ بن سکتی ہیں۔ اہل تقویٰ کی صحبت اس میں اکسیر کا کام دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی تقویٰ نصیب فرمائے۔

••*•*•*

1.2... اعمال کے ثمرات (نتائج)

(1) بندے کی طرف سے: عبدیتِ کاملہ

(2) اللہ تعالیٰ کی طرف سے: رضائے الہی

یہی نسبت مع اللہ کے حاصل ہونے کی علامات بھی ہیں۔ کیونکہ نسبت کے معنی تعلق کے ہیں اور تعلق دو جانب سے ہوتا ہے اور یہ نسبت مع اللہ دو باتوں پر مشتمل ہوتی ہے: بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جو کہ عبدیتِ کاملہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلق بندے کے ساتھ جو کہ رضائے الہی ہے۔ حصولِ نسبت مع اللہ کو وصولِ الی اللہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بندے کے ساتھ تعلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق بندے کے ساتھ رضا کا ہو اور بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دوامِ طاعت، کثرتِ ذکر مع ملکہِ یادداشت ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ طاعات و عبادات کی طرف ایک اضطرابی رغبت ہوتی ہے اور معصیتِ ظاہری و باطنی سے ایسی نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانہ سے ہوتی ہے اور اتباعِ سنت کا باکمال اہتمام ہو۔

اب ان دونوں کی قدرے تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

1.2.1... عبدیتِ کاملہ

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات: 56]

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں“ اس آیت کی تفسیر حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ جو مفسرِ قرآن حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں سے یہ منقول

ہے: ”أَمْ لِيَعْرِفُونُ“ [البحر المحیط فی التفسیر، ج 9، ص 562]

ترجمہ: ”تا کہ مجھے پہچانیں“ پہچاننے میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی جان لے کہ اللہ تعالیٰ کس کام سے راضی ہوتے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کے لیے ایک ہی راستہ بتایا ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنا ہے۔ ہم کلمہ شہادت میں اقرار کرتے

ہیں کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ پس آپ ﷺ کی پیروی میں ہم سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اسی کو بندگی کہتے ہیں جس کو عبدیت بھی کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص سلوک میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت اس کے ساتھ رذائل لگے ہوتے ہیں۔ ان رذائل کو دور کرنے کے لیے وہ مجاہدات کرتا ہے۔ ریاضتیں کرتا ہے۔ شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ کرتے کرتے رذائل دور ہو جاتے ہیں یا ان کے دور ہونے کے سامان ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ سالک اپنے قلب کو فضائل سے آراستہ کرتا رہتا ہے جس کے لیے ذکر، شغل اور مراقبہ جاری ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ وقت آپہنچتا ہے کہ اس کے قلب میں ایک ایسی کیفیت القا کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے غیر مشروط طور پر سلامی ہو جاتا ہے اور نفس کی جو کجی اس حقیقت کے سمجھنے میں رکاوٹ تھی، وہ نہیں رہتی اور یہ اپنے منور قلب کے نور سے اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ میں بندہ ضعیف اللہ تعالیٰ کا محض بندہ ہوں اور وہ میرا عظیم رب ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ میرے اندر جو تصرف کرنا چاہے کرے۔ مجھے چوں چرا کرنے کا اختیار نہیں۔ کیونکہ میں غلام ہوں اور وہ میرا مالک ہے۔ میں نہ صرف اس کا غلام ہوں بلکہ اس کا عاشق بھی ہوں، کیونکہ وہی میرا ازلی محسن ہے۔ ایسا کمال والا اور جمال والا ہے کہ ہر کمال والے کا کمال اس کے کمال سے اور ہر جمال والے کا جمال اس کے جمال سے ہے۔ اس لیے یہ سالک اپنا دل اپنے اللہ کو دے دیتا ہے اور بزبان حال کہتا ہے:

تجھ پر فدا ہو جاں مری، زندہ رکھے تری عطا
دل عشق میں مبتلا ترے، دل چاہے بس تری رضا

آپ ﷺ کی دعا ہے: ”اللَّهُمَّ رَضِينِي بِمَا قَضَيْتَ لِي وَعَافِنِي فِيمَا أَبْقَيْتَ حَتَّى لَا أَحِبَّ تَعَجُّيلَ مَا أَخَّرْتَ وَلَا تَأْخِيرَ مَا عَجَّلْتَ“ [الردوس، باؤر الخطاب، ج 5، ص: 401]

ترجمہ: ”اے اللہ! آپ مجھے ان امور پر مطمئن کر دیجیے جو آپ نے (میرے بارے

میں) طے کیے ہیں اور مجھے ان امور (زندگی) میں عافیت دے دیجیے جو آپ نے (میرے لیے) باقی رکھے ہوئے ہیں۔ تاکہ میں ان امور میں جلد بازی نہ چاہوں، جو آپ نے میرے لیے مؤخر کیے ہوئے ہیں اور نہ ان امور میں تاخیر کو (پسند کروں) جو آپ نے فوری دیے ہیں۔“

اس صورت میں شریعت پر عمل کرنا اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر وقت اس تلاش میں ہوتا ہے کہ میں کس طرح اپنے مالک کو راضی کر لوں۔ چونکہ اس پر یہ خوب واضح ہو چکا ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کو راضی کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے احکامات پر بے چوں و چرا عمل کرتا جائے اور اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ اس لیے شریعت پر عمل کرنے کو وہ ہر دم تیار رہتا ہے۔ اصل میں عبدیت کے حصول میں یہی نفس ہی تو آڑ ہوتا ہے۔ جیسے ہی نفس کی تہذیب ہوگی تو سچ سچ اور حق حق نظر آئے گا۔ بس اس کے نتیجے میں بندہ خود کو اپنے رب کا ادنیٰ غلام سمجھ لیتا ہے۔ اس میں اس کی نظر اپنے سے ہٹ کر اپنے مالک پر آ جاتی ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ چاہے اس کو کوئی جاہل کہے یا گنوار۔ لیکن اس کے لیے سب کچھ گوارا ہوتا ہے مگر محبوب کی ناراضگی گوارا نہیں ہوتی۔ اس کو کیفیتِ بندگی یا عبدیت کہتے ہیں۔ اسلام بھی اسی کو کہتے ہیں۔ پس کیفیتِ بندگی کا حصول اسلام کا کمال بھی ہے۔

ایسا شخص احکامات کی مصلحتوں کی کرید میں نہیں ہوتا، کیونکہ اس کو ان سب کی بڑی مصلحت معلوم ہو چکی ہوتی ہے اور وہ ہے اپنے محبوب کی رضا۔ وہ اپنے کسی کام پر اتراتا نہیں کیونکہ محبوب کی عظمت کے سامنے اس کو اپنا عمل ہیچ نظر آتا ہے۔ لیکن اس پر خوش ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے کام کی توفیق ہو جانا جس میں اس کے محبوب کی رضا مضمر ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اپنی کسی غلطی سے ناقبول نہ ہو جائے، لرزاں ترساں بھی رہتا ہے اور محبوب کے کرم کو دیکھتے ہوئے پُر امید بھی رہتا ہے۔ احادیثِ شریفہ میں ایک مومن کی علامات ایسی ہی بتائی گئی ہیں۔ عبد ہر خیر کی نسبت اپنے محبوب مالک کی طرف اور ہر

شر کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَمَا أَبْرِيءُ نَفْسِي﴾ [یوسف: 53]

ترجمہ: ”اور میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا نفس بالکل پاک صاف ہے“ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کلالہ کے بارے میں میری ایک رائے ہے اگر وہ صحیح ہے تو میرے رب کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو شیطان اور میرے نفس کی طرف سے ہے۔ [تفسیر الطبری، ج 6، ص: 475]

احادیث شریفہ کی دعائیں اس سے پُر ہیں۔ ایسے حضرات نہایت لجاجت کے ساتھ دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے۔ لیکن نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ خود کوئی تجویز ہی نہیں رکھتے۔ ان کو پتا ہوتا ہے کہ ہمارا محبوب مالک ہماری تمام ضروریات سے آگاہ اور ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے۔ عبد کی کوئی شان نہیں ہوتی۔ بقول حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی تو اس کو آقا کی رضا کے لیے پاخانہ اٹھانا پڑتا ہے تو کبھی اس کی قائم مقامی کے لیے جلسہ یاد بار میں جانا پڑتا ہے۔ اس لیے عبد کی نظر میں خوشگوار اور ناخوشگوار حالت برابر ہوتی ہے کہ ایک میں محبوب کی محبوبیت ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ يُحِبُّ الشَّاكِرِينَ﴾ [الجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر: 29]

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ قدر دان ہے شکر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“ اور دوسرے میں محبوب کی معیت ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ [البقرہ: 153]

ترجمہ: ”بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب

کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

فراق و وصل کی کیا بات رضا ہو اس کی طلب

حیف ہو ایسی تمنا پہ، ہو جو غیر کی اس کی

پس کیفیتِ عبدیت والے حضرات کو اچھی چیز ملے تو دل سے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور اگر ناخوشگوار حالت پیش آئے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں۔ ہر حالت

میں ان کی خیر ہے۔ اصل میں یہ ایسی کیفیت ہے جو تمام فضائل کو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کا حصول سارے فضائل کا حصول اور سارے رذائل سے پاکی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حبیب ﷺ کے طفیل یہ نعمت نصیب فرمائے۔ آمین

مختصراً اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات میں شریعت کا جو بھی حکم ہو اس کو بسر و چشم پورا کرنا عبدیت ہے۔

◆ عبدیت کے حصول کا طریقہ

نفس، قلب اور عقل کی اصلاح اس کی تحصیل کا طریقہ ہے۔ کیونکہ جب تک نفس کی شرارت مؤثر ہے اور دل پاک نہیں ہے اور عقل فہیم سنت نہیں ہے تب تک عبدیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

1.2.2... رضائے الہی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ [التوبہ: 72]

ترجمہ: ”اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے“ اور اس کے لیے یہ دعا بہت مشہور ہے: ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ رِضَاكَ وَالْحَبَّةَ“

ترجمہ: ”اے اللہ میں آپ سے آپکی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں“ حق تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ایسے تعلق کا نصیب ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا کہے۔ یعنی جن کو رجال اللہ کہا جاتا ہے ان میں سے ہو جائے۔ یہ وہ نعمت ہے جو بڑے خوش نصیبوں کو ملا کرتی ہے۔ اس کے لیے سارے ہی پاؤں بیلنے پڑیں اور یہ نعمت حاصل ہو جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

رونے سے اگر ہوتا عرفی مجھے وصال
رونا مجھے قبول تھا اس کے لیے صد سال

کسی عمل صالح میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ اس کا بدل ہو۔ کیونکہ وہ سب ہی توفیقات الہیہ ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ عادتاً ان لوگوں کو ہی نوازتے ہیں کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمال پر مرتب فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی

شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جائے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”مَا مِنْ أَحَدٍ يُدْخِلُهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، فَقِيلَ وَلَا أَنْتَ يَا

رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي رَبِّي بِرَحْمَةٍ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7291]

ترجمہ: ”تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ پوچھا گیا: اللہ کے رسول اللہ ﷺ! آپ کو بھی نہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے بھی نہیں مگر

یہ کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت میں چھپالے“ اور یہ نسبت مع اللہ جب نصیب ہو جاتی ہے تو پھر زائل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس کو دوست بناتے ہیں تو پھر ان کو اپنے سے دور نہیں

فرماتے۔ البتہ اگر بشریت کے ناطے کچھ ایسے اعمال ان سے سرزد ہو جائیں جن پر گرفت کی جاسکے تو ان حضرات کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ اپنے اللہ سے رودھو

کے معاف نہیں کرا لیتے۔ اس لیے اگر منفی عمل ہو گیا تو ساتھ ہی مثبت عمل یعنی توبہ و استغفار کی اتنی توفیق ہو جاتی ہے کہ نہ صرف وہ گناہ معاف ہو جاتا ہے بلکہ مزید ترقیات

کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا پر حد کے دوران ایک اور صحابی کے جب مذمت کے الفاظ سنے تو فرمایا: ”لَوْ قَسِمْتَ تَوْبَتَهَا

بَيْنَ أَهْلِ الْحِجَازِ لَوَسِعَتْهُمْ“ [السنن الکبریٰ للنسائی موسمہ الرسالہ، لبنان، بیروت، حدیث نمبر: 8181]

ترجمہ: ”اگر ان کی توبہ سارے حجاز والوں پر بھی تقسیم کی جائے تو ان کے لیے کافی ہو جائے“ الغرض ایسے لوگ معصوم تو نہیں ہوتے کیونکہ معصوم صرف انبیاء ہیں۔ لیکن

محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان کو ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [البینہ: 8]

ترجمہ: ”اللہ ان سے خوش ہو گا اور وہ اس سے خوش ہوں گے“ کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ ان سب کے لیے ہے جن کو خشیت حاصل ہو۔

◆ رضائے الہی کا طریقہ تحصیل

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ غیر اختیاری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کرم فرمائے ہو جاتا ہے۔ البتہ ہمارا کام اختیاری امور میں سستی نہ کرنا ہے۔ کیونکہ ہم اسی کے مکلف ہیں:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [ہود: 115]

ترجمہ: ”اس لیے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا“ اس لیے ایسے کریم رب سے قبولیت کی امید رکھتے ہوئے اعمالِ ظاہرہ اور باطنہ (جو اختیاری ہیں) میں دل و جان سے لگنا ہی اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ جو کہ پورا سلوک ہے۔ اس کے بعد جب بھی اس کا فضل ہو جائے تو یہ خوش نصیبی ہے۔ دیر سویر میں نہیں لگنا چاہیے کہ اس راستے میں تعجیل ایک کاٹا ہے جس سے بچ کے گزرنا چاہیے۔ لیکن اختیاری امور میں غفلت بھی نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ وہ محرومی کی وجہ بن سکتی ہے۔

پانے کا، نہ پانے کا تو اختیار گو نہیں
پس ہم کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

اک لحظہ کی غفلت نہ ہو اس شاہ سے کبھی
شاید اسی لمحے ہو نگاہ تجھ پہ کرم کی

1.2.2.1... وصول الی اللہ کے تین طریقے :

اول سب سے طویل، دوم درمیانہ اور سوم مختصر۔

◆ اول (سب سے طویل)

وہ یہ ہے کہ کثرتِ صوم و صلوة، قرأتِ قرآن پاک و حج و جہاد وغیرہ کرنا۔ یہ طریق اختیار کا ہے۔ اس میں قوتِ ارادی سے علمِ نافع حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اپنی قوتِ ارادی سے نفس کی کشاکشی پر قابو پا کر عملِ صالح کیا جاتا ہے۔

◆ دوم (درمیانہ)

ان امور کے علاوہ مجاہدہ و ریاضت، اخلاقِ ذمیمہ کے ازالے اور اخلاقِ حمیدہ کی تحصیل میں مشغول ہونا۔ اکثر اسی طریق سے واصل ہوتے ہیں۔ یہ طریق برابر کا ہے۔ اس کے لیے کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ دل کے تاروں کو چھیرنا

اور مجاہدہ کی مقدار کا تعین ان ہی کا کام ہے۔ اس میں دو چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں ایک شیخ کا تجربہ اور دوسرا ان کے سلسلے کی برکت، جس سے مطلب حاصل ہونا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

◆ سوم (مختصر مگر زیادہ مؤثر)

یہ فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا راستہ ہے۔ جس کو طریق عشق کہتے ہیں۔ اس میں قوتِ ارادی نہیں بلکہ قوتِ عشق کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے یہ طریقہ مختصر ترین ہے۔ اس میں سالکین تزکیہٴ نفس اور تصفیہٴ قلب اور تجلیہٴ روح میں مشغول ہوتے ہیں اور کشف و کرامات کو ایک جَو کے بدلے میں بھی نہیں خریدتے اور ”مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا“ پر مستقیم ہوتے ہیں۔ یہ طریق شطاریہ کا ہے۔ ”مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا“ کے ساتھ انطباق اور مرنے سے پہلے مرنے کی نوعیت یہ ہے کہ موت کے وقت مردے کہ یہ احوال ہوتے ہیں: توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت، توجہ الی اللہ، صبر، رضا، ذکر، مراقبہ، جو کہ شطاریہ کا طرہ امتیاز ہے۔

- (1) توبہ: یعنی ہر فعلِ بد سے نکل جانا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (2) زہد: دنیا و مافیہا کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (3) توکل: اسبابِ ظاہرہ غیر عادیہ کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (4) قناعت: شہوات کا ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (5) عزلت: خَلْق سے قطع کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (6) توجہ الی اللہ: ماسویٰ اللہ سے اعراض کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (7) صبر: ترکِ حظوظ کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (8) رضا: رضائے نفس کو ترک کرنا اور رضائے حق پر راضی رہنا اور خدا کے حکم کو تسلیم کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔
- (9) ذکر: ذکرِ غیر حق کو ترک کرنا اور یادِ حق میں مشغول ہونا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔

10) مراقبہ: اپنے وقت کے لوٹنے کے خیال کو ترک کرنا جیسا کہ بوقتِ موت ہوتا ہے۔ یہ ہے ”مَوْتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا“ ہونا کہ موت کے وقت جو حالت ہوتی ہے وہ حالتِ حیات میں نقد حال ہو کہ جسم دنیا میں ہو اور روح متوجہِ آخرت ہو اور واصلِ بخت ہو۔ مال و دولت، ساری دنیا کی سلطنت ہاتھوں میں ہو لیکن دل پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہو۔ جس کی پہچان یہ ہے کہ ممنوعات و مکروہاتِ شرعیہ سے قولاً و فعلاً و حالاً جو ارج و زبان کو بند کرے، قلب کو مَاسِوٰی اللہ سے فارغ اور اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرے، بیہودہ مجالس سے پرہیز ہو۔ جو چیز طالب کو یادِ الہی سے بازرگے وہی بیہودہ اور لالچینی ہے۔ باطل لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرے۔ جو طالب خدا کا نہیں وہی باطل ہے۔ جیسے صوفیا کا قول ہے ”مَوْتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا“ جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مترادف ہے حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا۔ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2459] اور یہی راستہ ہے اپنے آپ کو شر سے بچانے کا۔

◆ اخلاق کے رسوخ کی علامات

اخلاق کے رسوخ کی علامت یہ ہے کہ جس وقت جس خُلق کا موقع پیش آئے اس وقت بلا التفات، بلا اختیارِ تدبیر فوراً یا ادنیٰ تدبیر سے اس خُلق کا با محل استعمال ہو۔

•••

2... غیر مقصود:

یہ تین قسم کے ہیں:

(1) ذرائع۔ (2) توابع۔ (3) مواجع۔

2.1... ذرائع:

ذرائع دو قسم کے ہوتے ہیں: منصوص اور غیر منصوص۔

2.1.1... منصوص ذرائع:

منصوص ذرائع میں عبادات آتی ہیں جن میں سب کچھ ہے اگر صحیح طریقے سے ادا ہوں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اس کے لیے بعض ذرائع ایسے تھے جن تک بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کسی انسان کا ذہن نہیں جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے پیغمبروں کے ذریعے وہ ذرائع ہمیں مہیا کر دیے۔ یہ ذرائع منصوص ذرائع کہلاتے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اگر کسی کے یہ ذرائع سو فیصد درست ہوں تو کسی غیر منصوص ذریعے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیسے آنکھیں درست ہوں تو عینک کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر آنکھیں درست نہ ہوں تو عینک لگانا ضروری ہے۔ اس طرح نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی نماز اس حد تک مؤثر نہ ہو تو اس کو اس کے ساتھ کچھ غیر منصوص ذرائع کی ضرورت پڑے گی۔ البتہ ان منصوص ذرائع سے انکار کسی بھی وقت ممکن نہیں ہے اور غیر منصوص ذرائع ان کا متبادل نہیں قرار دیے جاسکتے۔ جیسے آنکھیں بالکل ختم ہو جائیں تو عینک پھر کس کام کی؟

2.1.1.1... نماز

عبادات میں نماز ایسی اعظم عبادت ہے کہ اگر اس کو پورے اہتمام آداب و شرائط سے ادا کیا جائے تو کسی دوسری مستقل ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں ذکر،

شغل، مراقبہ اور مثل تسبیحات، استغفار، درود شریف وغیرہ سب جمع ہیں۔ اس میں ذکر کا ہونا اور کلام پاک کی تلاوت جو جامع اذکار ہے اور شغل بحالت قیام سجدہ کی جگہ نظر کا جمانا، بحالت رکوع قدم پر نگاہ رکھنا، بحالت سجدہ پڑھائی (تختنا) پر نگاہ رکھنا، بحالت جلسہ و قعدہ گود پر نگاہ جمانا، بحالت سلام دائیں بائیں کندھے پر نگاہ رکھنا۔ مراقبہ بحالت تحریمہ باستحضار نیت اور کل صلوة میں ”اللَّهُ نَاطِرِي“ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ خیال رکھنا، یہ مقام احسان کہلایا جاتا ہے۔ جس کے لیے تمام مجاہدے اور ریاضتیں اختیار کی جاتی ہیں۔

جیسے حدیث شریف میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ”مَا الْإِحْسَانُ“ کہ احسان کیا چیز ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 50]

ترجمہ: ”احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو یہ سمجھو کہ وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے“ غرض نماز کو اس کے آداب و مستحبات اور شروط کے ساتھ ادا کرنے سے راہ سلوک اور اس کا انتہائی درجہ یعنی مقام احسان حاصل ہو سکتا ہے اور لطائف ستہ کے آثار ظہور کر سکتے ہیں۔

2.1.1.2 ... روزہ:

روزے کا خاصہ از روئے قرآن پاک تقویٰ ہے جو ولایت کی کنجی ہے۔ کیونکہ ولایت کے لیے دو ہی باتیں درکار ہیں: ایمان اور تقویٰ۔ بشرطیکہ روزہ کو ظاہراً اور باطناً صحیح رکھا جائے یعنی اس میں ان تین ممنوعات یعنی اکل و شرب و مباشرت سے رکنے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا عمل نہ ہو جو روزہ کی اصل یعنی تقویٰ کے خلاف ہو۔ چونکہ روزے میں نفس پر پیر رکھا جاتا ہے یعنی کھانے پینے اور مباشرت کی ممانعت سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور تراویح میں قیام اور تلاوت قرآن سننے سے دل کی اصلاح ہوتی ہے۔

2.1.1.3 ... زکوٰۃ:

قرآن و حدیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی بہت ترغیب ہے۔ اس میں زکوٰۃ بشرط

استطاعت فرض کے درجے میں ہے۔ مال کی محبت جو نفس کے بہت سارے رذائل کی جڑ ہے، اس سے اس پر زد پڑتی ہے۔ رشوت و سود اور ناجائز ذرائع سے مال کو جمع کرنے کے ساتھ جو مفاسد وابستہ ہیں۔ زکوٰۃ سے ان کا توڑ ہوتا ہے۔

2.1.1.4... حج:

ایک ہوتی ہے نفسانی عقل معاش اور دوسری ہوتی ہے عقل معاد (یعنی عقل ایمانی)۔ عقل معاش انسان کی اس اہم صلاحیت کو نفس کے لیے استعمال کرتی ہے جس کی حدود کا تعین ضروری بلکہ از حد ضروری ہے۔ اس کے لیے حج مشروع کر دیا گیا کہ جن بزرگوں کی اداؤں کی ہم سے نقل کرائی جاتی ہے انہوں نے کیسے اپنی عقل معاش پر عقل معاد کو غالب کیا تھا۔ اس میں لباس وہ پہنایا جاتا ہے جس کا تقاضا عقل معاش نہیں کرتی بلکہ جذبہ عشق سے ہی ایسا ممکن ہے۔

2.1.2... غیر مقصود ذرائع:

اگر ان مقصود اعمال کی ادائیگی میں نفس و شیطان کی وجہ سے کمزوری پائی جائے تو ان کا علاج ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے آنکھیں اگر صحیح کام کریں تو عینک لگانا ایک فضول حرکت ہوگی۔ لیکن اگر آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں اور ان کے لیے صحیح طور پر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ تو اگر مناسب عینک لگانے سے چیزیں صحیح نظر آسکتی ہوں تو عینک لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ بس یہی فرق ہے کہ صحابہ کرام کے دور میں یہی ذرائع کافی تھے اور ان ہی سے ان کے سب کام ہوتے تھے۔ بعد میں آپ ﷺ کے زمانے سے دوری کی وجہ سے امت کے یہ ذرائع کمزور ہوتے گئے، اس لیے دوسرے ذرائع کی اہمیت بڑھتی گئی۔ چونکہ ان دوسرے ذرائع کی ضرورت حسب حال مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوتی ہے اس لیے یہ مقصود نہیں بلکہ تجرباتی ہوتے ہیں۔ ان کا مقصود ہونے کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی جسمانی بیماری کے علاج کے لیے دوا کے مقصود ہونے کا مطالبہ کرنا۔

◇ غیر منصوص ذرائع کی قسمیں

غیر منصوص ذرائع دو ہیں اور یہ دونوں فی الاصل مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ بضرورت استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

◇ 2.1.2.1... مجاہدہ

◇ 2.1.2.2... فاعلہ

مجاہدہ میں نفس پر محنت کی جاتی ہے کہ بندہ اس کے مرغوبات پر قابو پانے پر قادر ہوتا کہ اس نفس سے اللہ تعالیٰ کی منشا پاک کے مطابق کام لیا جاسکے۔ فاعلہ میں نفس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارا جاتا ہے تاکہ بندے کے رذائل دور ہو جائیں اور اس کو فضائل حاصل ہو جائیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ غیر منصوص ذرائع مقصود نہیں ہوتے۔ لیکن جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے ان کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کو فقہ میں مہارت حاصل کرنی ہو تو اس کو پہلے صرف، نحو، اصول فقہ، قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشریح میں جان کھپانی پڑے گی۔ پھر اس کو کسی ماہر فقہ کی نگرانی میں فتاویٰ کا کام کرنا پڑے گا۔ تب کہیں اس میں فقہ کی مہارت پیدا ہو سکے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں ایک فقیہ کی نگرانی میں فتویٰ لکھنا شروع کر دیتا ہوں، اس سے مجھے مہارت حاصل ہو جائے گی۔ اس کی یہ بات قابلِ سماعت نہیں سمجھی جائے گی۔ اس طرح اگر کسی کو ڈاکٹر بننا ہے تو اس کو ایم بی بی ایس میں انالومی، بائیو کیمسٹری، فارمکالوجی، پیٹھالوجی وغیرہ سب پہلے پڑھنی پڑتی ہیں پھر ان کو میڈیسن اور سرجری سمجھ میں آتی ہیں۔ پس اگر کوئی کہے کہ میں نے تو صرف سرجری اور میڈیسن پڑھنا ہے۔ اس کی یہ بات نہیں سنی جائے گی۔

اب آگے پہلے مجاہدہ کا بیان ہو گا اور پھر فاعلہ کا۔

2.1.2.1... مجاہدہ

مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا و اطاعت کے مقابلے میں نفس کی خواہشات کو مغلوب رکھا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت: 69]

ترجمہ: ”اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے۔ ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے“ اور حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الْمَجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ“ [شعب الایمان للسیبغی، حدیث نمبر: 11123]

ترجمہ: ”مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے“

تعمیلِ فنائے نفس بغیر مجاہدہ کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مجاہدات کی ترتیب سا لکین کے لیے بنانی پڑے گی۔ مجاہدہ ہر سالک کا اپنا ہو گا۔ کیونکہ بعض مجاہدات جس سالک کے لیے مجاہدات ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے لیے مجاہدات نہیں ہوتے۔ مثلاً خادم کو کہا کہ بازار سے سودا لاؤ۔ اس کے لیے یہ عام بات ہے۔ لیکن جس کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہو اس کو یہ کہنا اس کے لیے مجاہدہ ہے۔ سخی سے خرچ کرانا مجاہدہ نہیں۔ بخیل سے خرچ کرانا مجاہدہ ہے۔

◆ طریقہ

نفس کو بعض چیزیں محبوب ہوتی ہیں اور بعض چیزیں نفس پر گراں ہوتی ہیں۔ جو چیزیں نفس کو محبوب ہوتی ہیں ان میں کچھ تو نفس کے حقوق ہیں جن سے حیات اور جسم قائم ہے۔ یہ نفس کی ضروریات ہیں اور کچھ نفس کے حظوظ ہیں۔ یہ نفس کی خواہشات ہیں۔ سو مجاہدہ و ریاضت میں حظوظ میں کمی کی جاتی ہے یا ان کا ترک کرایا جاتا ہے اور نفس پر جو چیزیں گراں ہیں ان کا نفس کو عادی بنایا جاتا ہے۔ البتہ حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ جائز حقوق سے اپنے نفس کو محروم کرنا خلاف سنت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ”لَا تَنْفُسِكَ عَلَيَّكَ حَقًّا“ [سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 1369]

ترجمہ: ”بے شک تمہارے نفس کا تم پر حق ہے“ کیونکہ اس سے ضعف بڑھتا ہے اور

صحت میں خلل پڑتا ہے۔ پھر ضروری اشغال و عبادات سے بھی انسان عاجز ہو جاتا ہے۔

◆ مجاہدہ کی حقیقت

مجاہدہ مقصود نہیں ہے۔ ذریعہ ہے۔ اس لیے اگر مجاہدہ کے بغیر شریعت کے مطابق اعمال ہونے لگیں تو ان سے مزید کا مطالبہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ کا ارشاد مبارک ہے: ﴿مَا آتَيْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِيَتَشَقَّى﴾ [ط: 2]

ترجمہ: ”ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم تکلیف اٹھاؤ“ البتہ شریعت پر چلنے میں اگر نفس مزاحم ہو تو پھر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ پہلے لوگ اپنے نفس کی اصلاح سلوک طے کر کے کر لیتے تھے۔ بعد میں جو حضرات نقشبندیہ کے فیوض حاصل کرنا چاہتے تو وہ نقشبندیہ کے اذکار و مراقبات کر لیتے تھے۔ ان کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ سلوک طے کرنے میں وہ ہو چکی ہوتی تھیں۔ ان کو صرف معرفت حاصل کرنے کے لیے اذکار و مراقبات کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے متاخرین نقشبندیہ کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے طریق میں مجاہدات نہیں ہیں۔ حالانکہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جذب حاصل ہونے کے بعد سلوک کی تکمیل کو سالک کی تکمیل کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اور اس کے بغیر مجاہدات کو مجذوب متمکن کہتے ہیں اور بقول حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ نہ خود پہنچے ہیں نہ دوسروں کو پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام سلسلوں میں جن کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت ہو ان سے گزرنا پڑتا ہے۔

◆ مجاہدہ کی ضرورت

فرض کریں زید نے بار برداری کا ایک جانور خریدا جو کہ اٹیل ہے۔ اس پر زید جب کوئی بو جھ ڈالتا ہے تو وہ مزاحمت کرتا ہے اور اگر اس کو آزاد چھوڑتا ہے تو دوسری چیزوں کو خراب کرتا ہے۔ کسی اور کے کھیت میں جا کر اس کا نقصان کرتا ہے۔ جس کا خمیازہ زید کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اب زید اس جانور کے ساتھ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے اگر زید اس

کا کچھ نفع اٹھانا چاہتا ہے یا اس کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے تو اس کی تربیت کرے گا۔ جس کا طریقہ یہ ہو گا کہ ترغیب و ترہیب کے ذریعے اس کو مشقت کا عادی بنائے گا۔ اس کی ضرورت کی چیزیں تو اس کو مہیا کرے گا لیکن اس کی دوسری خواہشات کو کنٹرول کرے گا۔ ایسی صورت میں یہ جانور زید کے لیے نفع بخش بن جائے گا۔ لیکن اس کے شر سے بچنے کے لیے زید پھر بھی اس پر نگاہ رکھے گا اور اس کو کھلا نہیں چھوڑے گا اور اگر کبھی کھلا چھوڑنے کے قابل ہوا بھی تو پھر بھی اس کی خبر رکھے گا کہ اس کی خواہشات کہیں اس کی تربیت کو ضائع نہ کر دیں۔ اسی تربیت کو تربیت نفس پر بھی منطبق کریں۔

اعمالِ صالحہ چونکہ نفس کو کرنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ نفس پر گراں ہوں تو اعمالِ صالحہ میں مشقت رہتی ہے۔ کیونکہ نفس ان کے مقابلے میں مخالفت کرتا ہے۔ اگر نفس کی تربیت نہ ہو چکی ہو تو اس کی مثال زید کے اٹیل جانور کی سی ہے۔ نفس کی اس مخالفت کے باوجود عمل کرنا مجاہدہ حقیقی ہے۔ جو فرض و واجب اعمال کی صورت میں فرض و واجب ہے اور سنت و مستحب کی صورت میں سنت و مستحب ہے۔ چونکہ ان اعمال کو تو کرنا ہی ہے۔ اسی لیے نفس کی یہ مخالفت عمر بھر کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف نفس کے کچھ ایسے تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کو پورا کرنے سے شریعت کی مخالفت لازم آتی ہے اور نفس ان چیزوں کو کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ شریعت کی مخالفت سے بچنا بہر صورت لازم ہے اس لیے نفس کے خلاف عمر بھر جمار ہنا پڑے گا۔ البتہ جس نے اپنے نفس کو مشقتوں کا عادی بنا کر اس کی تربیت کی تو ایک طرف اعمالِ صالحہ میں نفس کی مزاحمت کم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف خلافِ شرع اعمال کی طلب کم ہو جاتی ہے جیسا کہ زید نے جب اپنے جانور کی تربیت کر لی تو زید نے اس کا نفع اٹھایا اور اس کے شر سے محفوظ ہوا۔ چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ [اعلیٰ: 14]

ترجمہ: ”فلاح اس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی“

کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ

مبتدی یعنی جس نے اپنی تربیت ابھی شروع کی ہے اس کے لیے تو یہ غلط ہے ہی کہ

وہ اپنے نفس کو مشقت سے بچانا چاہے یعنی مجاہدہ پر تیار نہ ہو اور اس انتظار میں رہے کہ سارا کام مشقت کے بغیر ہو جائے اور منتہی جس کی تربیت ہو چکی ہو اس کی غلطی یہ ہے کہ وہ ابتدائی مجاہدہ کر کے آئندہ کے لیے بھی اپنے آپ کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھ لے۔ چونکہ بسا اوقات نفس کے تقاضوں کی وجہ سے پھر کبھی کمزوری پیش آسکتی ہے اور اس وقت منتہی کو بھی معصیت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا نفس بھی بعض دفعہ طاعات میں کسل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے۔ جیسے ایک تو زید کا جانور جب اڑیل تھا تو اس وقت اس سے کوئی کام کرانا یا اس کو کسی چیز سے روکنا زیادہ مشکل تھا اور جب وہ تربیت یافتہ ہو گیا تو اس سے کام کرانا اور اس کو کسی چیز سے بچانا کم مشکل ہے۔ وقتی طور پر تربیت یافتہ جانور بھی اگر مزاحمت کرے تو اس کو قابو کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ اب میرا جانور سدھا ہوا ہے اور اس سے بالکل بے فکر ہو جائے۔ تو جو نقصان ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

◆ شیطان اور نفس کے شر سے بچنے کا طریقہ

کسی انسان کو برائی پر ابھارنے والی دو قوتیں ہیں۔ ایک نفس ہے اور دوسرا شیطان۔ نفس لذات کا طالب ہے اور شیطان خدا سے دوری کا۔ پس نفس کو اگر جائز طریقے سے مطمئن کیا جائے اور کچھ مجاہدے سے اس کی تہذیب ہو جائے تو ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ بخلاف شیطان کے کہ وہ لذت کا طالب نہیں۔ خدا سے دوری کا طالب ہے۔ اس لیے وہ ایسے گناہ بھی کر دے گا کہ جن میں نفس کو لذت نہیں ہوگی بلکہ عین ممکن ہے نفس کو تکلیف بھی ہو، جیسے گمراہ صوفی جو نفس کو تکلیف دینا ہی دین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ شیطان نے ان کو سمجھایا ہوتا ہے کہ چونکہ تو نفس کو تکلیف دے رہا ہے اس لیے تو روحانی ترقی کر رہا ہے۔ بعض عیسائی جو بعض اوقات اپنے زعم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کو یاد کر کے ان کی طرح اپنے آپ کو پھانسی لگاتے ہیں۔ اپنے جسم پر کیل ٹھونکتے ہیں۔ یا شیعہ جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے

حالات کو یاد کر کے اپنے آپ کو پیٹتے ہیں اور بعض دفعہ زنجیروں سے اپنے آپ کو مارتے ہیں۔ یہ اسی نوعیت کے تماشے ہیں۔ اس لیے اس کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اپنے نفس کو کون سی تکلیف دینا جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

نفس کی تو تربیت ہو سکتی ہے شیطان کی نہیں۔ شیطان سے تو ہمیشہ پناہ مانگنی چاہیے اور اس کے مکائد کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ نفس چونکہ گھر کا بھیدی ہے اس لیے شیطان اس کو آلہ کار بناتا ہے اور اپنا کام کراتا ہے۔ لیکن اگر اس طرف سے شیطان مایوس ہو تو وہ دوسرے رخ سے حملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دل میں راسخ ہونا اور محبوب خدا ﷺ کی سنت کے ساتھ چکنا ہی شیطان کا توڑ ہے کیونکہ اس راہ سے شیطان حملہ آور نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ملعون سے پناہ مانگنی چاہیے۔ آج کل بھی اس دنیا میں بعض ایسے غیرت مند موجود ہیں کہ اگر ان کے دشمن بھی ان کے پاس آکر کسی چیز سے پناہ مانگیں تو وہ ان کی خاطر اپنی جان پر بھی کھیل جاتے ہیں۔ تو جس خدا نے ایسے غیرت مندوں کو پیدا کیا ہے کیا وہ اپنے دشمن سے آپ کو پناہ نہیں دے گا؟ خوب سمجھنا چاہیے۔ اس کے لیے صحبتِ صالحین اور ذکر کی کثرت بہت مفید ہے۔

◆ مجاہدہ میں اعتدال

مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا عادی بنانا ہوتا ہے اور اس کی راحت و تنعم کی عادت کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے۔ نفس کو بہت زیادہ پریشان کرنا اچھا نہیں ہے۔ ورنہ وہ بالکل معطل و بے کار ہو جائے گا۔ اس کو خوب سمجھنا چاہیے۔ محنت و مشقت ہمیشہ اور ہر حال میں مستحسن نہیں ہے بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو، اسی وقت مستحسن ہے۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے۔ لہذا اعتدال کی رعایت لازم ہے۔ اسی کو حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ جس کا ترجمہ ہے۔

نہ کھا اتنا جو کھائے منہ سے ہو باہر
نہ کم اتنا کھا ضعف جس سے ہو ظاہر

یعنی نہ اتنا کھاؤ کہ منہ سے باہر آنے لگے اور نہ اتنا کم کھاؤ کہ جسم میں کمزوری آ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان: 67]

ترجمہ: ”اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں۔ نہ تنگی کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے“ پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنی چاہیے، بلکہ اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کرنا چاہیے بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کرنا چاہیے۔

◆ مجاہدے کی اقسام

مجاہدے کی دو قسمیں ہیں: اختیاری اور غیر اختیاری اور پھر اختیاری کی دو قسمیں ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اختیاری کا تعلق نظام تربیت سے براہ راست ہے اور انسان اس کا مکلف ہے۔ البتہ غیر اختیاری مجاہدات اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے۔ جس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کام سے پہلے اس سے مجاہدہ لیا جاتا ہے۔ جیسے آپ ﷺ سے معراج شریف سے پہلے طائف کا مجاہدہ لیا گیا تھا۔ یہ سب سے اونچے درجے کا غیر اختیاری مجاہدہ ہے۔ جیسے آپ ﷺ فرماتے ہیں: ”تَقَدُّوا ذِيئًا فِي اللَّهِ، وَمَا يُؤْذِي أَحَدًا، وَأَخِفْتُ فِي اللَّهِ، وَمَا يُخَافُ أَحَدًا“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 12212]

ترجمہ: ”مجھے اللہ کی راہ میں جتنا ڈرایا گیا ہے اتنا کسی کو نہیں ڈرایا گیا، اللہ کی راہ میں جتنی مجھے اذیت دی گئی ہے اتنی کسی کو اذیت نہیں دی گئی“

اس کے بعد اس مجاہدے کا درجہ ہے جو درجات بلند کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ انسان وہ حاصل نہیں کر پاتا جو اسے حاصل کرنا چاہیے تو اس پر غیر اختیاری مجاہدہ بھیج دیا جاتا ہے جس سے اس کو وہ مل جاتا ہے۔ ایسے حضرات کو اس کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اس پر شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف بھیج کر ان کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمایا ہے۔ گویا وہ تکلیف پر صبر کی بجائے شکر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے زیادہ تکلیف کا اہل سمجھتے ہیں۔ بعض دفعہ اختیاری مجاہدے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا

تو اس کو غیر اختیاری مجاہدہ میں مبتلا کر کے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ اگر وہ اختیاری مجاہدہ کرتے تو اس غیر اختیاری مجاہدے میں نہ پڑتے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات گناہوں کی بخشش کے لیے غیر اختیاری مجاہدہ بھی آتا ہے۔ ایسے شخص پر جب تکلیف آتی ہے تو وہ اس پر صبر کر لیتا ہے جس سے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور آخری درجہ اللہ پاک کی ناراضگی سے آنے والی تکلیف ہے۔ جس پر انسان جزع فزع کر کے اس کا اجر ضائع کر لیتا ہے۔

اختیاری مجاہدہ کی دو قسموں میں سے ایک مجاہدہ جسمانی ہے کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے۔ مثلاً نوافل کی کثرت سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے طعام کی حرص وغیرہ کو کم کرنا۔ ایک مجاہدہ معصیت کے تقاضے کے وقت نفس کی مخالفت ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضا کرے اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو گا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہو گی۔ لیکن اگر مجاہدہ جسمانیہ کے بغیر کسی کو نفس پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو مجاہدہ نفسانیہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اسی واسطے صوفیاء نے مجاہدہ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے چار ارکان ہیں۔

2.1.2.1.1... کم کھانا

2.1.2.1.2... کم بولنا

2.1.2.1.3... کم سونا

2.1.2.1.4... ان لوگوں سے کم ملنا جن سے نقصان ہو

جو شخص ان ارکان کا عادی ہو جائے گا۔ واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا اور معصیت کے تقاضے کو ضبط کر سکے گا۔ مجاہدہ نفسانیہ یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا

کرے تو اس کی مخالفت کی جائے اور یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جب نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی حد تک مخالفت کی جائے۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے، بلکہ اس کی درخواست کو اس وقت رد کر دیا جائے اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جائز خواہش پوری کر دی جائے تاکہ نفس پریشان نہ ہو جائے، بلکہ اس کو خوش رکھا جائے اور اس سے کام بھی لیا جائے کہ:

مزدور کو خوش رکھنا کام اس سے جو ہے لینا

پھر جب کوئی مباحات میں نفس کی مخالفت کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو جاتا ہے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات معصیت کے تقاضے کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ریاضت و مجاہدہ کے دور کن ہیں۔ اول مجاہدہ اجمالی یا جسمانی۔ دوسرا مجاہدہ تفصیلی یا نفسانی۔ مجاہدہ اجمالی کے چار اصول ہیں: کم کھانا، کم سونا، کم بولنا اور کم نا جنس سے ملنا۔ ان چاروں امور میں مرتبہ اوسط پر شیخ کی نگرانی میں عمل ہونا چاہیے، نہ اس قدر قلت کرے کہ صحت و قوت زائل ہو جائے اور نفس کو محض تکلیف دینا مقصود بنے، جس کو رہبانیت کہتے ہیں اور نہ اس قدر کثرت کرنی چاہیے کہ جس سے غفلت و قسوت و کاہلی پیدا ہو۔ دوسرے رکن مجاہدہ تفصیلی کی دو قسمیں ہیں۔ اول اخلاق حمیدہ میں اور دوسری اخلاق رذیلہ میں۔ ان دونوں قسموں کی تفصیل گزشتہ اخلاق کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

2.1.2.1.1... کم کھانا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

الْمُسْرِفِينَ﴾ [الاعراف: 31]

ترجمہ: ”کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی مت کرو۔ یاد رکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”يُجْزِيهِمْ مَا يُجْزِي أَهْلَ السَّمَاءِ مِنَ

التَّسْبِيحِ وَالتَّقْدِيسِ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 27579]

ترجمہ: ”مسلمانوں کو غذا کی جگہ وہ چیز کافی ہو جائے گی جو اہل آسمان کو کافی ہو جاتی ہے یعنی تسبیح و تقدیس“ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے خلوت میں مدتوں کھانا نہیں کھایا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بعض اوقات صرف ذکر و تسبیح بھی غذا کا کام دے سکتے ہیں۔ لیکن تغلیل غذا کے جو واقعات منقول ہیں آج کل ان پر عمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان حضرات کی قوت زیادہ تھی کہ غذا کم کرنے سے بھی ان کا دل پریشان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان سے بعض اشغال ایسے منقول ہیں جس کا آج کل کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان میں ایک صلوٰۃ معکوس کو لیجئے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ الٹا لٹک کر شغل کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے تغلیلِ طعام کو تجویز کیا ہی نہیں۔ بلکہ کھانے کی عادت والے اوقات کو بدل کر ان میں وقفہ بڑھا دیا۔ اس عادت کی تبدیلی اور وقفہ کی زیادتی سے نفس کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کو شریعت نے تغلیلِ طعام کے قائم مقام سمجھا ہے۔ اس میں جتنی صورتیں مجاہدے کی نکل سکتی ہیں روزہ ان میں سب سے افضل ہے۔

لہذا تغلیلِ طعام کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ اہل مجاہدہ نے تغلیلِ طعام کی جو صورتیں اختیار کی ہیں۔ شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں ہے۔ یعنی کم کھانا اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں ہے اور بھوک کی جو فضیلت وارد ہے اس سے اختیاری بھوک مراد نہیں ہے بلکہ غیر اختیاری مراد ہے۔ یعنی یہ اس بھوک کے فضائل نہیں ہیں جو باوجود گھر میں غلہ ہونے کے اختیار کی جائے۔ بلکہ کسی شخص پر فاقہ آپڑے، تنگ دستی ہو، تو اس کی تسلی کے لیے فضائل بیان کر دیے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اس سے اس کو ثواب ملتا ہے۔ درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ یہ فضائل ایسے ہی ہیں جیسا کہ احادیث میں بیماری کے فضائل ہیں اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑ جائے۔ اسی وجہ سے چونکہ قلتِ طعام نہ خود بالذات مقصود ہے اور نہ اتنی قلتِ طعام کی آج کل کے لوگوں میں برداشت کی قوت ہے جتنی کہ متقدمین میں تھی۔

اسی لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے تبلیغ دین کے قلتِ طعام کے بیان پر عمل کرنا آج کل کے لیے نہیں ہے۔

آج کل صحت کو حاصل کرنے کے لیے وزن کم کروایا جاتا ہے۔ اس میں دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ جس چیز کی کمی سے وزن کم ہوتا ہے اس سے جسم کی طاقت میں بھی کمی آتی ہے۔ اس لیے اگر ان چیزوں میں کمی کی جاتی ہے تو کمزوری بھی ہوتی ہے۔ دوسرے طریقے میں چیزوں پر کنٹرول سے زیادہ کھانے کے اوقات یوں تبدیل کیے جاتے ہیں کہ انسولین کی پیداوار کو اس طرح کم کیا جاتا ہے کہ جس سے کھانے سے وزن بھی زیادہ نہیں بڑھتا اور طاقت بھی بحال رہتی ہے۔ پس مقصد کے لحاظ سے اس دوسرے طریقے کو ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے شرعی طریقہٴ تغلیلِ طعام یعنی روزہ مقصد کے لحاظ سے زیادہ مؤثر ہے۔ جس پر نص کا ثبوت بھی ہے کہ اس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔

الغرض قلتِ طعام فی نفسہ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور مقصود اس حیوانی قوت کے زور کو توڑنا ہے جو انسان کو سرکشی پر آمادہ کرتی ہے۔ پس اگر نفس کا گناہوں سے رکنا تغلیلِ طعام کے بغیر میسر آجائے تو تغلیلِ طعام (کھانے کو کم کرنا) ضروری نہیں ہوگا۔ نیز عبادت میں سرور و نشاط صحت اور قوت ہی سے ہوتا ہے اور تجربہ ہے کہ آج کل پہلے طریقے سے تغلیلِ غذا سے اکثر صحت برباد ہو جاتی ہے۔ لہذا سالک کو چاہیے کہ نہ تو اتنا کم کھائے کہ صحت برباد ہو جائے اور عبادت کی قوت ہی نہ رہے اور نہ اتنا زیادہ کھائے کہ سستی کی وجہ سے عبادت کے قابل ہی نہ رہے۔ بلکہ اوسط درجے کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اسی کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ [الاعراف: 31]

ترجمہ: ”کھاؤ اور پیو“ یہ اس پر نص صریح ہے اور ہر شخص کا اوسط اس کی خوراک کی مقدار کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ جس وقت بھوک لگے اس وقت کھانا کھائے اور اتنا کھا کر رک جانا چاہیے کہ چند لقمے اور کھانے کو جی چاہ رہا ہو۔ البتہ اس تک پہنچنے کے لیے کہ اوسط کھانا کھانا آسان ہو جائے اگر چند دن اس سے

کم کھانے پر گزارا کیا جائے تو تعلیماً اور تربیتاً ایسا کرنا ٹھیک ہو گا۔

خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اتنا مجاہدہ کرنا چاہیے جتنا کہ مسنون ہے۔ جب کہ دوسرے مشائخِ نفس کا زور توڑنے کے لیے اچھا خاصا مجاہدہ کرواتے تھے، جیسے شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے وغیرہ۔ ان دونوں طریقوں کو ملانے کا ایک طریقہ پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے ان سے دونوں کے مصالح فی زمانہ حاصل ہو سکیں گے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ بھرے پیٹ کا ثمرہ شیطانیت اور خالی پیٹ کا روحانیت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بھرے پیٹ کے ساتھ نفس پُر زور ہوتا ہے اور یہ شیطانی وساوس سے زیادہ متاثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ شیطانیت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے پیٹ کو خالی رکھنا ہوتا ہے۔ لیکن کتنا؟ کیونکہ ایک خاص حد سے کم کرنے سے آدمی بیمار ہو سکتا ہے جو کہ موت تک لے جاسکتا ہے۔ جس سے شریعت روکتی ہے۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ کھانا بتدریج اتنا کم کیا جائے جس سے آدمی کی ضرورت پوری ہو یعنی بیمار نہ ہو۔ اس وقت جسم کی جتنی اصلی ضرورت ہے اس کو اتنا کھانا ملے گا تو شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور پیٹ ضرورت کی حد تک خالی رہنے سے نفسانیت پر زد پڑے گی۔ جس کا دوسرا مطلب روحانیت کا بڑھنا ہے۔

ایک ہے ضرورت کے مطابق کھانا اور ایک عیش کا کھانا ہے۔ عیش کے کھانے اور ضرورت کے کھانے میں جتنا فرق ہے اس کو اگر کم کیا جائے تو یہ مجاہدہ ہو گا۔ جو کہ اختیاری ہے۔ اس سے جو روحانیت آئے گی اور پھر اس سے جو جسم کی ضرورت کم ہو گی۔ وہ غیر اختیاری ہے۔ پس ہم اس میں مزید بھی اختیاری طور پر کم کر سکیں گے، جس سے مزید جسم کی ضرورت غیر اختیاری طور پر کم ہوگی۔ بعض اللہ والوں کا کھانا جو ناقابل یقین حد تک کم ہو جاتا ہے وہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کھانا ویسے مسلسل کم نہ کر سکتا ہو تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جسم کو جس حالت پر لانا ہے یعنی جتنا مسنون طریقے کے مطابق کھانا ہے۔ اس پر آنے کے لیے پہلے اختیاری مجاہدہ کر کے اس سے زیادہ کمی

کی جائے، اس سے جسم کی مطلوبہ طاقت میں جتنی کمی ہو اس کو دوسرے وقت میں پورا کیا جائے۔ کیونکہ نفس پر اگر زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو اس سے کم کے لیے وہ تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں چونکہ جسم کی ضرورت بھی پوری کرنی ہے۔ اس لیے اس کو پورا کرنے کے لیے بعد میں جسم کو کچھ زیادہ دینا پڑے گا۔ اس سے جسم کی قوت بحال ہو جائے گی۔ لیکن جو مجاہدہ کیا ہو گا اس سے جسم مسنون مجاہدے پر تھوڑا بہت تیار ہو چکا ہو گا۔ اس لیے اب دوسری دفعہ کم اختیاری مجاہدہ کرنا پڑے گا یعنی مسنون مقدار سے پہلے سے کم کمی کرنی پڑے گی اور اس کو پورا کرنے کے لیے کم بڑھانا ہو گا۔ تیسری دفعہ اس سے بھی کم کی تبدیلی سے یہ کام ہو سکے گا۔ کئی دفعہ اس طرح کرنے سے تبدیلی کی مقدار میں کمی ہوتے ہوتے مطلوبہ حیثیت یعنی مسنون مقدار پر رک جائے گا۔ یعنی جسم کی ضرورت اور نفس آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متوازن صورت اختیار کر لیں گے۔ یہی نفس مطمئنہ کی حالت ہو گی جس پر روحانیت بھی رہے گی اور جسم بھی کمزور نہیں ہو گا۔ اس سے خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے پر بھی عمل ہو گیا کہ بالآخر مسنون مقدار پر ہی اکتفا کیا گیا، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے دوسرے بزرگوں کا طریقہ استعمال ہوا۔ اس سے سب طریقوں کی تطبیق ہوئی۔

2.1.2.1.2... کم سونا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿قَمِ اللَّيْلَ الْأَقْلِيلًا ۖ تَصِفْهُ آوَانُقْصُ مِنْهُ

قَلِيلًا﴾ [البزل: 2-3]

ترجمہ: ”رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔ رات کا آدھا حصہ، یا آدھے سے کچھ کم کر لو“ مذکورہ بالا آیت میں قیام لیل کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ ریاضت کے خوگر ہوں، جس سے نفس عبادت کے ساتھ مانوس ہو جائے اور سستی دور ہو جائے۔ چونکہ رات کا اٹھنا اور جاگنا نفس کے کچلنے میں خوب مؤثر ہے اور دعا ہو یا قرأت ہو، نماز ہو یا ذکر ہو، ظاہر او باطن ہر بات خوب ٹھیک سے ادا ہوتی ہے۔ ظاہر آ تو اس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ الفاظ

خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں اور باطناً اس طرح کہ خوب جی لگتا ہے۔ موافقتِ دل و زبان کا یہی مطلب ہے۔

اسی لیے رمضان المبارک میں نماز تراویح کا ادا کرنا شرعی حکم ہے جس سے نیند خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ جس طرح روزے سے کم کھانے کی برکات حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح تراویح سے کم سونے کے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جس طرح روزہ میں کھانے کی عادت بدلنا ایک مجاہدہ ہے اسی طرح یہاں بھی رکعتوں کی تعداد کو بڑھا کر کم سونے کی عادت ڈالی جاتی ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشا کے بعد فوراً سو جاتے ہیں۔ اس لیے نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا ہے جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے اور یہی مجاہدہ ہے۔ غرض شریعت نے تقلیل منام میں محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ اعمال کی تلقین فرمائی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں: ﴿وَبِالْآسَاءِ هُمْ يَسْتَعْفِرُونَ﴾ [الذاریات: 18]

ترجمہ: ”اوسحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے“ دوسری جگہ ارشاد ہے: ”تَتَجَاوَفِي جُنُوبِهِمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا“ [السجدة: 16]

ترجمہ: ”ان کے پہلو (رات کے وقت) اپنے بستروں سے جدا ہوتے ہیں وہ اپنے پروردگار کو ڈر اور امید (کے ملے جذبات) کے ساتھ پکار رہے ہوتے ہیں“ مطلب یہ ہے کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں۔ مگر طرز کلام سے عموماً ظاہر ہے۔ لہذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتا ہے۔

پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد بھی ہیں۔ چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبتِ فضلیہ کم ہوتی ہے۔ جو صحت کے لیے معین ہے۔ نیز اس سے چہرے پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا قول ہے: ”مَنْ كَثُرَتْ صَلَوَتُهُ فِي اللَّيْلِ حَسَنَ وَجْهَهُ بِالنَّهَارِ“ [تفسیر الکشاف للزمخشری، ج 4، ص 348]

ترجمہ: ”جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا۔ دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جائے

گا“ اور حد سے زیادہ سونے سے برودت بڑھ جاتی ہے جس سے قوتِ فکریہ کم ہو جاتی ہے اور قوتِ فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں۔ جس سے اُمورِ انتظامیہ میں خلل پڑتا ہے۔ ایسے شخص کو پابندی اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

◆ سونے میں اعتدال

اس مجاہدہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ چنانچہ آج کل چھ سات گھنٹہ ضرور سونا چاہیے اور اگر نیند بہت غالب ہو تو اس کو دفع نہ کیا جائے۔ وظیفہ کو چھوڑ کر سو رہنا چاہیے، پھر دوسرے وقت پورا کر لیا جائے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ علاجی وظیفہ کیلئے وقت ایسا مختص ہو جس میں نیند کے غالب ہونے کا کوئی احتمال نہ ہو یعنی تازہ دم ہو۔ غلبہ کی صورت میں اگر نیند کو دفع کیا جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ صفرِ امینِ اشتعال بڑھ جاتا ہے۔ سودا میں ترقی ہو جاتی ہے۔ خیالاتِ فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ان کو الہام سمجھ کر اپنے آپ کو بزرگ جانے لگتا ہے۔ بالآخر جنون ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنَ اللَّيْلِ فَاسْتَعَجَمَ الْقُرْآنَ عَلَى لِسَانِهِ فَلَمْ يَدْرِ مَا يَقُولُ فَلْيَضْطَجِعْ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 1372]

ترجمہ: ”جب تم میں سے کوئی شخص رات کو اٹھے پھر نیند کے غلبہ سے قرآن اس کی زبان سے صاف نہ نکلے اور کچھ خبر نہ ہو کہ کیا زبان سے نکل رہا ہے تو اس کو لیٹ جانا چاہیے“

بعض لوگ تقلیلِ منام وغیرہ میں بہت غلو کرتے ہیں کہ اس سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس کی طرف بھی التفات نہیں کرتے۔ اس حدیث میں اس کی اصلاح ہے اور راز اس میں دو ہیں۔ ایک یہ کہ غلو سے بعض اوقات جسمانی نقصان لاحق ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر گزرا اور پھر ضروری عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرا یہ کہ جب نیند کے غلبہ سے الفاظ صحیح نہیں نکلیں گے تو جو ثواب ان الفاظ سے متعلق ہے وہ بھی حاصل نہ ہو گا۔ پھر صرف جاگنے سے کیا فائدہ ہے؟ یہ دیکھا گیا کہ رمضان شریف کے اعتکاف

میں بعض حضرات پوری رات جاگتے ہیں اور دن کو کچھ سوتے اور کچھ اعمال میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس میں اگر ضروری نیند پوری ہو سکے تو پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اگر ضروری نیند پوری نہ ہو اور دن کو اتنا نہ سونے دیا جائے کہ رات کی کسر پوری ہو تو ایسا کرنا بہت خطرناک ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اعتکاف کو اصلاحی چلے کی شکل دی جس کے گوناگوں فوائد برآمد ہوئے جو کہ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا امت پر بہت احسان ہے۔ چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں رمضان گرمیوں میں آ رہا تھا اس لیے دن کو رات کی کسر نکل جاتی تھی۔ لیکن اگر رمضان سردیوں میں آجائے تو راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان راتوں میں معمولات میں تبدیلی لازمی ہے تاکہ سالکوں کی نیند پوری ہو ورنہ ان کو دنیاوی نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ دینی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کم سونے کا جو مجاہدہ ہے۔ اس پر آنے میں طریقہ کار ذرا مختلف ہو گا۔ اول اس میں دیکھنا ہے کہ کم سونا صرف اس لیے مطلوب ہے کہ اتنی غفلت نہ ہو کہ ضروریات دین میں رکاوٹ پڑے۔ پس اگر دین اور دنیا کی ضروریات پوری ہوں تو طب کے قوانین کے مطابق جس کو جتنی نیند کی ضرورت ہے اتنی نیند کرنے سے کوئی حرج نہیں۔ اس سے زیادہ نیند چونکہ سستی پیدا کرتی ہے اس لیے اس سے بچنا لازم ہو گا۔ اس میں صرف اتنا ضروری ہو گا کہ جس وقت دین یا جائز دنیا کے لیے جتنا جاگنے کی ضرورت ہے اتنا جاگ سکے۔ اس کا طریقہ یہ ہو گا مثلاً کسی کی ضرورت کم از کم چھ گھنٹے کی نیند ہے۔ وہ ایک دن چوبیس گھنٹے میں چار گھنٹے سو کر اگلے چوبیس گھنٹے میں آٹھ گھنٹے سو جائیں۔ پھر دو دن چار چار گھنٹے سو کر اگلے دن دس گھنٹے سو کر اپنی ضرورت پوری کر لیں۔ اس طرح تین دن چار چار گھنٹے سو کر اگلے چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے سو کر اپنی ضرورت پوری کر لے۔ اس طرح کرنے سے نفس بھی قابو میں آئے گا اور ضرورت بھی پوری ہوگی۔ یہ ایک مثال کے طور پر دیا گیا ہے۔ نیند کی ضرورت ہر ایک کی مختلف ہوتی ہے

اس لیے سب پر ایک قانون لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ایسی ترتیب بنانا ضروری ہے جس سے سستی اور کاہلی سے بچت ہو جائے اور ضرورت پوری ہو جائے۔ نیند کی وجہ سے جو بعض فرائض پر اثر پڑتا ہے اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ شیخ سالک کی دوسری عادتوں کو دیکھے کہ کہیں وہ دیر سے سونے کی وجہ سے ان فرائض سے غفلت کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی درستگی کی جائے مثلاً کھانے کے اوقات، مطالعہ اور گپ شپ وغیرہ۔ ان کی ترتیب میں اگر کچھ مسئلہ ہے تو اس کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

2.1.2.1.3... کم بولنا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ [ن: 18]

ترجمہ: ”انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے۔ ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار“ ایک حدیث میں آتا ہے: ”عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ قَالَ: لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى فَتَقْسُوا قُلُوبَكُمْ وَإِنَّ الْقَلْبَ الْقَاسِيَ بَعِيدٌ مِنَ اللَّهِ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ“ [شعب الإيمان للبيهقي، حدیث نمبر: 5023]

ترجمہ: ”امام مالک سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ذکر اللہ کے سوا تم بہت کلام نہ کیا کرو کہ اس سے تمہارے دل سخت ہو جائیں گے یعنی ان میں خشوع نہ رہے گا اور یہ بالکل تجربہ کی بات ہے اور جس دل میں قساوت ہو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے۔ لیکن تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی“ (کہ اللہ تعالیٰ سے بُعد ہو گیا کیونکہ حقیقت تو اس کی آخرت میں مشاہد ہوگی اور آثار گویہاں بھی مشاہد ہیں مگر ان کا ادراک بوجہ بے التفاتی کے نہیں ہوتا)

◆ تشریح

کم بولنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جتنے کلام کرتا ہے۔ بظاہر اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

مفید: جس میں دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہو۔

مضر: جس میں دین یا دنیا کا کوئی نقصان ہو۔

نہ مفید نہ مضر: جس میں نہ کوئی فائدہ نہ کوئی نقصان۔

اس تیسری قسم کو ہی حدیث میں لایعنی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے۔ کیونکہ وہ وقت جو ایسے کام یا کلام میں صرف کیا گیا کہ اس میں ایک دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہہ لیتا تو میزانِ عمل کا آدھا پلڑا بھر جاتا، کوئی اور مفید کام کرتا تو گناہوں کا کفارہ اور نجاتِ آخرت کا ذریعہ، کم از کم دنیا کی ضرورتوں سے بے فکری کا سبب بنتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”مِنْ حَسَنِ

السَّلَامِ الرَّعْرَعَةُ تَزْكُوهُ مَا لَا يَعْنيهِ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 3976]

ترجمہ: ”کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے“ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ”احیاء العلوم“ میں ہے کہ ”لایعنی کلام کا حساب ہو گا اور جس چیز کا حساب اور مواخذہ ہو، اس سے خلاصی یقینی نہیں۔“ [احیاء العلوم، ج 3، ص: 112]

یہ تقلیلِ کلام کا مجاہدہ تقلیلِ طعام اور تقلیلِ منام دونوں مجاہدوں سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ کھانے میں کچھ تو اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ نیز اگر زیادہ بھی کھائے گا تو ایک دو دفعہ کھالے گا پھر کہاں تک کھائے گا۔ جب ہضم نہ ہو گا خود ہی تقلیل ہو جائے گی۔ اسی طرح کہاں تک سوئے گا۔ کبھی تو جاگے گا۔ بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی نہیں کرنا پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بد ہضمی ہوتی ہے اور نہ زبان چلانے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ اختیار کرتا ہے۔ لذت کے

لیے کرتا ہے۔ سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں ان میں کثرت کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا، نیند پوری ہو جانے کے بعد پھر سونے سے جی گھبراتا ہے۔ جبکہ بولنے کی لذت ختم ہی نہیں ہوتی، بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے۔

اسی لیے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لیے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں نقصانات بہت ہیں اور ان سے کئی قسم کے گناہ وجود میں آسکتے ہیں۔ جس میں جھوٹ، غیبت، کسی انسان کا تمسخر اور نہ جانے کیا کیا۔ اس لیے اس کی تقلیل کو مجاہدے کا ایک مستقل رکن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح ہی ہو۔ باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ، غیبت و بہتان وغیرہ، وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہیں۔ جو شخص مجاہدہ تکمیلی کرے گا وہ مجاہدہ حقیقیہ کیسے ترک کر سکتا ہے۔

رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے ضرورت میں حرج ہو گا یا مخاطب کو تکلیف ہو گی۔ ضرورت کی تفسیر یہ ہے کہ ”كَوْلًا لِّتَضَرَّرَ“ یعنی بات کے نہ کرنے سے نقصان ہو۔ پس جس بات کے ترک کرنے سے دین یا دنیا کا نقصان ہو وہ بات ضروری ہے۔ مثلاً تاجر کے پاس کوئی خریدار گھٹنہ بھر تک چیزوں کی قیمتیں دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خرید لے گا۔ تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ وہ تجارت کی باتیں کرے اور جو باتیں ضرورت میں داخل ہیں ان سے قلب میں ذرہ برابر ظلمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرات عارفین کا مشاہدہ ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہے تو اس سے قلب پر اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک ریڑھی والا اگر دن بھر ”لو امرود“ پکارتا پھرے تو اس سے قلب پر ذرہ برابر بھی

ظلمت نہ آئے گی کیونکہ یہ کلام بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی اگر زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت نے تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان بند کر کے بیٹھ جاؤ، بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہو یا ذکر کرتے رہو۔ جس سے مجاہدہ تقلیل کلام کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے۔ فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے اور اسی کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے۔ جو کہ خاموش رہنے میں کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

◆ ایک اہم بات

ایک اور بات جس کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ مفید چیزوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ان کی افادیت میں یا تو کمی ہو جاتی ہے یا بعض اوقات فائدے کی جگہ نقصان ہو جاتا ہے۔ دعوت دینے کے آداب کے بارے میں تفصیلی بات ہو گئی ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے ایک خاص بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ بعض دفعہ دعوت دینے میں ہماری کثرت کلام سے مدعو کو نقصان ہو سکتا ہے۔ وہ ضد میں آکر صاف انکار کر سکتا ہے جس سے بعض دفعہ نوبت کفر تک آسکتی ہے اور بعض دفعہ اس سے ہمیں بھی نقصان ہو سکتا ہے کہ افادہ یعنی دوسروں کو نفع پہنچانے کے جوش میں استفادہ یعنی خود دوسروں سے نفع حاصل کرنے سے ہم محروم ہو سکتے ہیں۔ خاتم النبیین ﷺ کو جب خلوت کے اعمال کا حکم دیا گیا تو دوسرے اس سے کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ لہذا اتنی دعوت دینا کہ نہ خود کو نقصان پہنچے اور نہ دوسروں کو، بلکہ دونوں کو نفع پہنچے اس کا سیکھنا ضروری ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ہفتے میں دو دفعہ سے زیادہ وعظ کہنے سے منع فرمایا تھا۔ جیسا کہ مسند احمد میں ہے: عَنْ أَبِي وَائِلٍ، قَالَ: كَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّرُ كُلَّ حَبِيسٍ أَوْ اثْنَيْنِ الْأَيَّامَ، قَالَ: فَقُلْنَا: أَوْ فَقِيلَ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ: إِنَّا لَنَحِبُّ حَدِيثَكَ، وَنَشْتَهِيهِ، وَوَدِدْنَا أَنَّكَ تُذَكِّرُنَا كُلَّ يَوْمٍ، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ: ”إِنَّهُ لَا يَمْنَعُنِي

مِنْ ذَلِكَ إِلَّا آتَى أَكْرَهَ أَنْ أُمِّلَكُمْ، وَأَنِّي لَا تَخَوُّكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا
كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا۔ [مسند احمد، حدیث نمبر: 4439]

ترجمہ: ”ابو وائل کہتے ہیں: سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات یا سو مواعظ کو وعظ و نصیحت کرتے تھے، ہم نے کہا: اے ابو عبد الرحمن! ہم آپ کی گفتگو پسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ و نصیحت کریں، جواب میں سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس سے روکنے والی چیز یہ ہے کہ میں تمہیں اکتا دینے کو ناپسند کرتا ہوں اور میں نصیحت سے تمہاری ایسے ہی نگہداشت کرتا ہوں، جیسے رسول اللہ ﷺ ہماری کرتے تھے ”اسی طرح کی ایک روایت بخاری شریف میں ایک دن کے بارے میں ہے۔ یعنی عام طور پر عمومی جگہوں پر ایسا نہیں کرنا چاہیے، خانقاہیں تربیت کیلیے اور مدرسے تعلیم کیلیے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ مدارس تو ہوتے ہی تعلیم کے لیے ہیں اور وہاں تو ایک دن میں بھی کئی مجالس ہو سکتی ہیں۔ لیکن تعلیمی کلاس، تقریر اور وعظ میں فرق ہوتا ہے اور سب کے اپنے اپنے میدان اور ضروریات ہیں۔ تربیتی وعظ جو خانقاہوں میں ہوتے ہیں وہ ابتدائی دور میں تو ہوا ہی نہیں کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ضرورت کے درجے میں شروع ہوئے اس لیے حالات کے مطابق اس میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔

چونکہ اس مسئلے کا تعلق عوام کے ساتھ بھی ہے تو ممکن ہے وہ ان احتیاطوں کو خاطر میں لانا کم علمی سے ضروری نہ سمجھے۔ اس لیے مشائخ اور جماعت کے ذمہ داروں کو اس طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ اس وقت اگر بعض حضرات نے بوجہ تقلیلِ طعام اور تقلیلِ منام کے مجاہدے کو متروک سمجھا اور بعض حضرات نے اگر تقلیلِ کلام اور تقلیلِ خلط مع الانام کو متروک سمجھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجاہدہ سرے سے ختم ہی ہوا۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ نہ تو تقلیلِ طعام متروک ہے نہ تقلیلِ منام اور نہ ہی تقلیلِ کلام اور تقلیلِ خلط مع الانام سے غفلت مناسب ہے۔ یہ ہر شخص کے حال کے مطابق

بات ہوتی ہے۔ اس لیے سب کو چاہیے کہ اس مسئلے میں فیصلہ شیخ پر چھوڑا جائے کہ وہ کسی کے لیے کیا مجاہدہ تجویز کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

◆ طریق علاج

بات کرنے سے قبل تھوڑی دیر تامل کریں اور سوچیں کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ جو کہ ”سمیع و بصیر“ ہے۔ ناخوش تو نہ ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی بات منہ سے گناہ کی نہ نکلے گی اور اگر پھر بھی طبیعت میں ایسی بات کرنے کا تقاضا ہو تو اس وقت ہمت سے کام لے۔ اگر کوئی بات ایسی منہ سے نکل جائے تو اس کا تدارک اس طرح کرے کہ فوراً توبہ کرے اور اگر کسی کو گالی دی ہو یا کسی سے تمسخر کیا ہو یا چغل خوری یا غیبت کی ہو تو توبہ کے بعد اس صاحبِ حق سے بھی معافی مانگے اور اگر کسی وجہ سے معاف کرانا دشوار ہو تو اس شخص کے لیے اور اس کے ساتھ اپنے لیے استغفار کرتے رہیں۔ اس طرح ”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَ لَنَا“ ”اے اللہ ہماری اور اس کی مغفرت فرما۔“ پڑھیں۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار نے ان دو شعروں میں خاموشی کے فوائد کے مضمون کو کس کمال جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اس شعر کا ترجمہ یوں ہے:

کوئی کام زیادہ لب سینے سے موثر نہیں سوچھا
نموشی سے مرے دل نے کوئی بہتر نہیں سوچھا

اس کے فوائد اتنے ہیں کہ زبان پر آ نہیں سکتے، یعنی میرے ذہن میں خاموشی سے بہتر کوئی مضمون نہیں آتا اور خاموشی اتنے فوائد رکھتی ہے کہ ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔

سینہ ہارا خامشی گنجینہ گوہر کند
یاد دارم از صدف این نکتہ سر بستہ را

خامشی سینے کو گوہر سے مزین کرتی ہے
راز سر بستہ یہ سپی نے مجھے سمجھایا ہے

مطلب یہ ہے کہ سپی پانی کے قطرے کو اپنے اندر لے کر بند ہو جاتی ہے تو وہ پانی

کا قطرہ موتی بن جاتا ہے۔ اس طرح انسان کا سینہ بھی لب بند کرنے سے حکمت کے موتیوں کا خزانہ بن جاتا ہے۔

ان سب پر عمل تب ہو سکتا ہے کہ جب خاموش رہنا آجائے۔ اس لیے ابتدا میں خاموش رہنے کے لیے مجاہدہ کی ترتیب مناسب رہے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے: ”مَنْ صَمَّتْ نَجَّأ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2501]

ترجمہ: ”جو چپ رہا اس نے نجات پائی“ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آدمی بالکل بات نہ کرے، لیکن یہ ضرور ہونا چاہیے کہ ایسی بات نہ کرے جس میں گناہ ہو۔ لایعنی سے بچنے میں دین کی حفاظت ہے۔ اس لیے کم بولنے کی عادت ڈالنے کے لیے پہلے بالکل خاموش رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور بعد میں ضرورت کے مطابق بولنے کی اجازت دی جائے گی۔

◆ خاموش رہنے کا مجاہدہ

جہاں زور دار بحث ہو بالخصوص جب اپنی دلچسپی کا موضوع زیر بحث ہو، وہاں کم از کم دس منٹ تک بتکلف خاموش رہنا اور دل میں دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ کسی اور ساتھی کے دل میں مناسب بات لے آئے اور وہ بیان کر دے۔ یہ مجاہدہ بتدریج آدھے گھنٹے تک بڑھایا جائے تاکہ پہلے تو لیں پھر بولیں پر عمل کرنے کے لیے سوچنے کا وقت ملے۔ پھر اس پر عمل ہو۔

4.1.2.1... لوگوں کے ساتھ کم ملنا جلنا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: ”الْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيسِ السُّوءِ، وَالْجَلِيسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنْ الْوَحْدَةِ“ [المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: 5466]

ترجمہ: ”بری صحبت سے خلوت اچھی ہے اور اچھی صحبت خلوت سے اچھی ہے۔

معاشرے میں آنکھ، کان، منہ کا استعمال عموماً غلط ہوتا رہتا ہے جس سے دل متاثر ہوتا ہے۔ دوسری طرف دل اگر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو آنکھ، کان، منہ، ذہن

صحیح استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ دل ان اعضا کو متاثر کرتا ہے اور یہ اعضاء دل سے اثر لیتے ہیں۔ لہذا ان کی اصلاح کی کیا صورت بن سکتی ہے۔ منتقد مین صوفیا اس کے لیے خلوت تجویز فرماتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ یہ اعضا جب غلط استعمال نہیں ہوتے اور ذکر اللہ کے ذریعے دل کی صفائی ہوتی تو دل اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ مانوس ہو جاتا اور بیدار ہو جاتا، ساتھ ساتھ شیخ کے ساتھ جلوت سے یہ مزید منور ہوتا۔ اس کے بعد جب ماحول میں باہر آتے تو دوسرے لوگ ان سے مستفید ہوتے۔ لیکن ان کے ساتھ مشغول ہونے سے جو اثر ان کے قلوب پر پڑتا تو اس کو پھر مشائخ کی صحبت اور خلوت و اعتکاف کے ساتھ دور فرماتے۔ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے کہ ”مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے تو ہمیشہ اہل خیر اور ذکر کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں، پھر بھی عمومی اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعہ اس کو غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں جا کر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا“ دوسروں سے بھی کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ”دین کے کام کرنے والوں کو چاہیے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوتوں کے ذکر و فکر کے ذریعہ دھویا کریں۔“ [ملفوظات مولانا محمد

الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تصنیف: منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ملفوظ نمبر 85]

قلتِ خلط مع الانام کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے غیر ضروری میل جول نہ بڑھایا جائے، یاد رکھنا چاہیے کہ ماسوی اللہ سے تین قسم کے تعلقات ہیں۔

محمود تعلق: جس کا شریعت نے امر فرمایا ہے وہ تو عین اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اس کو ختم کرنا ناجائز ہے۔

مذموم تعلق: جس کی شریعت میں ممانعت ہے۔ اس کو ختم کرنا واجب ہے۔

مباح تعلق: جو نہ طاعت ہے نہ معصیت۔ اس کو بالکل ختم کرنا ضروری نہیں البتہ اس کو کم کرنا ضروری ہے۔

جہاں تعلق کو ختم کرنے کی تعلیم ہے وہاں مراد محمود تعلق نہیں بلکہ مذموم و مباح

ہے۔ مگر مذموم کو تو ترک کیا جائے گا اور مباح کو کم کرنا ہو گا اور جب تک خالق کے ساتھ تعلق راسخ نہ ہو، مخلوق کے ساتھ بلا ضرورت تعلق سراسر نقصان ہے اور جو فائدہ اس میں سوچا جاتا ہے کہ اس میں مخلوق کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ تو مخلوق کا حق بھی جیسی ادا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ تعلق راسخ ہو جائے۔ ورنہ نہ تو خالق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ لوگوں کا حق۔ یہ ایک کا نہیں بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا تجربہ ہے اور ہم سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیمؑ بلخی اور حضرت شاہ شجاعؒ کرمانیؒ کے واقعات معلوم ہیں اور خلفائے راشدین پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے۔

خود کو پاؤں پہ کر قیاس نہیں

قولِ فیصل اس خلوت کے بارے میں یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی ضروری حاجت دینی یا دنیوی دوسروں کے ساتھ نہ ہو اور نہ دوسروں کو کوئی ایسی دینی یا دنیوی حاجت اس شخص کے ساتھ ہو۔ اس کے لیے خلوت جائز ہے۔ بلکہ افضل ہے۔ خصوصاً فتنوں اور شرور کے دنوں میں جب کہ آپس میں ملنے جلنے کی مشکلات اور تشویشات و ایذاؤں پر صبر کرنے کی توقع و ہمت نہ ہو۔ احادیث میں جو ترغیب آئی ہے۔ وہ ایسی ہی حالت میں ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ”رَجُلٌ مُّعْتَزِلٌ فِي شَعْبٍ مِنَ الشَّعَابِ يَعْْبُدُ رَبَّهُ وَيَدْعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 4995]

ترجمہ: ”پھر وہ آدمی جو پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں تنہا رہتا ہے۔ اپنے رب کی عبادت کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا ہے“ دوسری حدیث میں ہے: ”يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَمٌّ يَتَّبَعُ بِهَا شَعْفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفْرُبُ دِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3124]

ترجمہ: ”ایسا وقت نزدیک آنے والا ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی۔ جن کو ساتھ لیے پہاڑیوں کی چوٹیوں اور بارش کے جمع ہونے کی جگہوں (نالوں

میں جبکہ وہ خشک ہو جائیں) اپنے دین کو لیے ہوئے فتنوں سے بھاگا بھاگا پھرے گا۔“ اصحابِ کہف کے واقعے سے بھی سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اور جس شخص کی دوسروں کے ساتھ یا تو کوئی ضروری حاجت وابستہ ہو، خواہ دنیوی ہو جیسے اہل و عیال کے لیے نفقہ کی تلاش جبکہ توکل پر قادر نہ ہو یا دینی حاجت ہو مثلاً تحصیلِ علومِ ضروریہ وغیرہ۔ اس کے لیے خلوت جائز نہیں۔ اس طرح اگر اس کے ساتھ دوسروں کی حاجتِ دنیوی یا دینی متعلق ہوں تو بھی خلوت جائز نہیں اور بعض احادیث سے جو خلوت کی ممانعت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ایسی ہی دونوں حالتوں پر محمول ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو تبتل یعنی کنارہ کشی سے منع فرمایا گیا تھا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ: "لَقَدْ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَانَ بْنَ مَظْعُونٍ عَنِ التَّبْتُلِ" [مسند ابی عوانہ، حدیث نمبر: 3997]

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون کو تبتل سے منع فرمایا تھا۔" اس وقت ان کو بھی تحصیلِ علومِ دین کی حاجت تھی۔ ادھر مسلمانوں کو بھی ان کی طرف دینی حاجت تھی بالخصوص اعلائے کلمۃ اللہ و ترقیِ اسلام ان کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ یہ تفصیل اس خلوت کے بارے میں ہے جس کو دائمی طور پر اختیار کرنا ہو۔ اگر اس سے مراد خلوت چند روزہ ہو تو اس کی ضرورت بسا اوقات مبتدی سالک کے لیے واقع ہوتی ہے۔

◆ خلوت کے فائدے

گناہوں سے بھی اجتناب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ایسی گوشہ نشینی ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت ہو، کان کی بھی حفاظت ہو، دل کی بھی حفاظت ہو، قصد کسی غیر کا خیال دل میں نہ لائے۔ اگر آجائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اس کو دفع کر دے۔ ایسی عزلت یعنی گوشہ نشینی میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی اور ظاہر ہے دفعِ مضرت جلبِ منفعت پر مقدم ہے یعنی موہوم فائدے پر یقینی نقصان سے بچنا مقدم ہے۔ تو ایسی صورت میں گوشہ نشینی اختلاط پر مقدم کیوں نہ ہوگی۔ جبکہ اختلاط میں گو منافع

بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ نیز اختلاط کے ساتھ قلتِ کلام بہت دشوار ہے۔ یہ کام صدیقین و کاملین کا ہے ورنہ اکثر اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنی پڑتی ہیں۔ جن لوگوں کا وقت خلوت کے لیے مخصوص نہیں ہوتا، رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔

پہلے وقتوں میں لوگوں سے خلوت نشینی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس میں الگ تھلگ رہا جاتا تھا۔ نہ لوگوں کے ساتھ ملنا ہوتا تھا۔ نہ لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ بس یہ کافی ہو جاتا تھا۔ لیکن آج کل موبائل کے اس دور میں اگر کسی کے پاس موبائل ہو تو وہ خلوت میں نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ موبائل کے ساتھ ہر وقت کا جو تعلق ہوتا ہے وہ بالکل جلوت کا کام کرتا ہے۔ یعنی باہر کی چیزوں سے اثر لینا اور باہر کی چیزوں پر اثر انداز ہونا، یہ موبائل کے ذریعہ سے بھی ممکن ہے۔ لہذا اب اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر اشد ضرورت نہ ہو تو موبائل ساتھ نہیں رکھنا چاہیے اور اگر اشد ضرورت ہو تو اس کے لیے کوئی ایسی ترتیب بنانی چاہیے کہ موبائل صرف اسی وقت ہی استعمال ہو جس وقت اشد ضرورت ہو، اس کے علاوہ استعمال نہ ہو سکے۔

◆ اختلاط کے فائدے

اور جن حالات میں بعض افراد کے لیے جلوت یعنی اختلاط مفید ہے ان کے لیے اس کے یہ فوائد ہیں۔

- (1) تعلیم و تعلم اس پر موقوف ہے۔ گوشہ نشینی سے تعلیم و تعلم کا باب بند ہو جاتا ہے۔
- (2) اختلاط میں خدمتِ خلق کا موقع ملتا ہے۔
- (3) جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص گوشہ نشین ہو گا وہ جماعت کا ثواب اور خدمتِ خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔
- (4) اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے۔
- (5) دین کا فیض ہوتا ہے۔ اختلاط کے بغیر بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے۔

◆ مختصر نتیجہ

سائلین کے لیے تو شیخ یہ تجویز کرے گا کہ ان کے لیے کن حالات میں خلوت مفید ہے اور کن حالات میں جلوت کیونکہ ہر ایک کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن کا کسی کتاب میں احاطہ ممکن نہیں۔ مشائخ کے لیے البتہ افادے کے لیے جلوت مفید ہوتی ہے۔ لیکن نسبت مع الخالق کو تازہ رکھنے کے لیے کچھ وقت بالخصوص رات کو جس میں افضل ترین رات کا آخری حصہ ہے نکالنا چاہیے جس میں وہ ہوں اور ان کا اللہ تعالیٰ۔

ہے عاشق و معشوق میں جو راز درمیاں
اس کی خبر کرانا کاتبین کو ہے کہاں

◆ طریق کار

ہر کام اس کے اوقات مقررہ پر کریں۔ دنیا کا کام اپنے وقت میں اور وظائف اپنے وقت میں۔ حتیٰ کہ گاہ گاہ لطیف اور مختصر مزاح بھی اپنے اور دوسرے مسلمانوں کی تفریح و تطیبِ قلب کے لیے اپنے موقع میں کر لینا چاہیے۔ اس طرح سب کام چلتے رہیں گے ورنہ بالکل گوشہ نشین ہونے سے بعض اوقات طبیعت میں شوق اور امنگ کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرنا سالک کے لیے بہت ہی نافع ہوتا ہے۔ مگر جتنی ضرورت ہو اتنا تو ٹھیک ہے اس سے زیادہ اختلاط نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے روحانی نقصان کا خطرہ ہے۔ سالک کے لیے گوشہ نشینی بہتر ہے۔ زیادہ تعلقات نہیں بڑھانے چاہئیں نہ دوستی نہ دشمنی، کہ ذکر اللہ میں خلل ہو گا۔ جب تک خلوت میں دل خدا تعالیٰ کے ساتھ لگا رہے۔ خلوت میں رہے اور جب خلوت میں انتشار اور ہجومِ خطرات ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھے۔ اس سے خطرات دفع ہوں گے اور اس وقت یہ جلوت بھی خلوت کے حکم میں ہے۔

یہ چار قسمیں قلتِ کلام، قلتِ طعام، قلتِ منام اور قلتِ اختلاط مع الانام اجمالی

مجاہدہ کی ہیں۔ ان اجمالی مجاہدات کے علاوہ بعض مجاہدات کی وقتی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لیے ان کی بھی تفصیل دی جاتی ہے۔

2.1.2.1.5... حبِ جاہ کو کم کرنے کا مجاہدہ

- (1) سلام میں پہل کرنا۔
- (2) اپنے مخالفین کے لیے دعا کرنا۔
- (3) ان کی جائز چیزوں کی تعریف کرنا۔
- (4) مسجد والوں کی جوتیوں کو سیدھا کرنا۔
- (5) لوگوں کے لیے بازار سے سود لانے کی ممکن کوشش کرنا۔
- (6) غریب لوگوں کے ساتھ اگر کوئی مفسدہ نہ ہو تو اصلاح کی نیت سے بیٹھنا۔

2.1.2.1.6... حبِ مال کو کم کرنا

- (1) اللہ تعالیٰ کے راستے میں نفلی انفاق کرنا۔
- (2) صالحین کی کبھی کبھی دعوت کرنا۔
- (3) اس کے بارے میں اگر کوئی عالم ہو تو وہ مراقبہ میں اپنے آپ کو تلقین کرتا رہے اور مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیبات کو تصور میں سامنے لاتا رہے۔

2.1.2.1.7... مجاہدہ غصہ بصر

یہ مجاہدہ آج کل بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے خلوت میں پہلے دن پانچ منٹ نیچے دیکھنا ہو گا اور روزانہ پندرہ دن تک ایک ایک منٹ بڑھانا ہو گا۔ اس کے بعد جلوت میں آکر پانچ منٹ نیچے دیکھنا ہو گا اور پھر روزانہ پندرہ دن تک ایک ایک منٹ بڑھانا ہو گا۔ اس سے نظریں نیچے کرنے کی مشق ہو جائے گی جس کو بعد میں برقرار رکھنا ہو گا۔

اس کے علاوہ کچھ نفسیاتی مجاہدات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کی ضرورت صرف فرائض واجبات کی تکمیل اور حرام اور مکروہ تحریمی سے بچنے تک ہے۔ اس کے بعد سنتوں پر بتدریج عمل بڑھانا ہوتا ہے کیونکہ اس پر عمل بڑا مجاہدہ ہے۔ اس سے باقی تکمیل ہو جاتی ہے۔

2.1.2.2... فاعلہ

فاعلہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔

2.1.2.2.1... جس میں خطرہ نہیں مثلاً ذکر، شغل اور مراقبہ۔

2.1.2.2.2... جس میں خطرہ ہے مثلاً تصویر شیخ، عشق مجازی اور سماع۔

ان میں سے ہر دو کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

2.1.2.2.1... وہ فاعلہ جس میں خطرہ نہیں

2.1.2.2.1.1... ذکر

صوفیائی اصطلاح میں ذکر سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا کی یاد میں تمام غیر خدا کو بھول جائے اور دل کی توجہ سے خدا کا قرب اور معیت حاصل کرے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ ”أَنَا مَعَ عَبْدِي إِذَا هُوَ ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاہُ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 10968]

ترجمہ: ”جب میرا بندہ مجھ کو یاد کرتا ہے اور میرے نام سے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں تو میں اس کے ساتھ ہو جاتا ہوں۔“ ”أَنَا جَلِيسٌ مِّنْ ذَكَرَنِي“ [الزہد لام احمد، ص 153]

ترجمہ: ”جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ہمنشین ہوں“ اور ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلاً﴾ [الاحزاب: 42]

ترجمہ: ”اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔“ نیز فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا

وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ﴾ [النساء: 103]

ترجمہ: ”اللہ کو (ہر حالت میں) یاد کرتے رہو، کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے

بھی۔“ جیسا کہ محاورہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرو۔ ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمہ وقت ذکر مطلوب ہے۔ اس کی مدح بھی ہے۔ فضیلت بھی ہے اور ترغیب بھی ہے۔

لہذا پوری توجہ سے یادِ الہی میں اس طرح منہمک ہونا چاہیے کہ بندہ اپنے آپ سے بالکل بے خبر ہو جائے۔ یہ حقیقی ذکر ہے کہ نفس کی خواہش سے کچھ بھی نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کی خوشنودی کے لیے کرے۔ ”كُلُّ مُطِيعٍ لِلَّهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ“ کے مطابق ہر عمل میں ذکر کا ظہور ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ذکر اللہ ہے۔ مثلاً روزے کی حالت میں انسان تنہائی میں بھی کچھ نہیں کھاتا۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ اس کو اللہ تعالیٰ یاد ہے۔ اس طرح نماز میں انسان اسی لیے جو سجدہ ریز ہے۔ وہ اسی لیے ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ یاد ہے۔ یہی اصل ذکر ہے۔ بشرطیکہ کامل استحضار کے ساتھ ہو۔ علاحدگی ذکر اسی استحضار کو بڑھانے کا طریقہ ہے۔

ذکر کی قسمیں

ذکر کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اس کی دو بڑی قسمیں مندرجہ ذیل ہیں۔ مسنون ذکر اور علاحدگی ذکر۔

2.1.2.2.1.1.1... مسنون ذکر

مسنون ذکر غذا کی طرح ہے اور علاحدگی ذکر دوا کی طرح۔ مسنون ذکر اصل ذکر ہے۔ اس پر ثواب ہے اور کثرت سے اس کے کرنے کا حکم قرآن میں آیا ہے اور احادیث شریفہ میں اس کے بے شمار فضائل موجود ہیں۔ لیکن اس ذکر سے وہ فوائد تب حاصل ہو سکتے ہیں جب انسان روحانی طور پر بیمار نہ ہو۔ جیسا کہ انسان کو غذا تب نفع پہنچاتی ہے جب صحت حاصل ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جب تک مطلوبہ روحانی صحت حاصل نہ ہو تو ذکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ذکر سے انسان کی روحانی جان کی بقا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ رَبَّهُ مَثَلُ

الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6044]

ترجمہ: ”جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی طرح ہے۔“ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے ارشاد فرمایا کہ ذکر چاہے کتنا ہی غفلت سے کیا جائے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ذکر ہی غفلت کو دور کرنے والا ہے۔ لیکن صحت کی حالت میں غذا کا جو فائدہ ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روحانی صحت جب حاصل ہو تو پھر ذکر اللہ کا کتنا فائدہ ہو گا۔

2.1.2.1.1.2... علاجی ذکر

آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: إِنَّ كُلَّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ، وَإِنَّ صِقَالَةَ الْقَلْبِ ذِكْرُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَمَا مِنْ شَيْءٍ أَنْجَى مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ. قَالُوا: وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ؟ قَالَ: ذَلُوا أَنْ يَضْرِبَ بِسَيْفِهِ حَتَّى يَنْقَطِعَ.“ [الدعوات الكبير للبيهقي، حديث نمبر: 19]

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چیز کو صاف کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں اور دلوں کو صاف کرنے والا اللہ کا ذکر ہے۔ (صقالہ: مانجھنے کو کہتے ہیں کہ جس سے تانبے، پتیل، لوہے کے برتن مانجھے جاتے ہیں اور برتن میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے اللہ کے ذکر سے دل کا رنگ دور ہو جاتا ہے آگے۔ فرماتے ہیں) بندے کو کوئی شے ذکر اللہ سے زیادہ نجات دینے والی نہیں (صحابہ کرام نے) عرض کیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی نہیں (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا یہاں تک تلوار چلائے کہ وہ ٹوٹ جائے تو بھی نہیں۔“

اصل میں ذکر اور تمام طاعات سے صحیح معنوں میں انسان تب فائدہ حاصل کر سکتا ہے جب ان میں اللہ تعالیٰ یاد ہو، اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ تمام موانع دور کرنے ضروری ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے

اور اسی کے لیے ہر کام کو کرنے سے روکنے والے ہوں گے اور وہ ہیں نفس کی خواہشات اور دل کے منفی جذبات۔ یہ چیزیں دور ہوتی ہیں مجاہدہ اور علاجی ذکر سے۔ حدیث شریف میں جو ذکر کو صقلہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے یہی علاجی ذکر مراد ہے۔ کیونکہ فرمان نبوی ﷺ ”حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ“ [مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 5213] کی رو سے دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے اور دل سے دنیا کی محبت کو نکالنے کے لیے علاجی اور اصلاحی ذکر کیا جاتا ہے۔

نماز سے اللہ تعالیٰ کی یاد حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دنیا کی محبت حائل! حج سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی محبت حائل! جب تک اس حائل کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ان عبادات کے ثمرات کو مکمل طور پر نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ خود مسنون ذکر سے بعض دفعہ عجب ہو جاتا ہے اور بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنے اوپر نظر جاتی ہے کہ میں بڑا ذکر ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علاجی ذکر سے ہی مسنون ذکر کے اور جملہ طاعتوں کے ثمرات حاصل کیے جاسکتے ہیں بشرطیکہ نفس کی بھی اصلاح ہو چکی ہو۔

◆ علاجی ذکر اور اس میں ثواب

علاجی ذکر علاج کے لیے کیا جاتا ہے اس لیے اس سے علاج ہو جاتا ہے۔ تاہم اس سے ثواب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اس میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اس میں ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ منصوص نہیں ہوتے، تاکہ بدعت کا احتمال نہ ہو اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں الفاظ ذکر سے ثواب ہوتا ہے۔ مگر اس میں جو ضرب و جہر علا جاً شامل کیا گیا ہے اس میں ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سالک نے پوچھا تھا کہ ذکر نفی و اثبات میں تجوید کے قواعد کا خیال نہیں رکھا جاتا؟ فرمایا: اس میں مقصود کیفیت حاصل کرنا ہے الفاظ نہیں۔ یعنی اس میں الفاظ ذریعہ ہیں کیفیت کا، یہ بذاتِ خود مقصود نہیں۔

◆ علاجی ذکر میں اجتہاد

چونکہ یہ ذکر علاج ہے۔ تو جیسا کہ طب میں اجتہاد کبھی بند نہیں ہو سکتا، اسی طرح اس میں بھی اجتہاد کا سلسلہ جاری ہے کیونکہ یہ سب مخصوص نہیں۔ تجرباتی ہیں۔ جس شیخ نے اس میں تجربے سے جو سیکھا اس کو آگے بڑھا دیا۔ جیسے فقہ میں مجتہد مطلق اور مجتہد فی المذہب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان سلسلوں کے بانی حضرات نے یہی کام کیا اور اپنے سلسلوں کے بنیادی اصولوں کا تعین کیا۔ آگے ان کے متبعین نے وقت کے ساتھ ساتھ بضرورت اس میں کمی بیشی کی لیکن ان کا اصل رنگ چھایا رہا۔ اس لیے باوجود اس کے کہ ان سلسلوں کے طرق میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ مگر ان کی اصل بنیادیں موجود ہیں۔ البتہ چونکہ یہ ذرائع کے طور پر ہیں اور مقصود نہیں اس لیے ان کو اس درجے سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے اور کسی کا مقام اس بنیاد پر نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سے سلسلے ہیں بلکہ اس بنیاد پر ہو گا کہ ان کو تقویٰ کس درجہ کا حاصل ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب کتنا حاصل ہے۔ چونکہ اس کا حتمی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم بھی صرف اس حد تک بات کر سکتے ہیں۔ حقیقتِ حال کا اللہ تعالیٰ ہی پتا کو ہے۔

چونکہ علاجی ذکر اجتہادی اور حسبِ ضرورت ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں تبدیلی بھی اجتہادی اور حسبِ ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اگر مروجہ اذکار سے ضرورت پوری ہو رہی ہو تو اس میں تبدیلی بلا ضرورت ہوگی اور اگر پوری نہ ہو رہی ہو اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس میں تبدیلی ناگزیر ہو تو اس میں تبدیلی ضروری ہوگی۔ اسی لیے آنے والی سطور میں مروجہ اذکار کی بعض قسمیں دی جا رہی ہیں تاکہ اگر ان سے استفادہ ممکن ہو تو ان سے استفادہ کیا جائے، بلا ضرورت تبدیلی کر کے انتشار کا باعث نہ ہوں۔ بصورت دیگر اجتہاد کا دروازہ تو کھلا ہے۔ ممکن ہے جو قسمیں ہم بیان کر رہے ہوں ان میں بعض مروجہ اذکار تک ہماری رسائی نہ ہوئی ہو، لہذا اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ ہمارے دیے ہوئے اذکار ہی درست ہیں اور باقی غلط، حالات کو دیکھ کر ان سے استفادہ ممکن ہو تو بضرورت استفادہ کیا جائے۔

◆ اذکار کا گرم اور سرد ہونا

جہاں تک اذکار کے گرم اور سرد ہونے کی بات ہے اس کے بارے میں جتنی باتیں ہیں وہ سب تجرباتی ہیں۔ اس لیے نہ تو اس کا انکار ہے اور نہ ان پر اصرار ہے۔ البتہ چونکہ طبیعتیں بھی مختلف ہیں۔ اس لیے مختلف اذکار کا مختلف لوگوں پر مختلف اثر ہوگا۔ لہذا اس کے لیے کوئی حتمی قاعدہ کلیہ بنانا آسان نہیں۔ تاہم یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ شیخ کامل ہوتا ہی اس لیے ہے کہ وہ مرید کا مزاج اور اس کے حالات دیکھ کر علاج کرے۔ کسی کو مجاہدہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو ذکر و مراقبہ کی اور ان میں بھی وقت کے ساتھ کمی پیشی ہوتی رہتی ہے۔ حضرت سید تنظیم الحق حلیمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی شیخ کو کشف نہ بھی ہوتا ہو، لیکن اگر وہ کامل ہو تو اس کو مرید کے بارے اتنا کشف ہو جاتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دن باہر جاتے ہوئے ایک صاحب نے ہمارے شیخ (حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ) سے پوچھا کہ کیا میں ”اللَّهُ اللَّهُ“ کر لیا کروں؟ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں کر لیا کرو۔ جب وہ باہر نکل گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس بلایا اور فرمایا کہ نہیں تم ”اللَّهُ اللَّهُ“ کرنے کی بجائے درود شریف پڑھا لیا کرو۔ اسی طرح خود میرا ذکر مدت دراز تک حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے 100 دفعہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“، 100 دفعہ ”اللَّهُ اللَّهُ“، 100 دفعہ ”اللَّهُ“ سے زیادہ نہیں بڑھایا۔ میرے بار بار درخواست کرنے کے باوجود فرماتے تھے کہ: کیا تیرے پاس وقت ہے؟ چنانچہ میرا ذکر نہیں بڑھایا کرتے۔ اس کے بعد ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ 100 دفعہ کا اضافہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر اچانک ایک دن فرمایا جو نسا ذکر کرنا چاہو اور جتنی مرتبہ چاہو کر سکتے ہو۔ اس وقت میرے مراقبات خود بخود شروع ہو گئے تھے۔

◆ علاجی ذکر کی مروجہ اقسام

غور طلب: یہ حصہ صرف مشائخ کرام کے لیے ہے۔ زیر تربیت حضرات اس سے

براہ راست استفادہ کی کوشش نہ کریں۔

یوں تو ذکر کی اقسام بہت ہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ لیکن چونکہ حدیث شریف

میں آیا ہے: ”أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3383]۔ اس لیے اکثر مشائخ اس ذکر سے ابتدا کرتے اور اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کو نفی اثبات کا ذکر کہتے ہیں۔ کم و بیش ہر سلسلے میں یہ کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ چاہے لسانی، چاہے جبری، چاہے خفی۔ یہ سارے اذکار کی جان ہے۔ ایک تو یہ مسنون ذکر بھی ہے اور اس کی ضرب بھی آسان ہے اور اس کو کرنا بھی آسان ہے۔ قادریہ سلسلے میں اگر غور کیا جائے تو اس کی ابتدا میں سانس کے ساتھ جو ”هُوَ“ کی ضرب تھی وہ ان کا خاص ذکر تھا۔ اسی سے قادری مشائخ رحمہم اللہ نے ”اللَّهُ هُوَ“ اور ”هُوَ اللَّهُ“ کا ذکر بھی بنایا تھا۔ ”هُوَ“ اسم ضمیر ہے۔ اس لیے اس ذکر میں ذات کی طرف اشارہ ہے۔ ذات کے نام کی طرف نہیں۔ اس لیے اگر کسی کو اس سے مناسبت ہو تو اس سے ذات باری تعالیٰ کا استحضار بغیر کیفیت و تشبیہ کے بہت جلدی نصیب ہو سکتا ہے۔ احقر نے اپنے اذکار میں قادریہ طریقے کی مناسبت سے جو ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کا ذکر منتخب کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی ان دو اذکار نفی اثبات اور ”هُوَ“ کا جمع کرنا ہے۔

بعض حضرات کو اس ذکر سے اشکال ہوتا ہے کہ یہ ثابت ہے یا نہیں۔ تو بندہ عرض کرتا ہے کہ اگر یہ ثابت نہیں تو پھر کون سا ذکر ثابت ہے۔ ﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمِنُ الْعَزِيزُ الْحَبِيبُ

الْمُتَكَبِّرُ﴾ [الحشر: 23]

اس آیت کریمہ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو دائیں بائیں ہر دو جانب سے اس کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کا تعارف ہے کہ وہ اللہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی الہ (معبود) نہیں۔ جو الْمَلِكُ (بادشاہ)، الْقُدُّوسُ (تقدس کا مالک)، السَّلَامُ (سلامتی دینے والا)، الْمُؤْمِنُ (امن بخشنے والا)، الْمُهَيَّمِنُ (سب کا نگہبان)، الْعَزِيزُ (بڑے اقتدار والا)، الْحَبِيبُ (ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا) اور الْمُتَكَبِّرُ (بڑائی کا مالک) ہے۔ خط کشیدہ حصے پر اچھی طرح غور کیا جائے تاکہ یہ بات خوب سمجھ میں آجائے۔

سہروردی سلسلے کا خاص ذکر ”حَقُّ اللَّهِ“ تھا۔ آج کل ملنگ لوگ جوش میں جو نعرہ

ماتے ہیں: ”حَقُّ آدَلَّةٌ“ غالباً یہ اسی کی باقیات میں سے ہے۔ اسی سے بعد میں ”حَقُّ هُوَ“ اور ”هُوَ حَقُّ“ کا ذکر شروع ہوا۔ بارہ شیخ میں جو ”لَا آدَلَّةَ“ کا ذکر ہے وہی چشتیہ سلسلے کا خاص ذکر ہے۔ اس لیے جس کی نسبت چشتی ہو اس کو نفی اثبات جہر و ضرب کے ساتھ اور ”لَا آدَلَّةَ“ جو ضرب کے ساتھ ہو، اس سے کافی فائدہ ہو گا۔ ”آدَلَّةٌ هُوَ“ اور ”هُوَ آدَلَّةٌ“ کا ذکر بھی سلسلوں کے امتزاج کے ساتھ جاری ہے۔ نقشبندی حضرات کے ہاں خفی ذکر، لطائف کے دور اور مراقبات کے ذریعے جذبِ مبتدی کا حصول ہوتا ہے۔

اب ذرا ذکر کی کچھ بنیادی باتیں بتائی جاتی ہیں۔

◆ ذکر کی قسمیں

ذکر ناسوتی، ملکوتی، جبروتی، لاهوتی

ذکر کے لحاظ سے چار عالم سلسلوں میں متعارف ہیں۔

ناسوت: اجسام و محسوسات کی دنیا۔

ملکوت: فرشتوں اور نفوس و ارواح کی دنیا۔

جبروت: آسمانی دنیا ستاروں سے اوپر کا مقام۔

لاہوت: مقامِ محویت یا مقامِ فنا، یہ جہات و حدود سے منزہ ہے۔

ذکر کا مقصد چونکہ بندے کا نفس کی غلامی سے نکل کر نفس کے مالک کا بندہ بننا ہے۔ اس لیے اس میں ترتیب کے ساتھ بندے کو نفس سے نکالنے اور اس کو حق کے پاس لے جانے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اس ذکر کے فوائد کو حاصل کرنے کے لیے نفس کی جن آلائشوں کا علاج بغیر کسی خاص مجاہدہ کے ممکن نہ ہو، ان مجاہدات سے بضرورت سالک کو گزارا جاتا ہے تاکہ ذکر کے فوائد اچھی طرح حاصل ہو جائیں۔ مثلاً غصّ بصر کا مجاہدہ، کھانے پینے پر مناسب کنٹرول کا مجاہدہ، سونے جاگنے کے اوقات پر کنٹرول کا مجاہدہ وغیرہ، جس کے بارے میں شیخ اپنی بصیرت سے فیصلہ کرتا ہے۔

ذکر کی اس ترتیب کے چار مرحلے ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک اول مرحلہ نفی و اثبات ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ دوسرا اثبات ”إِلَّا اللَّهُ“ تیسرا ”أَلَلَّه“ اور چوتھا ”هُوَ“ ہے۔ پہلے کو ناسوتی، دوسرے کو ملکوتی، تیسرے کو جبروتی اور چوتھے کو لاہوتی کہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ عالم بھی چار ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک ”أَلَلَّه“ ذکر جبروتی ہے اور ”أَلَلَّه“ ذکر لاہوتی ہے مثلاً چشتی حضرات کے نزدیک۔

◆ ذکرِ ناسوتی

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ ہے کہ اس میں ناسوتی امور، شہوات و لذات و خواہشات یعنی جو عالم دنیا سے متعلق ہیں اور نفس کو خود میں مشغول رکھتے ہیں۔ ان سے نفی ہے۔ ان سے نکل جانا اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہونا ہے۔ یعنی ”لَا إِلَهَ“ کی تلوار سے غیر اللہ کو فنا کرنا اور ”إِلَّا اللَّهُ“ کی ضرب سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا حاصل کرنا ہے۔

◆ ذکرِ ملکوتی

یعنی ”إِلَّا اللَّهُ“ سے اس حقیقت کا ادراک کرنا ہے کہ ہم تو صرف اللہ کے لیے ہیں۔ جیسا کہ فرشتے صرف اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق سب کچھ کرتے ہیں کسی اور طرف ان کا دھیان ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح ہمارا بھی دھیان صرف اللہ کی طرف ہو۔ غیر اللہ کی طرف التفات کا شائبہ بھی نہ ہو حتیٰ کی اس کی نفی کی طرف بھی خیال نہ ہو۔

◆ ذکرِ جبروتی

”أَلَلَّه“ سے مراقبہ ذات مع صفاتِ عظمت و احسان و رحمت و شفقت وغیرہ ہو، یعنی حق کا ادراک دماغ ایسا ہو کہ ہر دم اس ادراک میں ترقی ہو اور قلب و ذہن اس میں مشغول ہو۔

◆ ذکرِ لاہوتی

”أَلَلَّه“ کا مقصد محض اللہ کی ذات کی طرف ایسی توجہ ہے کہ اس کی صفات کی طرف بھی دھیان نہ ہو۔ بعض حضرات ذکر جبروتی ”أَلَلَّه“ کے ذکر کو اور ذکر

لاہوتی ”هُوَ“ کے ذکر کو قرار دیتے ہیں۔ پہلا طریقہ عموماً اہل چشت کے ہاں ہوتا ہے۔ اس کو بارہ تسبیح بھی کہتے ہیں۔ یہ حضرات پہلے دو سو بار ذکرِ ناسوتی، چار سو بار ذکرِ ملکوتی، چھ سو بار ذکرِ جبروتی اور سو بار ذکرِ لاہوتی کراتے ہیں۔ اس سے گویا کہ روزانہ چار عالموں کی سیر ہو جایا کرتی ہے۔ روزانہ اس چھوٹی سیر یعنی سیر الی اللہ کی اجمالی سیر کے ذریعے بڑی سیر کی طرف جاتا ہے۔ یعنی پورے سلوک کی تکمیل کے لیے سالک رواں دواں ہوتا ہے۔ لیکن ذکرِ لاہوتی میں سالک کی استعداد کے مطابق روز افزوں ترقی کراتے کراتے اس کو بعض اوقات 24 ہزار تک بھی لے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ عموماً قادریہ حضرات کے نزدیک چلتا ہے۔ ذکرِ علّٰجی میں اجتہاد جاری ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بعض مشائخ کے ہاں یہ ترتیب بھی معمول ہے۔

درد شریف: ”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَعِثْرَتِهِ بَعْدَ كُلِّ مَعْلُومٍ لَكَ“ 1000 مرتبہ، ”أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الْعَظِيمَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَآتُوبُ إِلَيْهِ“ 313 مرتبہ، ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ 1000 مرتبہ، (ہر 100 کے بعد ”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“)

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ 1000 مرتبہ

”اللَّهُ“ 1000 مرتبہ

”هُوَ“ 1000 مرتبہ

”اللَّهُ هُوَ“ 1000 مرتبہ

”هُوَ اللَّهُ“ 1000 مرتبہ اور ذکرِ قلبی اسم ذات بصورتِ مراقبہ۔

”أَنْتَ الْهَادِي، أَنْتَ الْحَقُّ، لَيْسَ الْهَادِي، إِلَّا هُوَ“ 100 تا 1000 مرتبہ۔ بعض حضرات اس کو لطائف پر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ قلب پر، ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ روح پر، ”اللَّهُ“ سر پر، ”هُوَ“ حُضْرِي، ”اللَّهُ هُوَ“ حُضْرِي، ”هُوَ اللَّهُ“ نفس پر اور ”أَنْتَ الْهَادِي أَنْتَ الْحَقُّ لَيْسَ الْهَادِي إِلَّا هُوَ“ قالب پر۔

طریقہ قادریہ راشدیہ میں تمام لطائف پر باری باری اسم ذات کی ضرب لگانے کا بھی معمول ہے۔ اس طرح ان کے قلب، روح اور سِرِّ پر پاسِ انفاس کا بھی معمول ہے۔ نیز ”اَللّٰهُ هُوَ“ کے ذکر میں ”اَللّٰهُ“ داہنے مونڈھے سے شروع کر کے روح اور سِرِّ پر سے گزارتے ہوئے قلب پر ”هُوَ“ ختم کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی سات صفات بَصِيْرٌ، كَلِيْمٌ، سَمِيْعٌ، حَيٌّ، قَدِيْرٌ، مُرِيْدٌ اور عَلِيْمٌ کی خود سے نفی اور اللہ تعالیٰ سے اثباتِ خفی طریقے سے کرایا جاتا ہے۔

سلسلہ چشتیہ نظامیہ مبارکہ میں بعض مشائخ کے ہاں یہ اسباق معمول ہیں:

”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ لسانی 200 مرتبہ، ”اِلَّا اللّٰهُ“ لسانی 400 مرتبہ، ”اَللّٰهُ“ لسانی 600 مرتبہ، اس کے بعد اسم ذات بذریعہ تصور ”اَللّٰهُ“ کوناف سے شروع کر کے امِ الدماغ تک تصور سے لے جانا ہوتا ہے 1200 مرتبہ، ”اَللّٰهُ هُوَ“ 500 مرتبہ، ”هُوَ اَللّٰهُ“ 500 مرتبہ، ”يَا وَدُوْدِيَا وَهَابُ“ 100 مرتبہ۔ نظامیہ اذکار میں ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ میں غیر اللہ کی نفی پر زیادہ زور ہے اور اثبات اس کے تابع ہے۔ ”اِلَّا اللّٰهُ“ میں زور اثبات پر ہے۔ لیکن نفی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ دن ہے۔ تو ہم مانتے ہیں کہ رات کا وجود بھی ہے۔ ورنہ دن کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس لیے آگے اسم ذات ”اَللّٰهُ“ کا مفرد ذکر ہے کہ جہاں نفی کا امکان ہی نہیں ہے۔

اسم ذات میں جو تصور میں ہوتا ہے اس میں انسان کو ”عالم صغیر“ تصور کرتے ہوئے نَفِ کو ”تحت الشری“ تصور کرتے ہیں اور امِ الدماغ کو ”زیر عرش“ خیال کرتے ہیں۔ اس خیال سے اسم ذات کوناف سے شروع کر کے خیال میں امِ الدماغ تک لے جاتے ہیں اور یہ اس معنی میں کہ تحت الشری سے عرش تک اسی مالک کی بادشاہت ہے اور اسی کے جلوے ہیں۔ اگر ذکر کے دوران اپنے باطن کو غبارے کی طرح خالی تصور کیا جائے تو ذکر آسانی سے جم جاتا ہے۔

”اَللّٰهُ هُوَ“ ذکر عروج ہے۔ یعنی اس میں اسم سے مسمیٰ کی طرف سیر ہے اور ”هُوَ اَللّٰهُ“ ذکر نزول ہے یعنی مسمیٰ سے اسم کی طرف نزول ہے۔

ان کا آخری مراقبہ ”ذکر مذکور“ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے ہی قلب کے آئینے میں اللہ کی ذاتی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

بعض مشائخ نے ذکرِ لسانی کو ناسوتی، ذکرِ قلبی کو ملکوتی، ذکرِ روح کو جبروتی اور ذکرِ ستر کو لاهوتی کہا ہے۔ بعض نے ذکرِ لسانی کو جسمی، فکر کے ذکر کو نفسی، مراقبہ کو ذکرِ قلبی، مشاہدہ کو ذکرِ روحی اور معائنہ کو ذکرِ ستری کہا ہے۔

2.1.2.2.1.1.2.1... جلی اذکار

◆ ذکرِ جلی و خفی

ذکرِ لسانی کو جلی اور ذکرِ قلبی کو خفی کہتے ہیں۔ اسی طرح جہر کو جلی اور غیر جہر کو خفی کہتے ہیں۔ ذکرِ جلی کی ادنیٰ حد تو متعین ہے۔ جو کہ زبان کو حرکت دینا یا اپنے آپ کو سنانا ہے۔ لیکن اکثر کی کوئی حد نہیں۔ یہ اپنے اپنے نشاط پر ہے۔ مگر اس کا خیال ضروری ہے کہ کسی نمازی یا سونے والے کو ایذا نہ ہو۔

◆ ہمارے خاندانی اذکار

حضرت حلیم گل بابا رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے جد امجد حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کتاب ”مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ“ سے یہ اذکار دیے جاتے ہیں۔

◆ ذکرِ روح

التَّحِيَّاتِ کی شکل میں بیٹھ کر یہ ذکر ”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ کیا جائے۔ طریقہ یہ ہے کہ ”هُوَ الْأَوَّلُ“ کی ضرب دائیں طرف، ”هُوَ الْآخِرُ“ کی ضرب بائیں طرف، ”هُوَ الظَّاهِرُ“ دونوں زانوؤں کے بیچ میں اور ”هُوَ الْبَاطِنُ“ کی ضرب دل میں لگائی جائے۔

◆ ذکرِ مقدّس

”اللّٰهُ“ کا لفظ دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لے جائیں اور ”اَكْبَرُ“ کی ضرب دل پر لگائیں (اللّٰهُ اَكْبَرُ)۔ لفظ ”سُبْحَانَ“ کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لے جائیں اور اسم ”اللّٰهُ“ کی ضرب قلب پر لگائیں (سُبْحَانَ اللّٰهِ)۔ لفظ ”اَلْحَمْدُ“ کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لے جائیں اور ”بِاللّٰهِ“ کی ضرب قلب

پر لگائیں (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) ”لَا اِلٰهَ“ کو دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لے جائیں اور ”اِلَّا
اللّٰهُ“ کی ضرب قلب پر لگائیں (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

◆ ذکرِ تجلی

اسم ”يَاسْحَى“ دل سے کھینچ کر دائیں شانے تک لے جائیں اور ”يَاقِيْسُومُ“ کی
ضرب دل پر لگائیں۔

◆ ذکرِ جبروتی

”يَا اَحَدُ“ کی ضرب دونوں زانوروں کے درمیان لگائیں اور ”يَا وَاَحِدُ“ کی ضرب
دل میں لگائیں۔

◆ ذکرِ ملکوتی

”يَا بَدِيعُ“ کی ضرب دائیں گھٹنے پر ”يَا بَاعِثُ“ کی ضرب بائیں گھٹنے پر ”يَا
نُورُ“ کی ضرب لطیفہ روح پر ”يَا شَهِيدُ“ کی ضرب قلب پر۔

◆ ذکرِ فردوسی

دائیں جانب ”فَاذْخُلِي“ کی ضرب، بائیں جانب ”فِي عِبَادِي“ کی ضرب آسمان کی
جانب ”وَاذْخُلِي“ کی ضرب اور دل پر ”جَنَّتِي“ کی ضرب۔

◆ ذکرِ وحدت

دائیں جانب ”لَيْسَ فِي الدِّارَيْنِ“ کی ضرب اور دل پر ”غَيْدُ اللّٰهِ“ کی ضرب۔

◆ فنا اور بقا کا ذکر

دائیں جانب ”مَا عِنْدَكُمْ“ اور بائیں جانب ”يَنْقَدُ“ کی ضرب، آسمان کی
جانب ”وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ“ کی ضرب اور دل پر ”بَاقِي“ کی ضرب۔

◆ ذکرِ نفی و اثبات یعنی ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کا طریقہ

کتابوں میں یہ طریقہ لکھا ہے کہ ”لَا اِلٰهَ“ کے ”لَا“ کو ناف سے ذرا طاقت سے کھینچ

کر لفظ ”اِلٰه“ کو داہنے بازو تک لے جا کر سر کو پیٹھ کی طرف تھوڑا سا جھکا کر یہ خیال کرے کہ میں نے غیر سے اپنے دل کو پاک کر کے تمام اغیار کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر ”اِلَّا اِلٰه“ کی ضرب ذرا زور سے دل پر لگائے۔ یہ دو سو بار کہے۔ اس طرح کہ ہر دس بار یا سانس ٹوٹنے پر ”مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ کہے۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر ہمارے شیخ مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس میں یہ ترمیم فرماتے تھے کہ ”لا“ کوناف سے طاقت کے ساتھ کھینچ کر ”اِلٰه“ سے دل کو دائیں بائیں یوں ہلائے کہ جس سے نفی کی قلبی کیفیت پیدا ہو جائے۔ یعنی اس کے ساتھ ہی یہ سوچے کہ میرے دل سے غیر اللہ کی محبت نکل گئی اور ”اِلَّا اِلٰه“ سے دل پر سینے کی اندرون سے ایسی ضرب لگائی جائے کہ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو گئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ آج کل لوگ خارجی ضرب کے متحمل نہیں۔

◆ غور طلب

”لَا اِلٰه“ کہتے وقت یہ سوچے کہ دل سے دنیا کی محبت نکل رہی ہے اور ”اِلَّا اِلٰه“ کہتے وقت یہ سوچے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آرہی ہے اور تھوڑی دیر مراقب ہو کر خیال کرے کہ فیوض الہیہ قلب میں مسلسل حاصل ہو رہے ہیں اور تصور کرے کہ فیضان الہی عرش سے میرے سینہ میں آرہا ہے۔ خواہ چو کڑی بھر کر پیٹھے یا دو زانو، جس میں سہولت ہو ذوق کے مطابق کرے۔

◆ ذکر ”اِلَّا اِلٰه“ کا طریقہ

کتابوں میں ”اِلَّا اِلٰه“ کے ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی بار ”لَا اِلٰه“ کہتے وقت ناف سے کھینچ کر سر کو دائیں شانہ کی طرف لے جا کر ”اِلَّا اِلٰه“ کی ضرب دل پر لگائے اور پھر دل پر ہی بائیں جانب اسی کی ضرب لگاتا رہے۔ یہ ذکر چار سو بار کرے۔ پھر نفی و اثبات کی طرح مراقبہ کرے۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ ”اِلَّا اِلٰه“ کہتے ہوئے ضرب دائیں شانہ کی جانب سے لیکن سینے میں دل کے قریب

سے دل پر ضرب لگائی جائے۔ اس میں مراقبہ ملکوتی ہی مناسب ہے کہ ہم تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ اس طریقے سے نہایت آسانی کے ساتھ مطلوبہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے بہت زور دار ضرب لگانے کی آج کل ضرورت نہیں بلکہ اس میں آج کل نقصان کا اندیشہ ہے۔

◆ ذکر اسم ذات دو ضربی

”اَللّٰهُ اَللّٰهُ“ اول ”ا“ پیش کے ساتھ اور دوسری ”ا“ جزم کے ساتھ۔ اس کا کتابوں میں لکھا ہوا طریقہ یہ ہے کہ دونوں آنکھیں بند کر کے سر دہنے کندھے کی طرف لے جا کر ”اَللّٰهُ“ (پیش کے ساتھ) دل پر ضرب لگائی جائے اور دوسرے لفظ ”اَللّٰهُ“ (جزم کے ساتھ) سے بھی دل پر ضرب لگائی جائے۔ یہ چھ سو بار ہے۔ پھر اس طرح مراقبہ کرے کہ ہر دس یا زائد کے بعد ”اَللّٰهُ نَاظِرِيْ، اَللّٰهُ حَاضِرِيْ، اَللّٰهُ مَعِيْ“ کہتا رہے تاکہ کیفیت ولذت اس کی حاصل ہو۔ اس میں بھی آج کل بہتر یہی ہے سر کو ہلائے بغیر جہاں سے ”اَللّٰهُ“ کی ضرب کا بتایا گیا ہے وہیں سے یعنی سینے میں دائیں شانے کی جانب سے مگر قریب سے دل پر ضرب لگائی جائے۔ حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے ساتھ مراقبہ کے طور پر یہ بتاتے تھے کہ یہ تصور کیا جائے کہ عرش سے زرد رنگ کا نور سالک کے قلب پر آرہا ہے۔ یہ اصل میں عرشِ اصغر کی عرشِ اکبر سے رابطہ کی کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ سارے سالکین کو اس میں کامیابی نصیب فرمائے۔ آمین۔

◆ ذکر اسم ذات یک ضربی

اس کا طریقہ کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ لفظ ”اَللّٰهُ“ جزم کے ساتھ سر کو بائیں جانب لے کر دل پر ضرب کرے۔ یہ سو بار ہے۔ پھر مراقبہ ہو کر اس طرح کہے ”اَللّٰهُ نَاظِرِيْ“ (اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے) ”اَللّٰهُ حَاضِرِيْ“ (اللہ میرے پاس ہے) ”اَللّٰهُ مَعِيْ“ (اللہ میرے ساتھ ہے) اور معنی کا خیال کرے۔ آج کل اس کے لیے بھی مناسب یہ ہے کہ یہ مراقبہ کرے کہ میرا اللہ میرے دل کو محبت کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور میرا

دل بھی اس کی طرف متوجہ ہے اور میری زبان کے ساتھ مل کر ”اَللّٰهُ اَللّٰهُ“ شوق میں کر رہا ہے۔ اس میں اوپر کے مراقبہ بھی آگئے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ قلبی بھی حاصل ہو گئی۔ جو تصور ذاتِ تحت کا پیش خیمہ بنے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ اس پر بارہ تسبیح مکمل ہو جاتی ہے جو چشتیہ طریقے میں چلی آرہی ہے۔

◆ ایک اور تشریح

بعض مشائخ نے اس کی تشریح یوں بھی کی ہے کہ سالک ذکر نفی و اثبات ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ میں اس قدر مشغول ہو کہ سوائے ذکر کے کچھ نہ رہے۔ کوئی سانس بغیر ذکر نہ نکلے۔ جب اس حالت کو سالک پہنچ گیا تو وہ عالمِ ناسوت سے عالمِ ملکوت میں پہنچ جاتا ہے۔ جس کا ذکر ”اِلَّا اللّٰهُ“ ہے۔ چونکہ یہ ذکر ”اِلَّا اللّٰهُ“ دل کا ذکر ہے اس لیے اب ”اِلَّا اللّٰهُ“ کا تصور بجز قلب چاہیے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ کی ذات و صفات کے ساتھ ربط ہو جائے۔ جب سالک اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے تو مرتبہ بدل سے گذر کر مرتبہ روح پر پہنچ جاتا ہے اور روح کا ذکر اسمِ ذات ”اَللّٰهُ“ کا ذکر ہے۔ اس لیے اس ذکر اسمِ ذات میں اس طرح انہماک ہو کہ الف لام جو ”اَللّٰهُ“ پر داخل ہے باقی نہ رہے۔ صرف ”هُوَ“ رہ جائے۔ اس مرتبہ پر پہنچنے سے سالک سرِ پا ذکر ہو جائے گا اور روح سے ترقی کر کے مرتبہ برّپر پہنچ جائے گا اور مقامِ فناء الفنا پر فائز ہو جائے گا۔

اب سالک کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ اب وہ مصداق حدیث شریف ”بِنِيَّيَسْمَعُ“، ”بِنِيَّيُبْصِرُ“ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب وہ میرے ساتھ سنتا ہے۔ میرے ہی ساتھ دیکھتا ہے۔ ”وَبِنِيَّيَبْطِشُ“ میرے ہی ساتھ پکڑتا ہے۔ ”وَبِنِيَّيَمْشِي“ میرے ہی ساتھ چلتا ہے۔ یعنی اس کی ہر حرکت و سکون خدا کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ (دیکھنے میں بشر ہے لیکن بے شر ہے۔ سرِ پا نور ہے) اب اس کو ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کی خوب معرفت ہو جائے گی۔ عبدیتِ کاملہ حاصل ہو جائے گی۔ عبدیت میں درجہ کمال اور بصرِ ہمت عبادت میں مشغول ہو گا۔ حفظِ مراتب اور احکامِ شریعت کا امر اُو نہیاً امتثال کرے گا۔

◆ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کا ذکر

یہ بھی نفی اثبات کا ذکر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں اسم ذات ”آلَهِ“ کی جگہ ”هُوَ“ ہے جو اسم ضمیر ہے اور ”آلَهِ“ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی سب سے نفی کر کے صرف وہ یعنی ذاتِ الہی۔ یہ بے زبانی کی زبان بہت اونچی زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی جملہ برکات نصیب فرمائے۔ آمین

◆ حق کا ذکر

قرآن پاک میں کئی مقامات پر حق کو بہت زور دار طریقے سے لایا گیا ہے۔ جیسے ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَذَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ [الإسراء: 81]

ترجمہ: ”اور کہو کہ: حق آن پہنچا اور باطل مٹ گیا اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے۔“ اس میں حق کے ذریعے سے باطل کے بالکل انہدام کی طرف اشارہ ہے۔ سالکین اپنے دل کے ان باطل بتوں کو اس ذکر کی پابندی سے منہدم کر سکتے ہیں جو دل کے کعبے میں ہم سجا چکے ہوتے ہیں۔ اس ذکر کی تعداد حسبِ ضرورت شیخ تجویز کرتا ہے۔ سہروردیہ سلسلہ میں ”حَقُّ آلَهِ“ کے ذکر کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہ وہاں سے لیا گیا ہے۔

2.1.2.2... پاس انفاس

صوفیائے کرام کے نزدیک دائمی ذکر کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی اصل قرآن کریم سے ثابت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿رِجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [النور: 37]

ترجمہ: ”جنہیں کوئی تجارت یا کوئی خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی“ اسی طرح ﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ [آل عمران: 191]

ترجمہ: ”جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔“ ان آیات میں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (غرض ہر حال میں) ذکر کی ترغیب دی گئی ہے اور

ایسے نیک بندوں کی تعریف کی گئی ہے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں۔ اس کی اصل تو ظاہر ہے کہ یادداشت ہے (کہ ہر حال میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی یاد دل میں قائم رہے) لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ ایسی یاد کی یافت ذکرِ اسمی کی کثرت کے بغیر عادتاً مشکل ہے۔

صوفیائے کرام کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدن میں ظاہر اَدُو نظام ایسے ہیں جو کہ خود بخود جاری رہتے ہیں۔ اگر ان میں ذکر کا اجرا ہو جائے تو ذکرِ دائم کی دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ ایک دل کی دھڑکن اور دوسری سانس کی آمد و رفت۔ پہلے میں ذکر کے اجر کو ذکرِ قلبی کہتے ہیں اور دوسرے کو پاسِ انفاس (یعنی یہ مشق کہ ہر سانس ذکر سے معمور رہے۔) اسی کو ”ہوشِ دردم“ بھی کہتے ہیں (یعنی یہ دھیان رکھنا کہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے)۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”جو سانس اندر جاتا ہے مدحیات ہے اور جو باہر آتا ہے مفرحِ ذات، پس ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں اور ہر نعمت کا شکر واجب“ (گلستانِ سعدی)۔ ذکر درحقیقت شکر ہی ہے اور ہر سانس میں اللہ کا نام لینا اسی کی ایک شکل ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مرید کو پاسِ انفاس کے بارے میں لکھتے ہیں ”یہ ایک مشغلِ شب و روز کی مشغولی کے لیے کافی ہے۔ ہم ذکرِ ہم مشغل اس میں شامل ہے۔“

◆ طریقہ

پاسِ انفاس کے طریقے بہت ہیں۔ لیکن ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہر سانس ذکر سے معمور رہے چاہے جو بھی ذکر ہو:

- (1) سانس باہر نکالتے ہوئے دل ہی دل میں زبان کو حرکت دیے بغیر ”لَا إِلَهَ“ کہے اور سوچے کہ غیر اللہ کی محبت دل سے نکل رہی ہے اور سانس لیتے ہوئے ”إِلَّا اللَّهُ“ کہے اور سوچے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی محبت دل میں داخل ہو رہی ہے۔
- (2) سانس لیتے وقت اسم ”اللَّهِ“ دل میں کہے اور سانس باہر نکالتے ہوئے بھی اسم ”اللَّهِ“ دل میں کہے۔
- (3) سانس اندر لیجاتے وقت دل میں ”اللَّهِ“ کہے اور سانس باہر نکالتے

وقت ”هُوَ“ کہے (ہمارے سلسلے میں یہی معمول ہے)

(4) احقر کے خیال میں آج کل یہ زیادہ مناسب ہے کہ ”اَللّٰهُ“ سانس باہر نکالتے وقت اور ”هُوَ“ سانس اندر لے جاتے وقت کہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”هُوَ“ اندر لے جاتے وقت تصور ذات بحت میں مدد دے گا۔

(5) اندر اور باہر دونوں سانسوں میں ”هُوَ“ کا لفظ خیال میں گزارے۔

الغرض اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہر سانس ذکر رہے تاکہ ذکرِ دائم اور ذکرِ حیات کی دولت حاصل ہو سکے۔ مشق سے یہ ذکر طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور سالک ہر حال میں ذکر رہتا ہے۔ اللہ پاک سب کو ذکرِ دائم کی حقیقت نصیب فرمائے۔ آمین

◆ غور طلب

ذکرِ لسانی بھی ہوتا ہے۔ خفی بھی اور جہری بھی۔ لیکن اگر یہ علاج کے لیے ہوں تو نہ ان پر تجوید کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو بدعت کہا جاسکتا ہے۔ بدعت اس کو کہتے ہیں جن کو دین کے مقاصد میں شامل کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سب ذرائع کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اس لیے ان کے پڑھنے اور کرنے کے طریقوں کا مخصوص ہونا بھی ضروری نہیں۔

جہری ذکرِ انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی ہو سکتا ہے بصوتِ واحد۔ دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ انفرادی جہری ذکر میں کیفیت کی گہرائی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ذکر چاہے ایک ہی مجلس میں مختلف لوگ کر رہے ہوں، لیکن کسی اور کے ساتھ آواز کا ملانا منع کیا جاتا ہے۔ جبکہ اجتماعی جہری بصوتِ واحد ذکر میں تعلیم مقصود ہوتی ہے۔ جیسا کہ تجوید کے قواعد طلباء کو ایک وقت میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس صورت میں سب کا ایک آواز سے کرنا ضروری ہے تاکہ سیکھنے میں مشکل نہ ہو اور کرانے والے کی آواز سب سے نمایاں ہونی چاہیے۔ اجتماعی ذکر بصوتِ واحد کوئی شیخ ہی کر سکتا ہے۔

3.1.2.2.1.1.2.3... خفی ذکر

◆ لطائفِ ستہ کی تعریف اور ضروری تفصیل

نقشبندی سلسلے میں لطائف کی باقاعدہ تعلیم کی جاتی ہے اور قادر یہ سلسلے میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں جاننا سالک کے لیے مفید ہے۔ لطائف جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا واحد لطیفہ ہے۔ یعنی وہ چیز جس میں کثافت نہ ہو۔ ان سے مراد وہ چیزیں ہیں جو مادی نہ ہوں۔ مادہ سے مجرد اور خالی ہوں۔ غیر مادی قوتیں جن کو انسانی اعضا سے تعلق ہوتا ہے۔ ان کی تعداد چھ ہے۔

(1) لطیفہ نفس (2) لطیفہ قلب

(3) لطیفہ روح (4) لطیفہ برسر

(5) لطیفہ خفی (6) لطیفہ خفی

محققین اہل فن تصوف نے ان لطائف کے مقامات اور مواقع بھی متعین فرمائے ہیں اور ان کے رنگ وغیرہ بھی بیان فرمائے ہیں اور افعال و آثار بھی۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ لطیفہ قلب کا محل قلب یعنی دل ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے اور اس کا رنگ سرخ ہے۔ لطیفہ روح کا محل دائیں پستان کے دو انگل نیچے دل کے بالکل سامنے ہے (اسی لیے لطیفہ قلب اور لطیفہ روح دونوں کو ذکر بنانے کے لیے دو ضربی ذکر کیا جاتا ہے)، اس کا رنگ سفید ہے۔ لطیفہ برسر کا محل قلب اور روح کے درمیان سینہ کے بچوں نیچے ہے۔ اس کا رنگ سبز ہے۔ لطیفہ خفی کا محل دونوں ابروؤں کے درمیان ہے۔ اس کا رنگ نیلگوں ہے اور لطیفہ خفی کا محل ام الدماغ ہے جو کہ دماغ میں ایک نقطہ ہے جس کو جوہر دماغ کا مرکز کہا جاتا ہے۔ اس لطیفہ کا رنگ سیاہ ہے۔ جیسے آنکھ کا تارا۔ لطیفہ نفس کا محل ناف کے نیچے ہے اور اس کا رنگ زرد ہے اور بعض نے پیشانی میں بتایا ہے۔ یہ طریقہ حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے تحقیق کے مطابق ہے۔

حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق لطیفہ قلب کا محل قلب صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفہ روح کا محل دائیں پستان کے دو

انگل نیچے ہے اور لطیفہ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفہ برتر کا محل دل سے چار انگل اوپر اور سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف دو انگل کے فاصلے پر ہے۔ لطیفہ خفی کا محل لطیفہ بروح کے مقام سے چار انگل اوپر اور دو انگل کے بقدر سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف ہے۔ لطیفہ خفی لطیفہ برتر، لطیفہ خفی اور گلے کی جڑتینوں مقامات سے برابر فاصلے پر ہے۔

◆ لطائف کا ذکر

اس کو یوں کرنا ہوتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ جس لطیفہ پر ذکر کرانا ہے وہاں ذکر ہو رہا ہے۔ صرف اس کو سننے کی کوشش ہو، تصور سے کروانے کی کوشش نہیں کرنی۔ وقوف قلبی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نقشیندی سلوک میں نیت، وقوف قلبی (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اور اس کے ساتھ نفس کے تزکیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ یاد رکھنا ہے کہ دل پر اتنی ہی محنت ہو جتنا کہ نفس کا تزکیہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن اگر نہیں ہوگا تو سالک بغیر تکمیل کے اپنے آپ کو کامل سمجھ سکتا ہے جو کہ طریقت میں سُم قاتل ہے۔

◆ لطائف ستہ کے افعال

لطائف کی تعداد اور ان کے مقامات اور رنگ بیان ہو چکے۔ اب ان کے افعال بیان کیے جاتے ہیں۔

پہلے لطیفہ نفس کے افعال بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ عالم خلق سے ہے اس کے تین درجے ہیں۔

(1) نفسِ امارہ (2) نفسِ لوامہ (3) نفسِ مطمئنہ

نفس کا اصل فعل غفلت اور شہوت ہے۔ کیونکہ غفلت اور شہوت میں تلازم ہے یعنی غفلت سے شہوت پیدا ہوتی ہے اور شہوت سے غفلت۔ یہ غفلت و شہوت کلی مشکل ہے۔ چنانچہ اس کے افراد شدت و ضعف میں مختلف ہیں۔ علاج بالضد کے قانون کے مطابق نفس کی اصلاح مجاہدات و طاعات سے ہوتی ہے یعنی ریاضت و تقویٰ سے شہوت و غفلت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کمی کا نام سکون ہے اور اس کے تین درجے ہیں۔

(1) جس میں سکون بالکل نہ ہو۔

(2) نامکمل سکون کی حالت۔

(3) مکمل سکون کی حالت۔

پہلے درجے میں نفس کو نفسِ اتارہ کہتے ہیں۔ دوسرے درجے میں اس کا نام نفسِ لوّامہ ہے اور تیسرے درجے میں اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ نفسِ اصل میں تولذات کا طالب ہوتا ہے۔ اسی لیے غفلت اور شہوت کی وجہ سے گناہ کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس حالت میں یہ ”نفسِ اتارہ بالسوء“ کہلاتا ہے کیونکہ ہمیشہ سوء اور قباحت و شناعیت کی راہ میں مبتلا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص مجاہدہ کرتا ہے تو یہ نفس پر شاق ہوتا ہے۔ لیکن مسلسل مجاہدے کے ساتھ نفس کچھ عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ اس مقابلے میں بالکل مغلوب نہیں ہوتا، بلکہ کبھی غالب و مطاع اور کبھی مطیع ہوتا ہے۔ پس اس حالت میں نفسِ لوّامہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں اور اس درجہ میں نفسِ افعالِ شنیعہ کے ارتکاب سے نامد بھی ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا ہے اور اگر مزید مقابلہ کرتے کرتے نفس بالکل مغلوب ہو گیا اور اس میں پوری طرح شانِ اطاعت پیدا ہو گئی تو یہ نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ حالت اطمینان کی ہے۔ شر کے صدور سے گو نہ اطمینان ہو گیا۔

◆ غور طلب

نفسِ مطمئنہ امورِ خیر میں مزاحمت و مقاومت تو نہیں کرتا مگر اس کو وساوس و خطرات پیش آجاتے ہیں۔ جس سے انسان کی ترقی اور اس کے کمال میں ازدیاد ہوتا ہے۔ جیسے شائستہ تعلیم یافتہ گھوڑا کبھی کبھی شوخی کرتا ہے لیکن سوار کے اشارہ ہی سے درست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفسِ مطمئنہ وساوس و خطرات کے درجہ میں کبھی کبھی خفیف و ضعیف مقاومت کرتا ہے لیکن سالک کے اشارہ پر درست ہو جاتا ہے۔ چونکہ نفس کی مقاومت کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے اس حالت کو سکونِ تام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ لطیفہ نفس کے فعل کا حال بیان کیا گیا ہے۔

◆ نفس مطمئنہ کی مزید تحقیق

بعض دفعہ کوئی خاص مجاہدہ کرنے سے نفس کو کسی خاص بات میں نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور بعض دوسرے امور میں حاصل نہیں ہو پاتا۔ مثلاً بعض لوگوں کو عبادات میں نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن معاملات میں کھوٹے ہوتے ہیں۔ یا معاملات میں نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن معاشرت میں نہیں۔ اس طرح بعض کو اخلاق میں یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے مکمل نفس مطمئنہ فنائے تام کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

◆ جبلت اور نفس کے درمیان فرق

انسان کے اندر ایک نفس ہوتا ہے اور ایک اس کی جبلت ہوتی ہے۔ جبلت میں عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کا اثر ہوتا ہے۔ ہر شخص میں ان کی مختلف ترکیب ہوتی ہے۔ اس لیے سیرالی اللہ کی تکمیل کے بعد بھی یہ عناصر باقی رہتے ہیں۔ جیسے بعض جلالی ہوتے ہیں بعض جمالی وغیرہ۔ ان طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور اقوام کے مزاج بھی اسی کے لحاظ سے ہیں۔ اس لیے مشائخ کو ان کی معرفت ہونی چاہیے، کیونکہ ان طبیعتوں کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ درج ذیل روایت میں ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ تبدیل کر سکتا ہے مگر کسی کی جبلت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے علاج نفس کا ہوتا ہے جبلت کا نہیں۔ جیسا کہ ارشاد مبارک ہے:

”عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَذَاكِرُ مَا يَكُونُ إِذَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصِدْقُوهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهِ فَلَا تَصِدِّقُوهُ فَإِنَّهُ يَصِيدُ إِلَى مَا جَبَلَ عَلَيْهِ.“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 27499]

ترجمہ: ”حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا: جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ

سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی آدمی کی خلقت بدل گئی ہے۔ اس کا اعتبار نہ کرو، اس لیے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔“

اس حدیث شریف میں جبلت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ نہیں بدلا کرتی۔ البتہ قرآن پاک میں نفس کی تربیت کا ثبوت موجود ہے۔ جیسے نفس کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهُ﴾ [الش:9]

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے گا۔“ اس سے پتا چلا کہ ایک توہر انسان کی وہ طبیعت ہے جس پر اس کو پیدا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس حدیث شریف میں یہ خبر موجود ہے کہ جس جبلت پر کسی کو پیدا کیا جاتا ہے وہ بالآخر اسی طرف جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی قرآن میں نفس کی تین قسمیں نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ بیان فرما کر اس کی تربیت کا امکان بیان کیا ہے اور اصل کامیابی بھی اسی پر بتائی گئی ہے۔ اس لیے بظاہر یہ لگتا ہے کہ جو طبیعت نہیں بدلتی، اس کو اگر ظرف مانا جائے اور اس کو چار عناصر کا مرکب قرار دیا جائے اور اس کے اندر جو پڑا ہے وہ مظروف بصورتِ رذائل بھی عناصرِ اربعہ سے ترکیب پا گیا ہے۔ تو یہ جو ظرف ہے وہ تو نہیں بدلتا لیکن اس کے مظروف کو بدلا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان ان رذائل کو صاف کرنے کا مکلف ہے۔ کیونکہ یہی اس کی تربیت ہے۔ لیکن اس ظرف کو نہیں بدلا جاسکتا ہے۔ اس لیے جب وہ شریعت پر عمل کرتا ہے اور اس میں اپنی جبلت کی جب مخالفت کرتا ہے۔ تو یہ اس کا مجاہدہ ہے جس پر اس کو اجر ملتا ہے۔ گویا تربیت سے اس نے تقویٰ کا مقام حاصل کر لیا اور جبلت سے شریعت پر عمل کرنے کا اجر حاصل کرتا ہے۔

تربیت میں جو مظروف ہے وہ بھی چونکہ عناصرِ اربعہ سے تشکیل پایا ہے۔ اس لیے علاج بالضد کے طور پر اس کو ہر ایک کے لیے اتنا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا جو عنصر اعتدال سے جتنا باہر ہے اس مجاہدے سے وہ اعتدال پر آجائے۔ پس نفس کا بگاڑ تو مجاہدہ کے ذریعے درست کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جبلت کی بے اعتدالی مجاہدہ کے ساتھ

درست نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی وجہ سے جو مجاہدہ کرنا پڑتا ہے وہ اجر کا باعث ہوتا ہے اور معصومین کا معاملہ اس میں مختلف ہے۔ ان کی جبلت میں اعتدال ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کی بے اعتدالی ان کے لیے مجاہدہ بنتی ہے۔

یہ سب کچھ یونانی حکما کی اصطلاحات کے مطابق بتایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک عناصر چار تھے۔ آج کل عنصر کی جو تعریف کی جاتی ہے یہ اس کے مطابق نہیں ہے۔ اس طرح اگر کہا جائے کہ یہ چار طبیعتیں تھیں، تو وہ بھی اُس وقت کے یعنی یونانی حکما کی تحقیق کے مطابق تھیں۔ البتہ یہ ہر وقت کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کی جبلت کچھ خوبیوں اور کچھ خامیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جس کی لاتعداد ترکیبیں بن سکتی ہیں۔ اس لیے کسی کی جبلت میں جو خامیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں اور جن کا نفس نفس مطمئنہ بن چکا ہو وہ ان خامیوں کے خلاف کام کرتا ہے۔ جس سے وہ اجر پاتا ہے اور جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کے ذریعے شرور سے بچا رہتا ہے۔

◆ عالم امر کے پانچ لطائف کے افعال

ان سب کا فعل مقصودِ حقیقی کی طرف توجہ اور اس کا تصور ہے۔ اسی تصور کو ذکر، یاد، دھیان وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان پانچ لطائف کے فعل تصور کی اصل حقیقت اس قدر ہے کہ نفس ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور ذہنی قائم ہو جائے اور اس کے لیے ذکر مفرد کیا جائے اور لفظ اللہ کے لیے کسی صفت کا تصور جیسے ”اللَّهُ قَادِرٌ، اللَّهُ عَلِيمٌ، اللَّهُ سَمِيعٌ، اللَّهُ بَصِيرٌ“ وغیرہ کہنا اصل ذکر کے تحقق کے لیے لازم نہیں ہے۔ بس لفظ اللہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ بالاتفاق ایسا ذکر یا اس کا تصور جائز ہے۔ کیونکہ علمائے کرام کا ذکر قلبی جس میں کسی صفت کا ذکر نہ ہو، کے جائز ہونے پر اتفاق ہے تو اس سے اس کا ذکر لسانی میں بھی جواز ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ذکر لسانی تو ذکر قلبی ہی کا اظہار ہے۔ تو اس میں کیا خرابی ہو سکتی ہے۔ اس کو یوں سمجھا جائے کہ تصور کے درجات مختلف ہیں۔ باقی لطائف کے افعال جاننے کے لیے البتہ چند اصطلاحات کے

جاننے کی ضرورت ہے۔ جو کہ درج ذیل ہیں۔

◆ ذکر، حضور، مکاشفہ، شہود، معائنہ

ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ تصور کے پانچ درجات ہیں:

- (1) ایک شخص کا اپنے محبوب کو یاد کرنا جو موجود و حاضر نہ ہو بلکہ غائب اور غیر موجود ہو۔
- (2) وہ محبوب سامنے موجود ہو لیکن کافی دور ہو، جس سے خد و خال اچھی طرح نظر نہ آسکیں۔ اس کا تصور کیا جائے۔
- (3) وہ قریب اور سامنے ہو جس سے خد و خال اچھی طرح نظر آسکیں، اس کا تصور کیا جائے۔
- (4) وہ شخص بالکل قریب موجود ہو اس کے تصور و دیدار میں اس قدر محویت ہو جائے کہ فرط عشق و محبت کی وجہ سے اپنی بھی خبر نہ رہے۔
- (5) وہ محویت یہاں تک ترقی کرے کہ بے خبری کی بھی خبر نہ رہے۔

تصور کے یہ پانچ درجات ہیں۔ ان میں چوتھا اور پانچواں درجہ اونگھ اور نیند کے مشابہ ہے۔ کیونکہ اونگھ میں اونگھنے والے کو یہ علم ہوتا ہے کہ میں اونگھ رہا ہوں۔ لیکن جسم و دماغ پر ایک نیم شعوری کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ گود گیر اشیاء سے لاعلمی ہو مگر اس لاعلمی کا اس کو علم ہوتا ہے اور پانچواں درجہ بالکل نیند کی مانند ہے کہ سونے والے کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ میں سو رہا ہوں بس ”لَا يَدْرِي“ (وہ نہیں جانتا) کا پورا مصداق ہوتا ہے۔ ورنہ وہ سونے والا نیند میں نہیں ہو گا۔ کیونکہ نیند کے لیے یہ لازم ہے کہ نیند سے بھی بے خبری ہو۔ جب تمثیل سے اتنی بات سمجھ میں آگئی تو اب تصوف کے پانچوں اصطلاحی درجوں کو ان سے سمجھا جائے۔

صوفیا کے یہاں درجہ اول کا نام ”ذکر“ ہے۔ کیونکہ اس میں محض یاد ہے۔ دوسرے درجے کا نام ”حضور“ ہے۔ کیونکہ اس میں جس کا تصور کیا جا رہا ہے اس کی موجودگی محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔ تیسرے درجے کا نام ”مکاشفہ“ ہے۔ کیونکہ اس میں اس محبوب کے غایت قرب کی وجہ سے حضور تام اور کامل انکشاف ہوتا ہے۔ چوتھے درجے کا نام ”شہود و مشاہدہ“ ہے۔ کیونکہ صوفیا کی اصطلاح میں شہود و مشاہدہ

حضورِ آتم وَاکمل کو کہتے ہیں اور اس درجہ میں حضورِ آتم وَاکمل سے غایت شیفنگی و فریفتگی اور حالتِ وفور والہانہ ہوتی ہے۔ اس درجہ کا نام ”فنا“ بھی ہے کیونکہ محویت کی وجہ سے اپنی ہستی کا علم نہیں ہوتا۔ پانچویں درجہ سے مراد ”معائنہ“ ہے۔ معائنہ سے مراد اصطلاحاً وہ حضور و معائنہ ہے جو شہودِ اصطلاحی سے زائد ہو اور اس درجہ میں معائنہ شہودِ اصطلاحی سے زائد ہوتا ہے۔ کیونکہ لاعلمی سے بھی لاعلمی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام ”فنا الفنا“ بھی ہے کیونکہ غایتِ محویت کی وجہ سے اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں ہوتا۔ اسی کو کسی نے کہا ہے:

اس میں گم ہونا ہی وصال ہے بس

یہ فنا ہے یہی کمال ہے بس

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے

تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

تو تصور مقصود حقیقی کے یہ پانچ درجات ہیں۔

(1) ذکر (2) حضور (3) مکاشفہ (4) شہود و مشاہدہ و فنا (5) معائنہ و فنا الفنا

اس کے بعد یہ سمجھا جائے کہ لطیفہ قلب کا فعل ذکر ہے۔ لطیفہ روح کا فعل حضور، لطیفہ سر کا فعل مکاشفہ، لطیفہ حنفی کا فعل شہود و مشاہدہ و فنا اور لطیفہ اخفی کا فعل معائنہ اور ”فنا الفنا“ ہے اور یہی ان کے آثار بھی بتائے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نفس مطمئنہ کی غذا معاصی سے بچنا ہے۔ قلب کی غذا ذکر ہے۔ روح کی غذا حضور ہے۔ سر کی غذا انکشافِ حقائق ہے۔ حنفی کی غذا شہود و فنا ہے۔ اخفی کی غذا ”فنا الفنا“ ہے (بعض نے اس میں کسی قدر اختلاف کیا ہے)

ان افعالِ لطائف اور تصور کے درجات کے حاصل ہونے کے لیے حضراتِ مشائخ مختلف طریقوں سے تعلیم کرتے ہیں۔ بعض حضرات طالبین و سالکین کو ذکر کے مخصوص طرز کے ساتھ اس قدر مشق کرنے کو فرماتے ہیں کہ یہ لطائفِ خمسہ علیحدہ علیحدہ ذاکر ہو جائیں، یہ سب افعال ان سے صادر ہونے لگیں۔ بعض حضرات صرف

قلب سے ذکر کی مشق کرنے کو فرماتے ہیں جن سے ان سب افعال کا صدور ہونے لگے۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ یہ بتایا جائے کہ یہ فعل کس لطیفہ کا ہے۔ کیونکہ یہ حضرات لطائف کی طرف تفصیلی توجہ کو بھی حجاب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں بھی قلب کا ذکر وارد ہے۔ فرمایا کہ

”إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضَغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ

الْجَسَدُ كُلُّهُ إِلَّا وَهِيَ الْقَلْبُ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 52]

ترجمہ: ”بیشک اس جسم میں گوشت کا ایک لو تھڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو گا تو سارا جسم ٹھیک ہو گا اور اگر یہ خراب ہو گیا تو سارا جسم خراب ہو گا۔ آگاہ ہو جاؤ یہ دل ہے۔“ چنانچہ ایسے امور میں صرف قلب ہی کا ذکر وارد ہوا ہے۔ یہ چشتی مسلک ہے۔

اور وہ حضرات جو لطائف کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ لطائف خمسہ آپس میں متصل ہیں۔ اس لیے صرف ذکر قلبی سے بھی بقیہ لطائف میں آثار اور افعال مذکورہ سرایت کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لطائف آپس میں ایک دوسرے سے انعکاسی طور پر اثر لیتے ہیں۔ جیسے ایک آئینہ پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہوں اور اس کے بالمقابل میں دوسرا آئینہ اس طرح رکھا جائے کہ سورج کا عکس اس آئینہ میں اُس آئینہ سے منعکس ہو۔ اس طرح پھر تیسرا پھر چوتھا آئینہ رکھا جائے تو جیسے ایک آئینہ سے دوسرے متصل آئینوں میں سورج کی روشنی آرہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ذکر قلبی سے دوسرے لطائف پر بھی اثرات مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔

حضرات صوفیاء کے نزدیک حدیث شریف میں جس قلب کا ذکر ہے۔ گو اس سے لطیفہ قلب مراد نہیں بلکہ مضغہ ہی مراد ہے۔ لیکن یہ حکم اصل میں اس لطیفہ کا ہے جس کو اس مضغہ کے ساتھ غایت تعلق ہے جیسے حالت اور آئینہ کو صورتِ علمیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ گوشت کا دل جسدِ ظاہری کا جزو اور مادی شے ہے اور جو لطیفہ قلب ہے وہ اور شے ہے۔ وہ مادی نہیں ہے مجرد ہے۔ اس لطیفہ کا دل سے تعلق افاضہ آثار و انوار کا ہے۔ جیسا کہ حکمایان فرماتے ہیں کہ نفسِ ناطقہ (جس کی تفصیل احقر کی کتاب ”لطائف کی

حقیقت “میں دی ہوئی ہے) مجرد ہے۔ جزو بدن نہیں ہے۔ مگر اس کا تعلق بدن سے تصرف و تدبیر کا ہے۔ چنانچہ جس طرح لطیفہ قلب کو مادی جسم کے ایک خاص حصے یعنی قلب صنوبری سے تعلق ہے اسی طرح بقیہ چاروں لطائف کو بھی جسم انسانی کے خاص خاص مقامات سے افاضہ آثار و انوار کا تعلق ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے جب ذکر لطائف سے ذکر کرنا چاہتا ہے تو ان لطائف کے خاص خاص مقامات جن کو ان لطائف سے تعلق ہے، کی طرف بھی توجہ کرتا ہے۔ چنانچہ جب لطیفہ قلب کو ذکر بنایا جاتا ہے تو قلب صنوبری کی جانب توجہ کی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے لطائف کے ذکر بنانے میں بھی ان کے محل و مقام کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ البتہ توجہ کے طریقے مختلف ہیں جو کہ عمل کرانے والے کی رائے پر موقوف ہیں وہ جس طریقہ کو مناسب سمجھتا ہے بتا دیتا ہے۔

اس ذکر لطائف کے سلسلے میں اصل تو ذکر ہی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ دوسری چیزوں کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے فکر، شغل، مراقبہ، تصور، یہ سب ذکر ہی کی قسمیں ہیں۔ ذکر ہی کے ذرائع ہیں۔ ذکر ہی کے رسوخ و ملکہ کے طریقے ہیں۔ ان سب کے مجموعہ کو اہل فن اصطلاحاً ذکر کہتے ہیں۔ ذکر سے مراد وہی ذکر ہے جو شریعت میں مذکور، ماثور و منقول اور معمول بہ اور مقصود ہے اور شغل وغیرہ سے مراد ہسیت ذکر ہے۔ گویا وہ ذکر کی علتِ صوریہ ہے۔ یعنی یہ تصور کیا جائے کہ فلاں موقع جو فلاں لطیفہ کا محل ہے۔ مشغول ذکر ہے۔ جیسے زبان ذکر ہے اسی طرح یہ محل بھی ذکر ہے۔ مثلاً لطیفہ قلب میں لسانی ذکر کے ساتھ یہ تصور کیا جائے کہ یہ دل بھی ذکر کر رہا ہے۔ چنانچہ لطائف کے ذکر میں اصطلاحی شغل بھی ہوتا ہے یعنی لطیفوں کے محل کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ذکرِ الہی میں یہ محل بھی ہم نوائے لسان ہے۔ اسی شغل کی تقویت اور اس کے کامیاب اور مؤثر بنانے کے لیے بعضے اور افعال بھی کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کلماتِ ذکر کو سانس سے اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ پھر وہاں سے دماغ میں پہنچایا جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر سانس کو روک لیا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ام الدماغ میں سانس بند ہے۔ کیونکہ تجربے سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ جس دم کو دفع

خطرات اور مطلوب کی جانب توجہ قوی ہونے میں زیادہ دخل ہے۔ چنانچہ شکار میں ہدف کو سامنے رکھنے کے لیے جس دم ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ذکرِ لسانی یا ذکرِ قلبی میں مشغولیت کی جاتی ہے کہ ذکرِ لسانی کے علاوہ ذکرِ قلبی بھی ہوتا ہے کیونکہ الفاظِ متخید سے قلب کو ذکر بنایا جاتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ ہے: ﴿وَإِذْ ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرَّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ [الاعراف: 205]

ترجمہ: ”اور اپنے رب کا ذکر کیا کرو، اپنے دل میں بھی، عاجزی اور خوف کے (جذبات کے) کے ساتھ اور زبان سے بھی، آواز بلند کیے بغیر۔“ اس آیت کریمہ میں ذکرِ قلبی مراد ہے اور حدیث شریف ہے: ”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ“ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 302] یعنی آپ ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس سے علی الاطلاق ذکر اللہ سے ذکر ہی مستنبط ہوتا ہے۔ کیونکہ بول و غناط و جماع کی حالت میں ذکرِ لسانی کرنا ممنوع ہے۔ لہذا اس وقت ذکرِ قلبی ہی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ذکر جس طرح لسانی ہوتا ہے۔ قلبی بھی ہوتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ذکرِ قلبی خود ذکرِ لسانی کی اصل ہے۔ کیونکہ ذکرِ قلبی کلامِ نفسی ہے اور ذکرِ لسانی کلامِ لفظی ہے۔ اسی کو یوں کہا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ”إِنَّ الْكَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَإِنَّمَا جَعَلَ اللِّسَانَ عَلَى الْفُؤَادِ دَلِيلًا“ یعنی کلام در حقیقت دل ہی میں ہوتا ہے اور زبان تو اس پر دلالت کرنے والی، بتلانے والی ترجمان ہے۔“

چنانچہ شریعت نے بہت سے مواقع پر ذکرِ قلبی کو معتبر مانا ہے۔ چنانچہ بالاتفاق امت گوئی کے ایمان کے لیے ”إِقْرَأْ بِاللِّسَانِ“ ضروری نہیں۔ صرف توحید و رسالت کا تخیلِ جازم اور اعتقادِ کامل و تصدیقِ تام کافی ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے ارادے اور اختیار سے کفریہ مضامین کو اپنے خیال میں لا کر دل سے ان پر جم جائے، وہ شریعت میں کافر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر جس طرح لسانی ہوتا ہے۔ قلبی بھی ہوتا ہے۔ الفاظِ متخید سے قلب کو ذکر بنایا جاتا ہے اور ذکر کو اس میں جمایا جاتا ہے کہ قلب اللہ کے ذکر سے، اللہ کی یاد سے، اللہ کے خیال سے، اللہ کے تصور سے، اللہ کے

دھیان سے غافل نہ ہو۔ دل میں اللہ کی یاد ایسی جم جائے کہ کسی آن اس سے نہ اترے۔ اَلَا
مَا شَاءَ اللّٰهُ۔

حاصل یہ کہ ذکرِ لطائف اصطلاحاً دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ذکر اور فکر۔ اسی فکر
کو جو ذکر کے ساتھ اس خاص طریقے سے ہے، شغل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس ان
دونوں کے مجموعہ سے یعنی ذکر کی مشق اور فکر کی استقامت سے لطائف کے محل میں
مختلف اور نئے نئے آثار و کوائف محسوس ہوتے ہیں۔ خواہ وہ آثار و کوائف ان مقامات
میں پہلے سے موجود ہوں اور احساس و ظہور اب ہوا ہو، خواہ یہ آثار و کوائف اس فکر
کے بعد پیدا ہوئے ہوں اور یہ آثار و کوائف کبھی حرکات کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے
ہیں اور کبھی آوازوں کی صورت میں رونما ہوتے ہیں اور یہ آوازیں کبھی الفاظ کے بغیر
ہوتی ہیں اور کبھی خاص خاص الفاظ ان مقامات میں محسوس ہوتے ہیں اور یہ الفاظ بعض
کے نزدیک صرف خیالی ہوتے ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ خیالی نہیں ہوتے بلکہ حقیقتاً
ان لطائف کے مقامات میں پہلے سے موجود و محفوظ ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں
ہے: ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا لَيْسَ بِمَحْمُودٍ﴾ [الاسراء: 44]

ترجمہ: ”اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو“
چونکہ لطائف کے مقامات بھی اشیاء ہیں۔ اس لیے وہ بھی اس آیت شریفہ کے
منطوق کے موافق تسبیح میں مشغول ہوں گے اور یہ تسبیحات ہی وہ الفاظ ہیں جو ذکر کو
اب ان مقامات میں محسوس ہو رہے ہوں اور کبھی یہ آثار و کوائف مختلف رنگوں میں
نمایاں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ذکر کی مشق اور فکر و شغل کی پابندی پر تینوں قسم کے
آثار و کیفیات مرتب ہیں۔ جو فکر کے سرایت کی علامت ہیں۔

(1) لطائف کی جگہوں میں حرکت۔

(2) ان لطائف کے مخصوص مقامات میں کسی آواز کا سنا جانا۔

(3) ان لطائف کے مخصوص مقامات میں کسی رنگ کا ظاہر ہونا۔

یہ تینوں آثار و کیفیات انتہائے مشق سے پیدا ہوتے ہیں اور سرایتِ ذکر کی علامات

سمجھے جاتے ہیں۔ کبھی ذکر و فکر کی مشق پر یہ تینوں آثار مرتب ہوتے ہیں۔ کبھی ایک یا دو پائے جاتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ آثار سرایتِ ذکر کی محض علامات ہیں۔ سرایتِ ذکر کی حقیقت میں داخل یا اس کے لوازمات میں سے نہیں ہیں۔ ان تین علامات کے ظہور سے ولایت و مقبولیت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اصل مقصود تو ذکر و فکر و شغل کی پابندی سے یہ ہے کہ ذہول و غفلت کم ہو اور اکثر اوقات اُس کی دھن اور دھیان نصیب ہو۔ ان آثار سے تقویت و تائید کا فائدہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات بعض طبعیتوں کو وساوس و خطرات کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ یکسوئی و دفع و وساوس کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لیے شیخِ کامل اس ذکرِ لطائف کی مشق کراتا ہے تاکہ سکون و اطمینان حاصل ہو جائے اور طبیعت سے انتشار و وساوس تخیل کی پرآگندگی دور ہو جائے۔

اس لیے بھی اہل طریق کبھی لفظ ”اَدْلَّة“ کا غذر لکھ کر اس پر نظر جماتے ہیں اور کبھی اس کو لکھتے رہنے کا عمل تجویز کرتے ہیں۔ یعنی لفظ ”اَدْلَّة“ برابر لکھتے چلے جائیں حتیٰ کہ یہ اسمِ اعظم قلب و ذہن میں اچھی طرح راسخ ہو جائے۔ لیکن یہ سب طریقے مقصود بالذات نہیں بلکہ صرف یکسوئی کے وسیلے ہیں جو کہ ایک درجہ میں شرعاً بھی مطلوب ہیں۔ اس شرعی مطلوبیت کا درجہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کھانے کے تقاضے کے وقت نماز سے قبل کھانے سے فراغت حاصل کرنے کا حکم ہے تاکہ یکسوئی ہو جائے اور نمازِ اعتدال و اطمینان سے ادا کی جائے۔ تو کھانے سے فراغت مقصود بالذات نہیں بلکہ یکسوئی کا وسیلہ ہے تاکہ نمازِ اطمینانِ قلب سے ادا ہو سکے۔ اسی طرح لفظ ”اَدْلَّة“ لکھ کر کاغذ پر، اس پر نظر جمانا یا عملِ استکتاب (بار بار لکھنا) مقصود بالذات نہیں بلکہ یکسوئی کا وسیلہ ہے۔ مگر عبادت کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے ان کا شمار حسنات ہی میں ہے اور ان پر اجر و ثواب ہوتا ہے۔ جیسے نماز میں یکسوئی و اطمینان کی نیت سے کھانے سے فراغت پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ پس یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر عبادت کا مقدمہ نہ بنائی جائیں تو پھر ان کا کچھ اجر نہیں اور مقاصد میں سے تو کسی حال میں داخل ہی نہیں۔ چنانچہ ان رنگوں وغیرہ کا انکشاف غیر مسلمین تک کو بھی یکسوئی سے حاصل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مجنونوں کو بھی جیسا کہ کتابِ فنِ طب، شرح اسباب

میں صراحتاً مذکور ہے کہ جنون میں کشف ہو جاتا ہے کیونکہ بعض اوقات مجنوں کے تخیلات بھی کسی ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ نیز اگر کسی شخص کو معصیت کے ارتکاب میں یکسوئی ہو جائے تب بھی اس کو حقائق کو نیہ کا کشف ہو سکتا ہے بلکہ بعض لوگوں میں فطرتاً کشف سے مناسبت ہوتی ہے۔ ان کو یکسوئی کو حاصل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی چہ جائیکہ اسلام کی، اسی لیے غیر مسلم اور گنہگار مسلمان کے لیے ایسے اُمور کو، ایسی کشفیات اور صوری کرامات کو کہانت اور استدراج کہا جاتا ہے۔

◆ نماز میں لطائفِ ستہ کے آثار

قرآن پاک میں آیا ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَذَكَرَ اللَّهُ أَكْبَرَ﴾ [العنکبوت: 45]

ترجمہ: ”بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔“ پس نماز کا پہلا اثر جو ارجح ہو گا یا دوسرے لفظوں میں جو ارجح نماز کے اندر اگر مشغول ہوں گے تو ان جو ارجح سے جو گناہ ہوتے ہیں تو ان سے بچت ہو جاتی ہے۔ جب نماز اس سے ترقی کرتی ہے تو اس کا اثر پھر نفس پر ہو گا یا نفس کو نماز کے لیے مجبور کیا جائے گا اور اس میں مشقت اٹھانے پر تیار کیا جائے گا تو ان آثار کے ظہور کی صورت یہ ہے کہ صلوٰۃ سات درجے کی ہے۔

(1) صلوٰۃ تن (2) صلوٰۃ نفس (3) صلوٰۃ قلب (4) صلوٰۃ روح (5) صلوٰۃ ستر (6) صلوٰۃ خفی (7) صلوٰۃ اخفی۔

(1) صلوٰۃ تن: گناہوں سے روکتی ہے۔

(2) صلوٰۃ نفس: تعلقات سے روکتی ہے۔

(3) صلوٰۃ قلب: غفلت میں پڑنے سے روکتی ہے۔

(4) صلوٰۃ روح: غیر کے دیکھنے سے مانع ہوتی ہے۔

(5) صلوٰۃ ستر: غیر اللہ کی طرف نظر کرنے سے روکتی ہے۔

6) صلوةِ خفی: انسان کو مرتبہ انابت میں پہنچاتی ہے کہ اس سے اس پر حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

7) صلوةِ اخفی: مشاہدہ ذاتِ بحت اور جامعیت مقام معراج ہوتی ہے۔

◆ لطائفِ ستہ کی تحقیق کا خلاصہ

یہ لطائف کے سلسلے میں ہے تحقیق مگر اس کا بیان طویل ہو گیا اس لیے اب خلاصہ کے طور پر لطائف کی تعداد، نام، محال، الوان اور افعال لکھے جاتے ہیں۔ لطائف چھ ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(1) لطیفہٴ نفس (2) لطیفہٴ قلب (3) لطیفہٴ روح (4) لطیفہٴ سر (5) لطیفہٴ خفی (6) لطیفہٴ اخفی

◆ محل یعنی جگہیں

ان کی جگہیں یہ ہیں۔ لطیفہٴ نفس کی جگہ زیر ناف ہے۔ لطیفہٴ قلب کی جگہ قلبِ صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفہٴ روح کی جگہ دائیں پستان کے دو انگل نیچے اور لطیفہٴ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفہٴ سر کی جگہ ذقن (ٹھوڑی) کے نیچے سینہ کے بیچوں بیچ ہے۔ لطیفہٴ خفی کا محل دونوں ابرؤں کے درمیان ہے۔ لطیفہٴ اخفی کا محل ام الدماغ (سر کے اوپر کا حصہ) ہے۔ یہ حضرت سید آدم بنوری رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رضی اللہ عنہ کی تحقیق کے مطابق لطیفہٴ قلب کا محل قلبِ صنوبری ہے جو بائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے۔ لطیفہٴ روح کا محل دائیں پستان کے دو انگل نیچے ہے اور لطیفہٴ قلب کے محاذی ہے۔ لطیفہٴ سر کا محل دل سے چار انگل اوپر اور سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف دو انگل کے فاصلے پر ہے۔ لطیفہٴ خفی کا محل لطیفہٴ روح کے مقام سے چار انگل اوپر اور دو انگل کے بقدر سینہ کی درمیانی لکیر کی طرف ہے۔ لطیفہٴ اخفی لطیفہٴ سر، لطیفہٴ خفی اور گلے کی جڑتینوں مقامات سے برابر فاصلے پر ہے۔

◆ لطائف کے دور میں مردوں اور عورتوں کا فرق

عورتوں کے لیے معصومیہ طریقے کے لطائف کا اجرا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ پانچوں سینے میں ہیں۔ عورتیں اعصابی لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں اور بنوریہ لطائف میں چونکہ اخفی سر میں واقع ہے اس لیے اس کے اجرا کے ساتھ ان کا سر ہل سکتا ہے جو عورتوں کے لیے

پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مردوں کو دونوں قسم کے دور کرائے جاسکتے ہیں تاکہ بعد میں اگر ان سے خواتین بیعت ہوں تو وہ معصومی طریقہ بھی جانتے ہوں۔ بنوری طریقے میں کچھ مخصوص فوائد ہونے کی وجہ سے ان سے یکسر اعراض کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

◆ لطائف کے رنگ

لطائف کے رنگ یہ ہیں: لطیفہ نفس کا رنگ زرد، لطیفہ قلب کا سرخ، لطیفہ روح کا سفید، لطیفہ سر کا سبز، لطیفہ خفی کا نیلا اور لطیفہ اخفی کا سیاہ ہے۔

◆ لطائف کے افعال و آثار

لطائف کے افعال و آثار یہ ہیں: لطیفہ نفس کا فعل غفلت و شہوت ہے۔ مقاومت و مخالفتِ نفس کا ذریعہ انقطاع عن الخلق ہے۔ لطیفہ قلب کا فعل ذکر ہے۔ لطیفہ روح کا فعل حضور ہے۔ لطیفہ سر کا فعل مکاشفہ ہے۔ لطیفہ خفی کا فعل شہود و مشاہدہ اور فنا ہے۔ لطیفہ اخفی کا فعل معائنہ اور فنا الفنا ہے۔

2.1.2.2.1.2... شغل

شغل کی حقیقت اتنی ہے کہ اگر ذکر میں وساوس تنگ کریں اور کسی طرح دور نہ ہوں تو دل کو کسی تدبیر سے جب کسی ایسی چیز کی طرف مائل کیا جائے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہو اور وساوس دور ہوں شغل کہلاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ مقصود نہیں لیکن معاون فی المقصود ہو سکتا ہے۔ اس کی اصل نماز میں نظر کا محبوس کرنا، بکا کی کیفیت کو ضبط کرنا اور سترہ وغیرہ ہے۔ جس دم بھی اس کی ایک قسم ہے۔ یہ گو کہ جوگیوں سے لیا گیا ہے لیکن یہ ان کا کوئی مذہبی شعار نہیں تھا اس لیے ایک تدبیر کے طور پر اس کا لینا جائز تھا جیسا کہ جنگِ خندق میں خندق کا کھودنا۔

◆ شغل اسم ذات

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دل کی تصویر بنا کر اس پر لفظ اللہ خوبصورت لکھا جائے اور پھر اس کو بغور مسلسل دیکھا جائے حتیٰ کہ اس کا نقش دل پر جم جائے۔ یاد دل پر ایک خیالی قلم سے

لفظ اللہ لکھنے کی کوشش کی جائے۔ عموماً اس میں پہلا طریقہ آسان اور دوسرا مشکل ہوتا ہے۔

◆ سلطان الاذکار

یہ ایک ایسا شغل ہے جس میں ذاکر تمام اعضا و جوارح کے متعلق ذکر کے وقت یہ اجمالی تصور کرتا ہے کہ یہ سب ذکر کر رہے ہیں۔ ایسے ذکر و شغل کو اہل فن سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ اس سلطان الاذکار سے بھی ایسی ہی حرکات و الوان و اصوات پیدا ہو جاتی ہیں کہ کبھی چڑیوں کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی رعد و صاعقہ کی خطرناک گرجیں سنائی دیتی ہیں۔ بعض دفعہ ذاکر ان آثار کے ہجوم سے خائف و پریشان ہو جاتا ہے ایسے موقع پر شیخ کے کلمات تسلی اور الفاظ تفسی سے ہی کشتی پار ہوتی ہے۔

مکتوباتِ قدوسیہ میں اس کیفیت کا بہت ذکر ہے۔ شیخ جلال الدین تھانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حالات میں ان کیفیات کو بار بار لکھا ہے اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تشفیات و تسلیات بھی موجود ہیں۔ انہی وساوس کے خطرات و دفع ہجوم کے لیے اور سکون جمع خاطر کے لیے جس دم سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس دم سے یکسوئی میں اعانت ہوتی ہے البتہ جس دم بہ اندازہ ضبط و تحمل اور بقدر طاقت ہونا چاہیے اور وہ بھی شیخ کی تعلیم پر، از خود نہیں۔ اس وقت اکثر نے اس کو ترک کر دیا ہے کہ قوی و اعصاب میں اس کا تحمل نہیں۔

◆ غور طلب

صوفیاء کی ان تعلیمات کے ترک پر اعتراض نہ ہونا چاہیے چونکہ ان حضرات محققین کا کوئی اس قسم کا طریق تعلیم خلاف شرع نہیں ہوتا بلکہ شریعت سے اس کی اجازت ہوتی ہی ہے کہیں یقیناً کہیں خناً کہیں احتمالاً۔ اس لیے اس کو خلاف شریعت نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”اجْعَلْ بَصَرَكَ حَيْثُ تَسْجُدُ“ [السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: 284]

ترجمہ: ”نماز کی حالت میں اپنی نظر کو سجدہ کی جگہ پر جمائے رکھو۔“ یہ حکم جیسے ادب و تعظیم کی رعایت کے لیے ہے اسی طرح یہ حکم جمعیتِ خاطر و اطمینانِ قلب اور یکسوئی حاصل کرنے کے لیے بھی ہے۔ اسی سے حضرات صوفیاء کرام نے اشتغال کی

اصل کا ثبوت نکالا ہے اور ایسے ظنی اُمور میں احتمال بھی کافی ہوتا ہے جو اجتہاد کے جوڑ سے رائج بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس احتمال سے اس امر کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ صوفیا کا تجویز کیا ہوا شغل شریعتِ مطہرہ میں بے اصل نہیں۔ جیسے حضرات مجتہدین و فقہا صریح نصوص کے بغیر بعض احتمالات پر محض ذوق سے ظنی ظاہری احکام کا استنباط فرماتے ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات بھی ظنی باطنی احکام کا استخراج کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات بھی فنِ طریقت کے احکام میں مجتہد ہیں۔

الغرض ذکرِ لطائف و سلطان الاذکار جس دم و غیرہ میں اصل مقصد یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک راسخ ملکہ یادداشت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اکثر اوقات میں مقصود سے غفلت نہ ہو۔ بلکہ ذکر میں مشغول رہے۔ جو کہ مطلوب عند اللہ ہے۔ جس پر درجہ ذیل نصوص صریح الدلالة ہیں۔ جیسے آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”لَا يَزَالُ لِسَانَكَ رَطْبًا مَن ذَكَرَ اللَّهَ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3375]

ترجمہ: ”تیری زبان ذکر اللہ سے ہر وقت تر رہنی چاہیے“ اور ”كُلُّ مُطِيعٍ لِلَّهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ“ یعنی جو بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار ہے وہ ذاکر ہے۔ نیز آیت شریفہ صریحہ منصوصہ ہے: ﴿فَإِذَا قُضِيَتْ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ﴾ [النساء: 103]

ترجمہ: ”پھر جب تم نماز پوری کر چکو تو اللہ کو (ہر حالت میں) یاد کرتے رہو، کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی“ اور پھر آیات و احادیث سے کثرت ذکر کا حکم ظاہر ہے۔ حتیٰ کہ ارشاد ہے: ”عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: ”أَكْثَرُوا ذِكْرَ اللَّهِ حَتَّى يَقُولُوا مَجْنُونٌ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 11653]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کے ذکر کو اس کثرت کے ساتھ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہیں۔“ اسی کثرت ذکر کو حضرات صوفیا دوام ذکر سے تعبیر فرماتے ہیں۔ پس جب تصریح قوم (صوفیا) سے معلوم ہو چکا کہ تمام اذکار و اشغال سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک مستحکم اور راسخ ملکہ یادداشت پیدا ہو جائے، جس میں اکثر

اوقات ذہول و غفلت نہ ہو، تو اس ذکر میں قوت و ترقی ہو کر وہ درجات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ذکر، حضور، مکاشفہ، شہود اور معائنہ۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان اشغال و مراقبات وغیرہ جیسی تدبیروں اور طریقوں کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کے انفاسِ طیبہ کی برکات اور صحبت کے فیوض سے اپنے قلوب اور ذہنوں میں ایسی قوت اور کامل استعداد رکھتے تھے کہ ان امور کو مقصود کا ذریعہ بنانے کی ان کو ضرورت نہ تھی۔ جن مخصوص ذرائع کا ذکر گزرا ہے وہی ان کو کافی تھے۔ یہی راز ہے کہ یہ علوم مروجہ خیر القرون میں مدون نہیں ہوئے۔ جوں جوں خیر القرون سے دوری ہوتی گئی مختلف مشکلات کے حل کے لیے علوم کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوتا گیا جس کو علماء امت نے خیر القرون سے متصل قریبی زمانوں میں اچھے طریقہ سے انجام کو پہنچا دیا۔ چونکہ ضرورتیں مختلف تھیں اس لیے فطرتاً تقسیم کار کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ بعض حضرات نے علم ظاہر کی جانب توجہ کی اور اس کے مختلف شعبوں میں سے کسی خاص شعبے کو اپنا مخصوص کام کا میدان بنا لیا، گو اور شعبوں کی جانب بھی بقدر ضرورت متوجہ رہے اور بعض حضرات نے امانتِ باطنی کو سنبھالا اور اس خاص شعبہ شریعت کو مخصوص توجہات کا مرکز بنایا۔

اس طرح دونوں جماعتوں نے امتِ مرحومہ کی خدمت کی۔ پس ہم میں چونکہ استعداد کی کمی ہے اور ہم ضعیف العقائد بھی ہیں۔ ہمارے دل و دماغ میں دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس کا حسن و جمال مرکوز اور جما ہوا ہے۔ حقائق ہم سے چھپے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم کو وصول الی اللہ کے لیے اور قربِ حق کے لیے ان ذرائع اور خاص وسائل کی حاجت ہے اور شدید حاجت ہے۔ اس لیے کتبِ تصوف کی تدوین ہوئی اور ان میں باطنی بیماریاں، ان کی وجوہات اور طریق علاج کمال وسعت کے ساتھ مدون و مضبوط موجود ہیں۔ باوجود اس کے سالکین کو سلوک کے مراحل طے کرنے، اصلاحِ نفس اور تزکیہ اخلاق میں شیخِ کامل کی سخت ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ طب کی کتابیں ہوتے ہوئے حکیم یا ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیخ کی تعلیم و تربیت کے بغیر شیطانی جالوں اور

چالوں سے محفوظ رہنا اور صحیح سالم منزل مقصود پر پہنچنا کافی مشکل اور عادتاً محال ہے۔ چونکہ شیخ کامل مختلف اذکار و اشغال و غیرہ میں سے اپنی بصیرت، فہم و فراست اور اپنے تجربات کی بنا پر اس راہ سلوک کی ہر سمت میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے ساتھ سفر طے کر چکا ہوتا ہے۔ لہذا اب وہ ہر سالک کے مزاج اور خصوصیات کے موافق ذکر و شغل وغیرہ تجویز کرتا ہے۔ جس سالک کی جس طریق سے مناسبت سمجھتا ہے اسی طریق کے ذریعے منزل مقصود کی جانب اس کی رہبری کرتا ہے۔ بالکل ایسی مثال ہے جیسے طب ظاہری میں جسم کے علاج کے لیے متعدد ادویہ ایک اثر، ایک درجہ، ایک کیفیت اور ایک مزاج کی ہوتی ہیں۔ لیکن طبیب حاذق مختلف اصحاب کے لیے حنفی مناسبت کی بنا پر علیحدہ علیحدہ دوا تجویز کرتا ہے اس پر اعتماد نہیں کرتا کہ یہ دوائیں خواص میں متحد ہیں اس لیے سب مریضوں کے لیے جو ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں ایک ہی دوا تجویز کر دوں۔ تو دیکھیے کتب طب ظاہری میں بھی نہایت تفصیل کے ساتھ یہ دوائیں موجود ہیں۔ لیکن مریضوں کے لیے اپنے معاملات میں صرف ان کا مطالعہ کافی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ضرور ماہر فن طبیب کو تلاش کیا جاتا ہے۔ خصوصاً پیچیدہ امراض میں حتیٰ کہ امراض شدیدہ میں تو خود ڈاکٹر بھی اپنے علاج کے لیے اکثر دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ لیتے ہیں۔ پس جو نسبت مرض جسمانی اور طب کی کتابوں اور اطباء میں ہے وہی نسبت سالکین کے امراض روحانیہ و نفسانیہ اور کتب تصوف و مشائخ میں ہے۔

◆ سلطان الاذکار کا طریقہ

اس کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹے سے حجرہ میں جہاں شور و غل نہ ہو، داخل ہو کر درود شریف اور استغفار اور اَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھ کر ”اللّٰهُمَّ اَعْطِنِيْ نُورًا وَّاجْعَلْ لِيْ نُورًا وَّاعْظِمْ لِيْ نُورًا وَّاجْعَلْنِيْ نُورًا“ تین بار حضور قلب و تصور کے ساتھ کہے۔ پھر خواہ لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر بدن کو ہلکا کرے اور مردہ تصور کرے اور پورا متوجہ اور باہمت ہو جائے۔ اس کے بعد

سانس لیتے وقت ”آدّۃ“ کا اور سانس باہر نکالتے وقت ”هُو“ کا تصور کرے اور خیال کرے کہ سانس لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت ہر بال بال سے ”هُو“ نکل رہا ہے۔ یہاں تک مشغول ہو کہ اپنا خیال تک بھی جاتا رہے اور ”هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ“ کا ہر وقت تصور قائم ہو جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طرح سے کچھ عرصہ بعد جسم کا ہر رواں رواں ہر بال بال ذکر ہو جائے گا اور انوارِ تجلی سے منور ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حواسِ خمسہ کو روئی سے یا انگلیوں سے اس طرح بند کرے کہ دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کے سوراخوں میں دے اور دونوں انگلیاں شہادتین کی دونوں آنکھوں کے پپوٹے پر رکھے اور دونوں انگلیاں بیچ کی دونوں نتھنوں پر رکھے اور دونوں انگلیاں چھنگلی کے پاس کی اوپر کے ہونٹ پر اور چھنگلی نیچے کے ہونٹ پر رکھے اور اکڑوں بیٹھ کر یا جس طرح بیٹھنے کی سہولت ہے بیٹھ کر زبان کو تالو سے لگائے اور آہستہ آہستہ سانس لے کر جس دم کرے یعنی سانس کو روکے اور لفظ ”آدّۃ“ خیال سے بلا حرکت لسان ناف سے کھینچ کر ام الدماغ یعنی سر کے بیچ میں روکے جب تک بلا تکلف رک سکے اور وہاں سے دل میں لے جا کر اسمِ ذات ”آدّۃ“ خیال سے کہتا رہے۔ جب سانس لینے کا تقاضا ہو تو صرف نتھنوں سے انگلیاں ہٹا کر ناک سے آہستہ سانس چھوڑے۔ تین سانس لے کر پھر جس دم کرے اور پھر ایک ایک سانس بڑھا کر تحمل کی مقدار کو پہنچا دے۔

◆ شغل سلطاناً نصیراً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ صبح شام رو بقبلہ دو زانو بیٹھے اور اطمینانِ خاطر سے دونوں آنکھیں یا ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے ناک کے نتھن پر نظر ڈالے اور بغیر پلک جھپکائے۔ جس طرح چراغ یا ستارہ کی روشنی کو دیکھتا ہے، غیر معین نور کا تصور کرے اور استغراق ایسا ہو کہ وہ محو ہو جائے۔ ابتدا میں تو آنکھوں میں ضرورت تکلیف ہوگی اور پانی بہے گا لیکن چند دن کے بعد جب عادت ہو جائے گی تو یہ تکلیف جاتی رہے گی اور اس کو اپنی صورت جس طرح آہینہ میں نظر آتی ہے نظر آنے لگے گی اور نورِ الہی سے منور ہو

جائے گا۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس شغل کے فوائد بہت ہیں۔ خصوصاً خطرات کے انسداد میں عجیب و غریب تاثیر رکھتا ہے۔

◆ شغل سلطاناً محموداً

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح ”سُلْطَانًا نَصِيْرًا“ کے ذکر میں نتھنوں پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح اس شغل میں دونوں بھوؤں کے نیچے نظر رکھتے ہیں۔ اس شغل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذاکر کو اپنا سر نظر آنے لگتا ہے اور جب سر نظر آنے لگتا ہے تو عالم بالا کے حالات سے مطلع ہو جاتا ہے۔

◆ شغل سہ پایہ

شغل سہ پایہ ”اَللّٰهُ سَمِيْعٌ“ ”اَللّٰهُ بَصِيْرٌ“ ”اَللّٰهُ عَلِيْمٌ“ کا ذکر ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ چار زانو بیٹھ جائے اور سلطاناً نصیراً کا تصور کرے اور سانس روک کر ناف سے لے کر ام الدماغ تک پہنچائے۔ جب سانس ام الدماغ میں پہنچے تو ”اَللّٰهُ سَمِيْعٌ“ کہے اور ”بِيْ يَسْمَعُ“ (مجھے وہ سنتا ہے) کا تصور کرے، پھر ”اَللّٰهُ بَصِيْرٌ“ کہے اور ”بِيْ يَبْصُرُ“ (مجھے وہ دیکھتا ہے) کا تصور کرے، پھر ناف پر ”اَللّٰهُ عَلِيْمٌ“ کہے اور ”بِيْ يَنْطِقُ“ (مجھ سے وہ جیسے بات کرتا ہے) کا تصور کرے، پھر اس کے بعد اس طرح شروع کرے کہ ام الدماغ میں ”اَللّٰهُ عَلِيْمٌ“ اور ناف پر ”اَللّٰهُ سَمِيْعٌ“ عروج و نزول کے طریقہ پر کہے یہاں تک کہ ایک سانس میں ایک سو ایک بار شغل سہ پایہ کرنے لگے۔

◆ غور طلب

یہ شغل لکھ دیے ہیں۔ جس کی صحت عمدہ ہو، اعصاب میں ضعف نہ ہو اور سالک چاہے تو کرے، لیکن شیخ کی تجویز ہر حالت میں ضروری اور مقدم ہے۔ اطلاع اور اتباع اصل ہے۔ ذکر و شغل یک ضربی، چہار ضربی، پنج ضربی، شش ضربی اور ہفت ضربی بھی ہے۔ لیکن اب بس یک ضربی اور دو ضربی پر کفایت کی جاتی ہے۔ نہ لوگوں میں اس کی طاقت ہے نہ ہی اتنا شوق ہے۔ صرف تشنت کا باعث

بن سکتے ہیں الا ماشاء اللہ اور جتنا بتایا گیا ہے اس میں بھی ان سب کو جن کو ان کے ساتھ مناسبت ہو ان شاء اللہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

3.1.2.2.1.3... مراقبات

جب ذکرِ ضربی یا سری کی تکثیر سے سالک منور ہو جاتا ہے اور اس کی رگ رگ، رو نگئے رو نگئے میں ذکر سرایت کر جاتا ہے اور ایک محویت کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے تب مراقبات کی تعلیم کی نوبت آتی ہے۔ اصل یہی ہے۔ لیکن اب عوارض کے سبب ذکر کے ساتھ ساتھ ہی مراقبات بھی تعلیم کر دیے جاتے ہیں۔ کسی ایسے مضمون کو سوچنا جو اللہ جل شانہ تک پہنچانے والا ہو، اس کے خیال رکھنے کو مراقبہ کہتے ہیں۔ لہذا مراقبہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مد نظر رکھنے کو کہتے ہیں اور مراقبہ خاص یہ ہے کہ خدا کی ذات میں اس قدر فکر کرے کہ اپنے سے بے فکر و بے خبر ہو جائے۔ کبھی یاد دل سے نہ اترے خواہ جمال کے لحاظ سے ہو یا جلال کے لحاظ سے ہو۔ انس کے طور پر ہو یا خشیت کے ساتھ ہو، خوف کے ساتھ ہو یا رحمت کے ساتھ، محبت کے ساتھ ہو یا اس کے ساتھ ملنے کے شوق کے ساتھ۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ دو زانو نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر دے اور اللہ جل شانہ کی حضوری میں حاضر کر دے اور اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۞ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر تین بار ”اَللّٰهُ حَاضِرِی“، ”اَللّٰهُ نَاطِرِی“ اور ”اَللّٰهُ مَعِی“ زبان سے کہہ کر ان کے معنوں (یعنی اللہ میرے ساتھ حاضر ہے۔ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اللہ میرے ساتھ ہے) کو دل میں ملاحظہ کرے، تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور میرے پاس ہے۔ اس جاننے اور تصور کرنے میں اس قدر مٹو ہو کہ غیر حق کا تصور نہ رہے حتیٰ کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔ اس کے لیے وقوفِ قلبی بہت معتبر ہے۔

◆ وقوفِ قلبی

اس سے مراد دل کا دھیان ہے۔ پہلے ذہن سے شروع ہوتا ہے یعنی ذہن سے دل

پر توجہ کرتے ہیں جو بعد ازاں دل کی دل پر توجہ میں بدل جاتا ہے۔ یہ مشق سے آہستہ آہستہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیتِ حضوری اور کیفیتِ احسان کے حصول کے لیے ہوتا ہے تاہم اس سے اطمینان کی کیفیت جو حاصل ہوتی ہے وہ ﴿لَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ [الرعد: 28]

ترجمہ: ”یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے“ کے ناطے اس کا خاصہ ہے لیکن اس کی نیت نہیں کرنی ہوتی، وہ بھی حاصل ہو تو اس پر شکر کے ساتھ ساتھ جاری رکھنا ہے۔ دل کا دھیان بڑی دولت ہے۔ یہ نصیب ہو جائے تو پھر چاہے پتا چلے یا نہیں۔ روحانی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

◆ مراقبہ کی تعریف

کسی بھی چیز کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا نام ہے۔ مثلاً کسی آواز کے سننے یا کسی چیز کو محسوس کرنے یا قلبی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ اس میں خود کچھ کرنا نہیں ہوتا بلکہ جو ہو رہا ہو اس کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں دل پر کسی کو اختیار نہیں۔ اس لیے دل سے ہم کچھ نہیں کروا سکتے لیکن دل جو کچھ کر رہا ہے اس کو محسوس کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ اصل میں دل ایک لطیفہ ہے اور اس کی طرح جیسا کہ گزر چکا ہے اور بھی لطائف ہیں جیسے لطیفہٴ روح، لطیفہٴ سر، لطیفہٴ خفی، لطیفہٴ اخفی اور لطیفہٴ نفس۔ ان لطائف کے اصول (جڑیں) عرش سے اوپر ہیں اور ان کے سرے (Sensing Points) ہمارے جسم کے اندر ہیں۔ چونکہ ان کا علم کشفاً ہوا ہے اس لیے ان کے مقامات کے تعین میں اختلاف بھی ہوا ہے۔ ان لطائف کے حال کی طرف توجہ کرنے سے ہم پر بہت کچھ کھل سکتا ہے۔ اگر ہم ان محسوسات کا صحیح استعمال کر لیں تو ہم کو وہ علوم و معارف حاصل ہو سکتے ہیں جن کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہاں ان ظلال پر توجہ کر کے ان پر ذکر کے ذریعے ان کے اصول تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے مختلف مراقبات کے ذریعے ان علوم و معارف تک محض خدا کے فضل سے رسائی حاصل کر سکتے ہیں جس کے ذریعے ہمارا علم، حال میں بدل سکتا ہے اور یہی ان مراقبات کا ثانوی مقصد ہوتا ہے کیونکہ اصل میں تو شریعت پر کیفیتِ احسان کے ساتھ

عمل مقصود ہے لیکن عمل کا درجہ اس کی معرفت کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی میں ہی فرق ہوتا ہے۔ ان محسوسات کی نیت کر کے بس پھر ان لطائف کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ ہمیں کروانا نہیں بلکہ اس نیت کے مطابق محسوس کرنا ہے۔ اگر ہم اس سے کچھ کروانے کی کوشش کریں گے تو اس میں ہماری سوچ کو دخل ہو گا جو محدود ہے اور یہ لطائف ہماری پہنچ سے بھی باہر ہیں اس لیے فائدہ نہیں ہو گا۔ نیز تھکاؤت بھی ہو گی لیکن اگر جو ہو رہا ہے ہم اس کو محسوس کرنے کی کوشش کریں گے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ البتہ جو ہم محسوس کریں گے وہ امر واقعہ ہو گا محض خیال نہیں ہو گا لیکن اس کے امر واقعہ ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہو گی۔ اپنے شیخ سے سیکھ کر ذکر کے ذریعے ان تمام لطائف کو زندہ کرنا ہوتا ہے یعنی ان کا اپنے اصول کے ساتھ رابطہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کو عروج کہتے ہیں کیونکہ اس سے عالم بالا کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ اس سے یہ لطائف منور ہو جاتے ہیں اور ان کا رنگ بھی اہل کشف کو محسوس ہو سکتا ہے۔

لطائف کا دور مکمل ہونے کے بعد ان کو مزید مراقبات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ترتیب شیخ کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ کون سا مراقبہ کس ترتیب سے کرنے کو بتاتا ہے کیونکہ اس میں اصل مقصود کیفیتِ حضوری اور کیفیتِ احسان ہے۔ اس کے حصول کے لیے جو ترتیب شیخ کامل کے قلب پر مرید کے لیے وارد ہو گی وہی اس کے لیے بہتر ہو گی۔ تاہم شیخ، دوسرے مشائخ کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس میں مرید کی پسند اور ناپسند کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ اس کے مقصد کے حصول کو دیکھا جائے گا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اصل وجود اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے وہ واجب الوجود ہے یعنی جب کچھ بھی نہیں تھا تو وہ تھا۔ اس کے پیدا کرنے سے سب کچھ پیدا ہوا۔ یہ سب جو پیدا ہوئے چاہے امر ”مُن“ سے ہوں یا تخلیق کے ذریعے، یہ سب ممکنات ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم جو گمان رکھیں گے تو ”أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي يَوْمِي“ [صحیح

بخاری، حدیث نمبر: 6970] کے مطابق وہ ہمارے ساتھ وہی معاملہ رکھے گا پس اگر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ہمارے لیے ممکن بنایا ہو۔ ان کا اپنے آپ کو محتاج محض سمجھ کر متوجہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ہمارا بھی اس میں حصہ ہو جائے البتہ دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک اخلاص نیت کی اور دوسری متوجہ ہونے کی۔ آگے انتظار ہے۔

﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ [القصص: 24]

ترجمہ: ”میرے پروردگار! جو کوئی بہتری تو مجھ پر اوپر سے نازل کر دے، میں اس کا محتاج ہوں“ کے مطابق جو اس بڑے در سے، جہاں سب کچھ ہے۔ جو مل جائے اس کو نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر خوشی خوشی حاصل کریں۔

◆ مراقبات کی قسمیں

1.3.1.2.2.1... مراقبہ احدیت

یہ نیت کر کے دل کی طرف متوجہ ہونا کہ اس ذات کی طرف سے فیض آرہا ہے جو کہ تمام نقائص و زوال سے پاک ہے اور ہر کمال سے متصف ہے فیض آرہا ہے آپ ﷺ کے دل کی طرف اور آپ ﷺ کے دل سے فیض آرہا ہے میرے شیخ کے دل کی طرف اور میرے شیخ کے دل سے میرے دل میں جو موردِ فیض ہے (وہ جگہ جہاں فیض آنے کا تصور کیا جاتا ہے) فیض آرہا ہے۔ اس کو غور سے دیکھا جائے تو اس کے دو حصے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا استحضار اور اس کی طرف سے فیض آنے کا استحضار۔ ان دونوں کو قلبی طور پر دہرانا مقصود نہیں جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے علم کو حال کے طور پر محسوس کرنا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ میں اگر کسی بڑی ہستی کے سامنے بیٹھوں اور اس کی بات کی طرف دھیان کروں تو یہ ذہن میں نہیں دہراؤں گا کہ ایک بڑی ہستی کے سامنے بیٹھا ہوں اور اس کی بات سن رہا ہوں بلکہ اس کو جان رہا ہوں گا کہ بڑی ہستی کے سامنے بیٹھا ہوں اور اس کی بات کی طرف کان لگاؤں کہ کوئی بات سننے سے رہ نہ جائے۔ بس اس طرح اس ذات کا جو تمام نقائص و زوال سے پاک اور تمام کمالات سے متصف ہے کا دھیان دل میں جما کر

جاؤں اور اس کی طرف سے فیض کے آنے کا قلب سے محسوس کرتا رہوں۔ اس میں جتنا بھی محسوس ہو نعمت ہے۔ اس پر شکر کروں اور مزید کے لیے دل کو کھلا رکھوں کہ جس وقت فیض کا جو قطرہ بھی آئے مجھ سے غفلت کی وجہ سے ضائع نہ ہو۔ ساتھ ساتھ جس ذکر سے ان لطائف کا اجر کیا ہو وہ چلتا رہے۔ یہ غفلت سے بچنے کے لیے ہے ورنہ اس مراقبہ کا مطلوب تو فیض کے آنے کا احساس ہے۔ جب یہ مراقبہ پکا ہو جائے تو پھر صرف فیض کا دھیان ہوتا ہے ذکر بھی محسوس نہیں ہوتا یعنی سالک اسم سے مسمیٰ کی جانب ترقی کر لیتا ہے۔

اس مراقبہ کو دل سے شروع کیا جاتا ہے اور باقی لطائف پر بھی باری باری کرا دیا جاتا ہے۔ مراقبہ تو وہی ہے صرف موردِ فیض بدلتا رہتا ہے۔ اس مراقبہ میں اگر موردِ فیض اوپر کی جانب کچھاؤ محسوس کرے تو یہ اس کا نفسیاتی اثر ہے کیونکہ ہم عرش کو اوپر سمجھتے ہیں۔

2.1.2.2.1.3.2... مراقبہ تجلیاتِ افعالیہ

اس میں موردِ فیض ”قلب“ ہوتا ہے۔ اس میں ہم یہ دھیان بناتے ہیں کہ فیض اُس ذات سے جو ﴿فَعَالٌ لِّمَآئِدٍ﴾ ہے۔ آپ ﷺ کے قلب پر آتا ہے۔ آپ ﷺ کے قلب سے شیخ کے قلب پر اور شیخ کے قلب سے سالک کے قلب پر۔ ہم ویسے بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کرتا ہے۔ اس مراقبہ میں اس محض جاننے کو حال کے درجے میں محسوس کرنا ہوتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز، عزت و ذلت، کامیابی و ناکامی، موت و حیات سب اس کے امر سے ہوتا ہے۔ اس کو توحیدِ افعالی کہتے ہیں۔ اس کو درجہِ حال میں حاصل کرنا ہوتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.3... مراقبہ صفاتِ ثبوتیہ

اس میں موردِ فیض ”لطیفہٴ روح“ ہوتا ہے۔ اس میں فیض آتا ہے اُس ذات سے جو حی و قیوم ہے۔ قادرِ سمیع و بصیر ہے۔ جس کے پاس اصل علم ہے۔ اصل ارادہ اس کا ہے۔ اس کا کلام اصل کلام ہے اور وہی ذات ”مَنْ فَيَكُونُ“ ہے۔ یہ فیض آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اور آپ ﷺ کے قلبِ اطہر سے شیخ کے قلب پر اور

وہاں سے سالک کے لطیفہ بروح پر آتا ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ اِنْ يَشَاءُ يُدْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿﴾ (الفاطر: 15-17)

ترجمہ: ”اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا بذات خود مستحق۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق وجود میں لے آئے اور یہ کام اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے“ ہم ان سب کو علما جانتے اور مانتے ہیں۔ مگر یہ حال کے درجے میں بھی حاصل ہوں، اس کے لیے یہ مراقبہ ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے جیسے ان کو علما و حالاً پایا تو آپ ﷺ کے طفیل ہمیں بھی اس طرح حاصل ہو۔

4.3.1.2.2.1... مراقبہ شیونات ذاتیہ

اس میں مورد فیض ”لطیفہ برّ“ ہوتا ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جس کی ہر لمحے ایک خاص شان ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے برّ پر۔ شان سے صفات وجود میں آتی ہیں۔ صفات خارج میں علیحدہ وجود رکھتی ہیں۔ جبکہ شان کا تعلق ذات کے ساتھ ہے۔ اس مراقبہ میں مختلف صفات کی طرف جو توجہ ہوتی ہے اس کا رخ ذات کی طرف موڑا جاتا ہے جس کی شیونات (شیونات شان کی جمع ہے) سے مختلف صفات وجود میں آتی ہیں۔ ﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي تَشَانٍ﴾ [الرمن: 29]

ترجمہ: ”وہ ہر روز کسی شان میں ہے۔“

5.3.1.2.2.1... مراقبہ تنزیہ و صفات سلبیہ

اس میں مورد فیض ”لطیفہ خفی“ ہے۔ اس میں اس ذات سے فیض آتا ہے جو بے چون و بے چگون ہے (یعنی اس کو ذہن میں لانا کہ کیسے ہے۔ ممکن نہیں)، اس کی طرح کوئی نہیں۔ وہ جسم، بیوی، ماں باپ اور اولاد سے پاک ہے۔ وراء الورا ہے۔ قریب ہے لیکن ایسا نہیں جس طرح ہم کسی کو قریب سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہے لیکن اس کا ساتھ ہونا ایسا

نہیں جس طرح ہم کسی کو ساتھ سمجھتے ہیں۔ یہ فیض آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے لطیفہٴ خفی پر آتا ہے۔ اس مراقبہ میں ہم اللہ تعالیٰ جن چیزوں سے پاک ہے۔ کادھیان حال کے درجے میں حاصل کرتے ہیں۔

6.3.1.2.2.1... مراقبہٴ شانِ جامع

اس میں موردِ فیض ”لطیفہٴ اخفی“ ہوتا ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو اپنی شان کے مطابق تمام صفات و شیونات کا جامع ہے۔ یہ فیض آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے لطیفہٴ اخفی پر آتا ہے۔

◆ غور طلب

چونکہ قلب قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور باقی لطائف کشفی ہیں۔ آپ ﷺ کی طرف ایسی بات کو منسوب کرنا جو ظنی ہو سے بچنے کے لیے اگر ہم ہر مراقبہ میں یہ کہیں کہ فیض آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر آتا ہے تو اس میں زیادہ حفاظت نظر آتی ہے۔ کیونکہ پہلے کہا گیا کہ ان ظنیات کے لیے دلیل کی ضرورت ہوگی۔

ان مراقبات سے حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ”اللہ تعالیٰ کے اخلاق“ اور ”سنتِ رسول ﷺ کی پیروی“ سے متصف ہو جائیں۔ اللہ نصیب فرمائے۔ آمین
یہ سالکین کے مشارب (جہاں سے فیضِ خاص حاصل ہوتا ہو) ہیں اس لیے جس کی جس لطیفے کے ساتھ زیادہ مناسبت ہوگی وہ اس کے ذریعے زیادہ حاصل کرے گا۔

7.3.1.2.2.1... مراقبہٴ معیت

اس میں موردِ فیض ”لطیفہٴ قلب“ ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو میرے ساتھ ہے اور کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کی شان کے مطابق ہے۔
چونکہ بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ معیتِ الہی متشابہات میں سے ہے۔ اس لیے اس کی صحیح کیفیت کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتے ہیں۔ اس لیے مندرجہ بالا محتاط الفاظ کو حال کے درجے میں لانا ضروری ہے۔

2.1.2.2.1.3.8... مراقبہ حقیقتِ کعبہ

کعبہ معظمہ مسجدِ حقیقی نہیں بلکہ مسجدِ مجازی ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم تھا تمام ملائکہ کو بشمول ابلیس، لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو مردود ہوا، تو کعبہ کی طرف سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی شان لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس تجلی کی طرف سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ اس مراقبہ میں موردِ فیض ”قلب“ ہے اور فیضِ مسجدِ حقیقی ذات سے اس تجلی کے ذریعے جو کعبہ کی طرف آرہی ہے سے آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر آرہا ہے اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے ہیئتِ وحدانی (پورے جسم) پر آتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.9... مراقبہ حقیقتِ قرآن

اس میں موردِ فیض، ہیئتِ وحدانی ہے۔ اس ذات سے جس کا علم لازوال، اصلی اور لامتناہی ہے۔ جس کا کلام اسی کی شان کے لائق ہے۔ اس ذات کے کلام، قرآن سے آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر آرہا ہے اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے فیض سالک کے ہیئتِ وحدانی پر آتا ہے۔

اس مراقبہ سے قرآن کی حقیقت سالک پر کھلتی ہے۔ اس کے بعد عالم قرآن نہ صرف اس کے علم سے استفادہ کرتا ہے بلکہ اس کے نور سے بھی مستفید ہوتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.10... مراقبہ حقیقتِ صلوة

نمازِ عبدیت کی ایک مخصوص صورت ہے۔ ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 50] کی عملی تشریح اس میں سب سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس سے پہلے مراقبہ عبدیت بہتر رہے گا۔

2.1.2.2.1.3.11... مراقبہ عبدیت

یہ محسوس کرنا کہ میرا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں ہے۔
مراقبہ حقیقتِ صلوة میں مراقبہ عبدیت کا استعمال یوں ہو گا کہ یہ محسوس کیا جائے کہ نماز میں میرا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔

2.1.2.2.1.3.12... مراقبہ احسان

اپنے آپ کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے پانے کو محسوس کرنا۔
اس کے دو جزو ہیں۔ ایک میں اللہ تعالیٰ کی موجودگی کو اتنا محسوس کرنا گویا کہ اللہ تعالیٰ
کو دیکھ رہا ہو۔ اگر ایسا کوئی نہ کر سکے تو خود کو ایسا یقین کرانا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں۔
اس کا سلب سلب طریقہ زیادہ آسان ہے اور وہ یہ کہ خود محسوس کرے کہ کیا میں یا میری
کوئی چیز خدا سے پوشیدہ ہو سکتی ہے؟ جواب نہیں میں ہو گا۔ یہی اس کا اثبات ہے۔ اس کو
پختہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اور مراقبات بھی ہو سکتے ہیں۔ جو کہ درج ذیل ہیں:

2.1.2.2.1.3.13... مراقبہ حب الہی

اس میں موردِ فیض لطیفہ قلب ہے اور فیض آرہا ہے محبوب حقیقی کی طرف سے
آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک کے
قلب پر، جس سے دل میں اللہ کی محبت مسلسل بڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی برداشت کی
قوت بھی عطا ہو رہی ہے۔

2.1.2.2.1.3.14... مراقبہ حب فی اللہ

اس میں موردِ فیض لطیفہ قلب ہے اور فیض آتا ہے اس ذات سے جو محبوب حقیقی
ہے۔ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر اور وہاں سے شیخ کے قلب پر اور وہاں سے سالک
کے قلب پر، جس سے دل میں اللہ والوں کی محبت مسلسل بڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی
برداشت کی قوت بھی عطا ہو رہی ہے۔

2.1.2.2.1.3.15... مراقبہ نور

جس میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ میں نور کے لامتناہی دریا میں کھڑا ہوں اور
آہستہ آہستہ اس میں غرق ہو رہا ہوں۔

2.1.2.2.1.3.16... مراقبہ دعائیہ

اس میں سالک اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے محسوس کر کے دل ہی دل میں
اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔

2.1.2.2.1.3.17... مراقبہ رویت

خدا کی رویت کا تصور کرے: ﴿الَّذِينَ يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَبْزِيهِ﴾ [علق: 14]

ترجمہ: ”کیا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ دیکھ لیا ہے؟۔“ اس پر غور کرے اور اس پر باقاعدگی کرے اور یہاں تک مشغول ہو کہ یہ مراقبہ پکا ہو جائے۔ مراقبہ معیت ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحمد: 4]

ترجمہ: ”اور تم جہاں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے۔“ اس کے معنی کے ساتھ تصور اور یقین کرے کہ خلوت اور جلوت، بیماری اور تندرستی ہر حالت میں اللہ میرے ساتھ ہے۔ اسی خیال میں ڈوب جائے۔

2.1.2.2.1.3.18... مراقبہ اقربیت

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق: 16]

ترجمہ: ”اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں“ اس آیت پر اس کے معنی کے ساتھ غور کرے اور اس خیال میں محو ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے قریب ہے۔

2.1.2.2.1.3.19... مراقبہ وحدت

”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ“ (اس کا وجود ہر جگہ جلوہ فرما ہے ابتدا اور انتہا میں وہی ہے) اس کو زبان سے کہے اور تصور کرے کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے اسی خیال میں مستغرق ہو جائے۔

2.1.2.2.1.3.20... مراقبہ فنا

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۖ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

[الرمن: 26-27]

ترجمہ: ”اس زمین میں جو کوئی ہے۔ فنا ہونے والا ہے اور (صرف) تمہارے پروردگار کی جلال والی، فضل و کرم والی ذات باقی رہے گی“ اس کے معنی کا تصور کرے کہ تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی اور ذاتِ باری ہی ہمیشہ رہے گی اور دل کی آنکھ سے دیکھے

اور اس خیال میں محو ہو جائے تاکہ اس کے معنی خوب منکشف ہو جائیں اور اپنے وجود کو فنا اور علم و عقل کو اضمحلال ہو۔

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے
تری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

علم حق علم صوفی میں گم ہے
عام لوگوں کے سامنے مبہم ہے

ان میں گم ہو کہ ہے توحید یہی
اس کو بھی بھول جا، ہے تفرید یہی

گفت اس کا ہے مگر گفتِ خدا
ہے بظاہر بر لبِ عبد اللہ

2.1.2.2.1.3.21... صفاتِ باری تعالیٰ کے مراقبات

یہ سب حسبِ ضرورت کرائے جاسکتے ہیں اگر کسی کے لیے مفید ہوں۔

انوارات اور ان کی علامات

جب ذاکر باہتمام تقویٰ خدا کا ذکر کرنے لگتا ہے اور ذکر تمام اعضا میں سرایت کر جاتا ہے اور غیر خدا سے دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور روحانیت سے تعلق خاص پیدا ہو جاتا ہے تو انوارِ الہی کا ظہور ہونے لگتا ہے اور وہ انوار کبھی خود اپنے میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور کبھی اپنے سے باہر۔ اچھے انوار وہی ہیں جن کو سالک دل سینہ و سر یا دونوں طرف اور کبھی تمام بدن میں پائے یا کبھی دائیں بائیں، کبھی سامنے سر کے پاس ظاہر ہوں وہ بھی اچھے ہیں لیکن ان کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے کہ کہیں لطف اندوز و متلذذ ہو کر خسارہ اٹھائے۔ تفصیل یہ ہے:

(1) اگر کسی رنگ کا نور داپنے شانے کے برابر ظاہر ہو تو وہ فرشتوں کا نور ہے۔ اگر

- سفید رنگ کا نور ہے تو کراماتین کا ہے۔ اگر سبز پوش خوبصورت آدمی یا کوئی اچھی صورت ظاہر ہو تو وہ فرشتہ ہے جو ذکر کی حفاظت کے لیے آیا ہے۔
- (2) اگر داہنے شانے سے کچھ ہٹا ہوا یا آنکھ کے برابر ہے تو مرشد کا نور ہے اور سامنے ہے تو وہ نورِ محمدی ہے جو راہِ مستقیم کی تعلیم فرماتا ہے۔
- (3) اگر بائیں شانے کے متصل ظاہر ہو تو کاتب فرشتوں کا سینہ ہے۔ اگر بائیں شانے سے دور ظاہر ہو خواہ کسی رنگ کا ہو شیطان کا نور ہے یا دنیا کا نور ہے۔
- (4) اگر پیچھے یا بائیں طرف آواز ہو یا صورت ہو وہ شیطان کا دھوکہ ہے ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ پڑھنا چاہیے۔ ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھے، توجہ نہ کرے۔
- (5) اگر نور اوپر سے یا پیچھے سے آئے تو وہ نور ان فرشتوں کا ہے جو حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔
- (6) اگر کسی خاص سمت کے ادراک کے بغیر نور ظاہر ہو اور دل میں خوف پیدا کرے اور اس کے رفع ہو جانے کے بعد دل کا اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان نہ رہے تو وہ نور شیطان کا ہے۔ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ پڑھنا چاہیے۔
- (7) اگر بغیر کسی خاص سمت کے نور ظاہر ہو اور اس کے زوال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف دل کے دھیان کی لذت نہ جائے اور اشتیاق و طلب اسی طرح غالب رہے تو وہی مطلوب نور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے (آمین)
- (8) اگر دھویں یا آگ کے رنگ کا نور سینہ یا ناف کے اوپر ظاہر ہو تو وہ خناس کا نور ہے۔ ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھنا چاہیے۔
- (9) اگر سینہ کے اندر یا دل پر ظاہر ہو تو وہ صفائی قلب کا نور ہے۔
- (10) اگر سرخ یا سفید زردی مائل نور دل سے ظاہر ہو تو دل کا نور ہے۔ اگر خالص سفید ہے تو روح کا نور ہے جس نے طالب کے دل میں تجلی کر کے اپنی ہستی کو ظاہر کیا ہے۔ اگر سر کی جانب سے ہے تو وہ بھی روح کا نور ہے۔

- 11) اگر آفتاب کے رنگ کانور ہے اور سامنے سے ہے تو وہ بھی روح کانور ہے۔
- 12) اگر اوپر سے آفتاب کے رنگ کانور ہے تو نور ذات ہے۔ اگر چاند جیسا نور ہے تو دل کا ہے۔
- 13) اگر چاند جیسا نور ہے اور سامنے سے ہے تو نور محمدی ﷺ ہے۔
- 14) اگر کاجل کی سیاہی کی طرح تاریک اور اس کے گرد باریک اور مکدر نورانی خطوط ہیں تو وہ نور نفی کا ہے۔ اس طرف توجہ سے نفی حاصل ہوگی اور ماسوی اللہ سے قلب کا صاف ہونا اور تجلی افعالی اور تجلی صفاتی میں محویت اور فنا کا حصول ہے جو مقصد اصلی ہے۔
- 15) اگر آنکھ کی سیاہی کے مانند بلا گردا گرد باریک مکدر نورانی خطوط کے ہے تو وہ نور تجلی ذاتی کانور ہے۔ اس میں عارف کا فناء الفنا ہے اور بقا کا حصول ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے اب پھر تاکید کی جاتی ہے کہ سالک کو چاہیے کہ انوار میں سوائے مطلوب کے کسی طرف نہ متوجہ ہو اور سرور و لطف حاصل نہ کرے بلکہ صرف نور الہی میں ترقی کرے کیونکہ خدا کی تجلی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

◆ آج کل کے حالات کے مطابق اصلاح کی کوشش کا ایک نظام

چاروں سلسلوں کے اشتراک سے یہ نظام ہمارے سلسلے میں الحمد للہ بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ مشائخ کی خدمت میں ایک تجربے کے طور پر اس کو یہاں تحریر کیا جاتا ہے تاکہ اگر کسی کو مناسب محسوس ہو تو اس کو تعلیم میں شامل کر سکے۔

دو صورتیں اس کی ممکن ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ سادہ ذکر اور صحبت سے سالکین کو پہلے شریعت پہ چلنے پر آمادہ کیا جائے اور ان کو فرض عین علم سکھا کر شریعت پر اچھی طرح چلا جائے۔ اس سے شرعی مجاہدہ کی موجودگی میں علاجی مجاہدہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے

بعد مراقبات کے ذریعے ان کے دل کی اصلاح کر کے ان کے اعمال میں جان پیدا کی جائے۔ اس سے ان کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ گویا کہ تصوف کی ابتدائی صورت کو آج کل کے دور میں حاصل کر کے اسی طرز پر تکمیل کی کوشش ہوگی۔

اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پہلے مراقبات کے ذریعے ان کے قلب کا اتنا تزکیہ کرایا جائے کہ وہ شریعت پر چلنے کے لیے تیار ہو جائیں اور آخر میں سلوک طے کرایا جائے جس سے ان کی تکمیل ہو۔ مؤخر الذکر طریقہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا تھا کیونکہ اس وقت لوگ شریعت پر نہیں چل رہے تھے اس لیے کہ اگر قلب کا تزکیہ ہو چکا ہو تو ایک طرف اگر ان مقامات کا ادراک آسان ہو جاتا ہے تو دوسری طرف نفس تزکیہ کے لیے آسانی کے ساتھ آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں نفس کے تزکیہ سے اعراض جہاں ایک طرف اپنی محنت پر پانی پھیرنا ہے تو دوسری طرف نفس کی خواہشات سے اتر لے کر وہ گمراہ ہو سکتا ہے اور اس کی گمراہی کے لیے میدان زیادہ تیار ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس کی سرکشی اس کے قلب کی صفائی کو نہ صرف کسی اور رنگ میں دکھا سکتی ہے بلکہ کچھ ہی عرصے میں سرکش نفس قلب کو نفسانی خواہشات سے پھر آلودہ کر سکتا ہے۔

پہلی صورت میں یہ بتایا گیا کہ فرض عین علم سکھا کر شریعت پر اچھی طرح چلایا جائے، تب ان کے لیے صرف دل کی اصلاح کافی ہوگی۔ یعنی نفس کا اتنا تزکیہ ہو چکا ہو کہ شریعت پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ پہلے دور میں اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو ان سے اسی وقت مجاہدہ کروا کر نفس کی سرکشی کو ختم کرایا جاتا تھا۔ جیسا کہ شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ تفصیل سے کتابوں میں موجود ہے۔ کیونکہ بعض اوقات سالکین عبادت کی حد تک تو شریعت پر چلتے ہیں۔ معاملات میں نہیں۔ بعض ان دونوں میں شریعت پر چلتے ہیں لیکن معاشرت میں نہیں اور بعض ان تینوں میں چلتے ہیں لیکن اخلاق میں نہیں۔ الغرض ان چاروں میں سے جس میں بھی کسی بھی وجہ سے کمی پائی جائے اور محض

سادہ ذکر اور صحبت سے اس کی اصلاح ممکن نہ ہو سکے، تو اس کا علاج مجاہدہ ہے۔ اب مجاہدہ چاہے پہلے کرایا جائے یا بعد میں، لیکن نفس کو اطاعت پر لانے کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔

اس دور میں ایک طرف ذہنی انتشار ہے تو دوسری طرف نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے سامان بہت عام ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ علمائے سوء کی وجہ سے عوام سے اصلی علم اور جھل ہو گیا ہے جس سے جاہل لوگ علما کو جاہل کہنے لگے ہیں۔ ان حالات میں عوام میں صحیح چیز کی طلب کا پیدا کرنا بھی بہت بڑا کام ہے۔ اس کے بعد جن میں طلب پیدا ہو ان کی اصلاح کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ کہا گیا کہ نفس کو اطاعت پر لانے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہوگی۔ چاہے وہ دل کی اصلاح سے پہلے ہو یا بعد میں۔

آج کل کے دور میں مجاہدہ بھی ضروری ہے لیکن دل کی اصلاح میں بھی زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اس صورت میں بعض چیزوں کی اصلاح کے لیے جس مجاہدے کی ضرورت ہے اگر وہ سالک کے دل پر نہ کھلی ہوں تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے آج کل کے دور کے لیے مجاہدے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ یعنی دل کی اصلاح سے قبل اور دل کی اصلاح کے بعد۔ دوسرے لفظوں میں سلوک کا ایک حصہ جذب سے پہلے اور دوسرا حصہ جذب کے بعد۔ جو جذب سے پہلے والا سلوک ہے وہ جذب کے لیے تیاری ہے اور جذب سے بعد والا حصہ جذب کو کنٹرول کرنے کے لیے ہے۔ پہلے والا حصہ عروج کے لیے ہے اور دوسرا نزول کے لیے ہے۔ موجودہ تبلیغی جماعت میں بیانات اور حرکت کے ذریعے پہلا حصہ طے ہو جاتا ہے اور قربانی کے بقدر جذب بھی حاصل ہو جاتا ہے لیکن ان کے جذب کا ایک خاص رنگ ہے۔ اس کو مطلوبہ رنگ دینے کے لیے مراقبات کی ضرورت ہوگی تب ان کو نزول والا سلوک طے کرایا جاسکے گا بصورت دیگر عدم تکمیل میں ہی تکمیل محسوس کر رہے ہوں گے۔ خائفانہ ہوں والے حضرات بھی پہلے ذکر، صحبت اور مناسب مجاہدات کے ذریعے ابتدائی سلوک طے کر کے مراقبات کے ذریعے جذب حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے بعد نزول والا سلوک طے کر کے تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔ آگے تفصیلات ہیں جس کا یہ موقع نہیں۔

ہمارے ہاں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے کہ سالکین کے لیے پہلے ہم بارہ تسبیح تک بتدریج بڑھاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ایک تسبیح اسم ذات کی بھی شامل ہے۔ پھر اسم ذات مناسب تعداد تک بڑھایا جاتا ہے جس کو پھر ذکر خفی سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر لطائف کا دور شروع کرواتے ہیں اور سلطان الاذکار سے ہوتے ہوئے مزید مراقبات تک ان کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس ترتیب سے مراقبات آسانی شروع ہو جاتے ہیں۔ آگے پھر نقشبندی طریقے سے سلوک پورا کرواتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر جہری سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ آدمی باہر کے شور سے منقطع ہو جاتا ہے (اور اتنے خیالات بھی نہیں آتے) جس سے یکسوئی جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔

خواتین کے لیے البتہ ابتدائی ذکر کے فوراً بعد ذکر خفی شروع کرایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ ان کے اندر فطری طور پر یکسوئی کی استعداد ہے۔

یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ جیسے نقشبندی سلسلے کا قادری سلسلے کے ساتھ ایک خوبصورت جوڑ سلسلہ راشدیہ کی صورت میں پہلے سے موجود رہا ہے۔ اس میں لطائف پر جہر کے ساتھ ذکر (اللہ ہو) کرایا جاتا ہے۔ پھر چونکہ قادری اور چشتی سلوک بالخصوص چشتی نظامی سلوک میں برائے نام ہی فرق ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تین سلسلوں کا مجموعہ ہو گیا۔ بنوریہ طریقہ بھی نقشبندی طریقہ ہی ہے جس میں لطائف کی تفصیل مجددیہ معصومیہ سے مختلف ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں۔ اس لیے اصلاح کے طریقوں میں بھی اجتہادی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ لطائف کا اجرا ذہنی انتشار کی وجہ سے آج کل براہ راست ہونا مشکل ہو گیا ہے اس لیے اگر چشتیہ طریقے سے، راشدیہ طریقے سے یا آج کل ایک طریقہ ہمارے ہاں جو شروع ہو چکا ہے اس کے ذریعے سے جہری ذکر سے ابتدا کی جائے اور پھر اسم ذات کے ذریعے لطائف کا اجرا کیا جائے تو یہ ایک آسان عملی صورت ہے۔

◆ ابتدائی سلوک

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلوک کے دس مقامات یعنی توبہ، انابت، ریاضت، قناعت، تقویٰ، صبر، زہد، توکل، تسلیم اور رضا کو تفصیلی طے کرنے کا فرمایا ہے۔ ان میں

توبہ اور انابت کے ابتدائی اسباق دیے جائیں گے جن کے ساتھ متعلقہ مجاہدات بھی ہوں گے مثلاً صلوٰۃ توبہ روزانہ پڑھنے کو کہا جائے گا۔ جو بھی غلطی ہوئی ہو اس کی تلافی کے لیے اس کے بقدر نیک عمل کرنے کو کہا جائے گا۔ نصف جیب خرچ پر گزارہ کرنے کی تعلیم دی جائے گی۔ تہجد شروع کرائی جائے گی۔ دوسروں کی سخت باتوں کو برداشت کرنے کا بتایا جائے گا۔ مسجد یا خانقاہ میں جھاڑو دینے کو کہا جائے گا۔ آخر میں ان کو اور باقی آٹھ کو تفصیلی طور پر طے کرایا جائے گا۔

◆ ذکر کا مجوزہ طریقہ

پہلے لسانی ذکر ایک چلّے کے لیے کرایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تین سو دفعہ کلمہ سوم کا پہلا حصہ یعنی ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ اور دو سو دفعہ دوسرا حصہ یعنی ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر نماز کے بعد تسبیحاتِ فاطمی کا بتایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تین دفعہ کلمہ طیبہ، تین دفعہ درودِ ابراہیمی، تین دفعہ استغفار اور ایک دفعہ آیت الکرسی۔ ساتھ ذکر جہری کرایا جائے گا جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ بعد میں اسم ذات کا ذکر بتدریج پڑھایا جائے گا۔ پھر ان سے لطائف کا اجرا کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں پہلے چشتیہ صابریہ کی بارہ تسبیح کا ذکر کرایا جاتا تھا۔ اب چاروں سلسلوں کا مجموعہ بارہ تسبیح کرایا جاتا ہے۔ جس میں ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“، ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“، ”حَقُّ“ اور ”اللَّهُ“ کی ایک ایک تسبیح سے شروع کرایا جاتا ہے۔ اگلے مہینے یہ دو، دو، دو اور ایک، اس سے اگلے مہینے دو، تین، تین اور ایک، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چار اور ایک، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور ایک تسبیح، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور تین، اس سے اگلے مہینے دو، چار، چھ اور پانچ۔ اس کے بعد دو، چار، چھ ذکر جہر تو رہیں گے البتہ پانچ کی جگہ اسم ذات قلبی تعلیم کیا جائے گا۔ جب یہ شروع ہو جائے تو اس کے بعد اس کے ذریعے سے تمام لطائف کا اجرا کرایا جائے گا ان شاء اللہ۔

نوٹ۔ یہ خط کشیدہ حصہ نمونے کے طور پر دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہمارے ہاں چل رہا ہے لیکن باقی مشائخ اس کے پابند نہیں وہ اس تمام بیان میں غور کر کے جو ان کا شرح صدر ہو اس کے مطابق سالکین کو تعلیم کریں۔

خواتین کے لیے ایک علیحدہ کتاب ”سلوک النساء“ شائع ہو چکی ہے۔ ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

2.1.2.2.2... وہ فاعلات جن میں خطرہ ہے

2.1.2.2.2.1... تصویر شیخ:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

”كَانَتِي أَنْظُرُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحِيحُ نَيْبًا مِّنَ الْأَنْبِيَاءِ ضَرْبَهُ قَوْمُهُ فَادَمَوْهُ فَهُوَ يَمَسُّحُ الدَّمَ عَن وَجْهِهِ وَيَقُولُ رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3290]

ترجمہ: ”میں گویا رسول کریم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ انبیاء میں سے ایک نبی کی حکایت بیان فرماتے ہیں جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلودہ کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں“ اس حدیث شریف سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے آپ ﷺ مثل حاضر تھے حالانکہ آپ ﷺ اس وقت سامنے نہیں تھے اور یہ غایت محبت کی وجہ سے ہے۔

شیخ کی مجلس اور صحبت میں بیٹھنے کا جو اثر ہوتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں البتہ شیخ کی غیر موجودگی میں اس نعمت کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے تو اس کے لیے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تصور کی ایک طاقت دی ہے جس سے وہ اپنے آپ پر وہ کیفیت قدرے طاری کر سکتا ہے جو فی الحقیقت وہاں موجودگی میں حاصل ہوتی جس کی طرف اشارہ اس حدیث شریف سے بھی ہو سکتا ہے: ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ

تَرَاكَ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 50] یعنی دیکھنے کی حالت میں جس کیفیت میں عبادت ہوتی ہے ایسی عبادت کرو اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی ایسا حکم نہیں دیتے جو ممکن نہ ہو جیسا کہ فرماتے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرہ: 286]

ترجمہ: ”اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔“ پس ایسا کرنا ممکن ہے تبھی ایسا کہلوایا گیا آپ ﷺ سے کیونکہ آپ ﷺ کی ہر بات منجانب اللہ وحی سے ہوتی ہے۔ تو اپنے آپ کو شیخ کی غیر موجودگی میں تصور کے ذریعے صحبت میں بیٹھے تصور کرنا تصورِ شیخ کہلاتا ہے۔ اس کی بے انتہا برکات ہیں۔

ہم تصور میں شیخ کو دیکھیں اور شیخ کے فیض سے ملے ہم کو خدا شرک کیسے یہ تصور ہے کہ اس سے کیا ہوتے ہیں خدا سے جدا

پہ تو اک پل ہے جس پہ ہم گزر کے آگے پا جائیں منزل مقصود شیخ کا کام ہے ملانا اس سے فرض اپنا کرتے ہیں وہ اس سے ادا

ہاں مگر جس میں احتیاط نہیں، نہیں جائز اسے تصور یہ ممکن ہے اس کے منہ سے نکلے کبھی غیب میں بصیرت حاضر کچھ ندا

اس لیے اپنے بزرگ دیتے نہیں یہ تصور عوام کو آج کل کسی نا سمجھ کے کلام سے نہ ہو کوئی لفظ شرک کا کبھی ہویدا

ہاں مگر خود بخود کسی کو ملے اس کو روکتے بھی نہیں اس سے کہ اپنی نعمت کی لاج رکھتے ہیں وہ شبیر اس کی یہ عادت ہے سدا

اصل تصور تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نظر نہیں آسکتی اس لیے اس کا تصور آسانی سے جمتا نہیں اس لیے وساوس آتے ہیں۔ ان وساوس کو دفع کرنے کے

لیے کیونکہ شیخ محبوب ہوتا ہے اور اس کا تصور باقی تمام خیالات کو دفع کر سکتا ہے اس لیے بعض حضرات کے ہاں تصور شیخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ بعد میں طبائع میں فساد آگیا اس لیے متاخرین مشائخ نے اس کے مفاسد پر نظر کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا۔ جن حضرات کے ہاں یہ تعلیم تھی تو وہ بھی اس کو مقاصد میں نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ذریعہ کے طور پر سمجھتے تھے کہ اس سے یکسوئی حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے تصور تک رسائی حاصل ہو۔ پس جب مقصود حاصل ہو جاتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ اس کی مثال مکان میں جھاڑو دینے کی طرح ہے کہ بجائے ایک ایک تنکا کو جمع کرنے کے سب کو جھاڑو سے جمع کر کے اس کو جلا دیا۔ پس تمام محبتوں کو تو شیخ کی محبت سے ختم کیا اور شیخ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا کیا تو مقصود تک جلد رسائی ہوئی۔

اس دور کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ شغل خواص کے لیے تو مفید ہے لیکن عوام کے لیے سخت مضر کیونکہ اس میں صورت پرستی تک بات جاسکتی ہے جو کہ شرک کا زینہ ہے۔ کثرت تصور سے بعض اوقات کوئی صورتِ مثالیہ ظاہر ہو سکتی ہے جو بعض اوقات محض خیال ہوتا ہے اور بعض دفعہ کوئی لطیفہ غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے جس کا بسا اوقات شیخ کو پتا بھی نہیں ہوتا لیکن سالک اس کو حاضر ناظر سمجھ کر اپنا نقصان کر سکتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنا اولیٰ ہے۔ اس کے مقاصد کو حاصل کرنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ شیخ کے لیے دعا کریں، اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے مانگیں، شیخ کے ملفوظات اور کتابیں پڑھے یا پھر اپنے پیر بھائیوں سے اس کا تذکرہ وغیرہ کرے۔ ان میں چونکہ یہ مفاسد نہیں اس لیے ان کا کوئی حرج نہیں اور فائدے میں کوئی کمی بھی نہیں ہوتی۔

2.1.2.2.2... عشق مجازی

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

متاب از عشق رد گرچہ مجازیت
کہ آں بہر حقیقت کارسازیت

یعنی عشق سے اعراض نہ کرو چاہے مجازی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ عشقِ حقیقی کے لیے سبب ہے۔ اس طرح مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

عاشقی گرزیں سرو گرزوں سرست

عاقبت مارا بدال شہ رہبرست

عشق اگر اس شے کا ہو یا اُس شے کا آخر ہمارے لیے محبوبِ حقیقی کے لیے رہبر ہے۔ یہ اور اس طرح کے بزرگوں کے واقعات کے بارے میں بغضِ لوگ بتاتے رہتے ہیں جس سے بعض لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان اصل بات کو چھپا دیتا ہے اور اس کا غلط مطلب دل میں بٹھا دیتا ہے حالانکہ تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بالکل صاف ہے۔ یہ اشعار جن بزرگوں کی طرف منسوب ہیں تو کیا اُن کے صرف یہی اشعار ہیں یا ان کے اور اشعار بھی ہیں۔ اگر ان اشعار میں ایسے مضامین ہیں جو کہ ان لوگوں کے غلط خیالات کا توڑ کرتے ہیں تو ان کے ان اشعار کو کیوں نہیں لیا جاتا مثلاً حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر

دلے باید کہ در صورت نمائی

و زیں پل زود کود را بگزرائی

یعنی یہ ضرور ہے کہ کہیں تو صورت ہی میں نہ رہ جائے کیونکہ یہ پل کی طرح ہے اور اس پل سے جلدی گزرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشقِ مجازی مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو ایک پل کی طرح ہے اور اس سے جلدی نکلنا چاہیے ورنہ عشقِ حقیقی سے محروم ہو جائے گا اور حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پائدار

عشق را باحی و باقیوم دار

یعنی فانی شے کے ساتھ عشق نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ توفانی ہے۔ عشقِ توحی و قیوم ذات کے ساتھ کرنا چاہیے کیونکہ وہ باقی ہے۔ اب ان دو بزرگوں اور دوسرے بزرگوں کے اقوال کی تطبیق (مطابقت کی کوشش) کیسے ہوگی تو وہ کوئی مشکل نہیں۔ بالکل آسان ہے۔ ان بزرگوں کی عشقِ مجازی کی تائید سے صرف یہ مراد ہے کہ اگر خدا نخواستہ کسی کو عشقِ مجازی ہو جائے تو پھر اس سے کام لینا چاہیے تاکہ اسی کو ہی عشق

حقیقی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس مردار کے ساتھ تو بالکل تعلق نہ رکھا جائے بلکہ ہو سکے تو تعلق توڑ دیا جائے اور اس سے جو سوز و گداز پیدا ہو، اس کو عشقِ حقیقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ سب سے بہتر طریقہ تو اس میں یہ ہے کہ اگر شیخِ کامل ہو تو اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ ورنہ وضو کر کے خوشبو لگا کر خوب دل کے ساتھ پانچ سو سے ایک ہزار تک ذکرِ نفی اثبات اس طرح کرے کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے ساتھ سوچے کہ میں نے اس مردار کی محبت کو دل سے نکال دیا اور ”إِلَّا اللَّهُ“ کے ساتھ یہ تصور کرے کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو داخل کیا۔ اس میں ضرب بھی ہو اور کچھ دیر یہ مراقبہ کرے کہ ایک بارُعب اور محبوب ہستی میرے دل سے اس مردار کی محبت کھرچ کھرچ کر نکال پھینک رہی ہے اور اس مردار کے ساتھ جو طبعی تبدیلیاں بڑھاپے اور بیماریوں کی صورت میں آسکتی ہیں ان کا تصور کرے کہ اس کی شکل بہت گندی ہو گئی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس میں کام کرنے پر توجہ کی جائے اور نتیجے میں جلدی نہ کریں۔ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہے کہ چاہے ساری عمر یہ کرنا پڑے تو یہ کروں گا۔ اس میں اگر جان بھی چلی جائے تو اعلیٰ درجہ کی شہادت ہے۔ ان دنوں کوئی حدیث کی کتاب یا کوئی بھی کتاب جس میں دوزخ اور عذابِ الہی جو نافرمانوں کو ہو گا کا ذکر ہو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

3.2.2.1.2... سماع

غزوہ خندق (جس کا نام الاحزاب بھی ہے) میں جب آپ ﷺ خندق کھود رہے تھے تو انصار اور مہاجرین کا دل بڑھانے کے لیے یہ اشعار پڑھے۔

اللَّهُمَّ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَةِ، فَأَغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ

صحابہ نے اس کا جواب دیا:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

[صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3873]

بعض اہل طریق کا یہ مذاق رہا ہے کہ جب اسبابِ عارضہ سے طبیعت میں کسل (بوریت) آئے تو اس کو دور کرنے کے لیے خوش آوازی کے ساتھ کسی اچھے کلام کو شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے سن لیتے ہیں۔ سماع کی بس یہی حقیقت ہے۔ جہاں تک اس کے ساتھ مزامیر کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کا صریح ارشادِ پاک ہے: ”بُعِثْتُ بِكَسْرِ الْعَرَامِيرِ“ [نیل الاوطار، ج 8، ص 113]

ترجمہ: ”میں مزامیر کو توڑنے کے لیے مبعوث ہوا ہوں“ بات یہاں پر ختم ہونی چاہیے تھی کیونکہ آپ ﷺ کے ارشادِ پاک کے سامنے کسی اور کی بات کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن چونکہ معاملہ یہاں ایسے نادانوں کے ساتھ ہے جن کی متاع ان کے سامنے لوٹی جا رہی ہے اور وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لیے چند ایسے بزرگوں کے ارشادات بھی لکھے جاتے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سماع سنتے تھے۔ ان میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا نام زیادہ مشہور ہے۔ آپ ہی کے ملفوظات جو باب نمبر 27 در نظامی میں مذکور ہیں میں یہ ملفوظ بھی ہے۔ فرمایا:

”سماع کی چار قسمیں ہیں۔ حلال، حرام، مکروہ اور مباح۔ اگر صاحبِ وجد کا میلان حقیقت کی طرف زیادہ ہے تو مباح، اگر مجاز کی طرف زیادہ ہے تو مکروہ، اگر بالکل حقیقت کی طرف ہے تو حلال اور اگر بالکل مجاز کی طرف ہے تو حرام۔“

مزید فرمایا:

”سماع کے واسطے کئی باتیں درکار ہیں جب یہ موجود ہوں تب سنیں۔ مُسْمِع، مُسْتَمِع، مسموع اور آلہ سماع۔ مُسْمِع یعنی گانے والا پورا مرد ہو، عورت یا مرد نہ ہو۔ مُسْتَمِع یعنی سننے والا بھی یادِ حق میں مشغول ہو، مسموع یعنی گانا فحش یا کسی کی جھوٹ ہو، آلہ سماع (یعنی مزامیر) نہ ہو تب یہ سماع مباح ہے۔“

حضرت کے مریدین میں ایک مرید نے کہا کہ مولانا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ عرض کیا کہ اس مجلس میں بندہ کا کوئی دوست نہیں تھا جو میری تائید کرتا اور گمان یہ تھا کہ اگر منع کرتا تو باز نہ آتے۔ حضرت

نے فرمایا: تم منع کرو وہ لوگ باز آئیں تو ٹھیک، نہیں تو تم وہاں سے اٹھ کھڑے ہو۔ بعض حضرات نے جن میں قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ سماع درددل کی دوا کے طور پر سنتے تھے اور اس کو تداوی بالحرام (حرام دوائی کے ذریعے علاج) میں داخل سمجھتے تھے۔ علامہ سنجرى رحمۃ اللہ علیہ کے بقول شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ سماع سنتے تھے لیکن باقاعدہ مجلس مرتب نہ کرتے، جب کوئی وقت خوش دیکھتے تو فرماتے کوئی ہے؟ اس وقت جو ہوتا، آتے اور کچھ کہتے۔ ہمارے شیخ مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کبھی کبھی طبیعت جب اس کے لیے مناسب سمجھتے تو فرماتے کوئی ہے جو کچھ سنائے؟ ایک دفعہ کوئی اور اچھا پڑھنے والا نہیں تھا میں موجود تھا میری آواز تو اچھی نہیں تھی لیکن پشتو کی ادائیگی اچھی تھی اس لیے میں نے رحمن بابا کے اشعار کتاب سے سنائے۔ اصل میں ہر چیز کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ آج کل تو بعض ظالموں نے حد کر دی مسجد میں بھی مزامیر کے ساتھ قوالی کرتے ہیں۔ مسجد کا تو ہندو بھی احترام کرتے تھے۔ (اللہ تعالیٰ بچائے) پیٹ کے دھندے نے انسان کو کس حد تک گرا دیا۔ یہی غالباً وہ وقت ہے کہ اس کی مباح صورتوں پر بھی پابندی لگائی جائے کیونکہ حفظ حدود کی لوگوں میں صلاحیت نہ رہی۔ جن فقہانے اس کی جائز صورتوں کو منع فرمایا تھا ان کی نظر مستقبل پر تھی اور جنہوں نے اس کو مباح سمجھا ان کی نظر حال پر تھی۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سماع مباح تھا لیکن قاضی ضیاء الدین سانمی رحمۃ اللہ علیہ اس کو روکتے تھے اور وجہ یہی تھی۔ آج لوگ خواجہ صاحب کے جائز سماع سے استدلال کر کے ناجائز سماع پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سماع ایک طاقت ور محرک ہے جو انسان کے اندر کی کیفیت کو باہر بہت قوت کے ساتھ منتقل کرتی ہے۔ اگر اس کو معرفت حاصل ہے تو اس کا عرفان ظاہر ہوگا اور اگر وہ باطن میں خبیث ہے تو اس کا جث بہت تیزی کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ آج کل لوگ خود دیکھیں کہ لوگوں پر کون سی چیز غالب ہے اس لیے سماع کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے تاکہ پردہ تو پڑا رہے۔ واللہ اعلم۔

2.2... توابع یعنی احوال (Side effects) کا بیان

طریقت کے بنیادی مقاصد کو حاصل کرنے کے دوران بعض کیفیات غیر اختیاری طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ ان کو احوال کہتے ہیں۔ یہ مقصود نہیں ہوتے۔ مقصود مقامات ہیں جو اختیار سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ احوال جیسے خود بخود حاصل ہوتے ہیں اس طرح خود بخود چلے بھی جاتے ہیں یعنی ان کے آنے پر اختیار نہ ان کے باقی رہنے پر اختیار۔ اگر یہ طاعت میں استعمال ہو جائیں تو محمود ہیں اور اگر خدا نخواستہ معصیت میں استعمال ہو جائیں تو مذموم۔ ان میں چونکہ بعض احوال میں بڑا مزہ ہوتا ہے اس لیے مبتدی کو ان سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ جیسے بچے کو ابتدا میں مٹھائی کھلائی جاتی ہے لیکن جب چل پڑتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا اس لیے ابتدا میں طفلان طریقت کو بھی شوق و ذوق اور رقت و گریہ کی طرف زیادہ مائل کیا جاتا ہے جس سے وہ چل پڑتے ہیں اس لیے ان کے لیے یہ محمود ہوتے ہیں لیکن جس وقت یہ نہ ہوں تو اس کا غم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ مقصود نہیں ہوتے۔

ہر عمل کا ایک مبدأ (origin) ہوتا ہے جو اس عمل کا محرک ہوتا ہے اور ایک منتہا جو عمل میں مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اہل مصیبت کے ساتھ مدد کرنا مقصود ہے پس اہل مصیبت کو دیکھ کر آدمی کا دل کڑھتا ہے اور اس میں اس کے ساتھ مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ تاثر ہے جو عمل کی وجہ بنا۔ پھر وہ عمل آدمی کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ مبادی سے پاک ہے اس لیے جو کرنا چاہتا ہے بغیر تاثر کے کر لیتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس کڑھنے کی کیفیت سے گزرے بغیر اہل مصیبت کی مدد کرتا ہے تو اس کے اخلاق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا عکس ہیں اور وہ زیادہ کامل ہے بمقابلہ اس کے جو اس کیفیت سے گزرنے کے بعد وہ عمل کرے۔ پس اگر کسی کو مقامات بغیر کیفیات کے حاصل ہیں تو وہ زیادہ کامل ہے۔ اس بات کو خوب سمجھنا چاہیے۔ احوال میں بعض وہ ہوتے ہیں جن میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا، ان کو احوال غیر محتملہ الضرر کہتے ہیں اور بعض میں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے ان کو احوال محتملہ الضرر کہتے ہیں۔

2.2.1... وہ احوال جن میں نقصان کا اندیشہ نہیں

2.2.1.1... اجابتِ دعا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا﴾ [البقرہ: 186]

ترجمہ: ”جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں“ اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”رَبِّ سَأَلْتُ اللَّهَ فِيهَا ثَلَاثًا فَأَعْطَانِي اثْنَتَيْنِ وَمَنْعَنِي وَاحِدَةً“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2175]

ترجمہ: ”میں نے اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں مانگی ہیں۔ جن میں سے اللہ تعالیٰ نے دو کو قبول کر لیا اور ایک کو قبول نہیں کیا۔“ دعا مانگنے کا حکم ہے اس لیے دعا ضرور کرنی چاہیے اور ایک حدیث شریف کے مطابق دعا کرتے وقت یہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتے ہیں جیسے آپ ﷺ نے فرمایا: ”أَدْعُوا اللَّهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ، وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءَ مَنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَدَيْهِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3479]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو، اس حال میں کہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل اور بے پروا دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔“ دعا کی قبولیت اونچے درجے کی حالت میں سے ہے لیکن ولایت کا ان پر انحصار نہیں کیونکہ مندرجہ بالا حدیث شریف میں آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک دعا منظور نہیں ہوئی۔ دعا کے بارے میں جاننے کے لیے دو باتوں کا جاننا لازمی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ علیم و قدیر ہے سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے لیکن ساتھ حکیم بھی ہے اور ہمارے اوپر ہم سے زیادہ مہربان ہے اس لیے اس نے جو ہمارے بارے میں فیصلہ کیا وہ ہمارے فیصلے سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم عاجز ہیں۔ اپنا بھلا برا نہیں جانتے۔

یہ باتیں اگر سمجھ میں آجائیں تو پھر دیکھیں خدا تعالیٰ نے ہمیں اختیار دیا کہ ہم جس چیز کو اپنے لیے بہتر سمجھیں اور وہ جائز ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ سے اس یقین کے ساتھ مانگ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میری دعا سنتے ہیں اور قبول فرماتے ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ

سب چیزوں پر قادر ہے اور جو ہم نے مانگا ہمیں وہ بھی دے سکتا ہے لیکن چونکہ ہمارے اوپر ہم سے زیادہ مہربان ہے اس لیے اگر ہم نے وہ چیز نہیں مانگی جو ہمارے لیے بہتر ہے تو وہ اس کے بدلے ہمیں وہ چیز دے دیتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہے۔ اس لیے کبھی کوئی آنے والی مصیبت اس کی وجہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کبھی ہمارے لیے اس کو آخرت میں ذخیرہ کر دیتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ جتنے اسباب اختیار کر سکتے ہیں ان کو اختیار کرنے کے بعد نتیجے کے لیے دعا کریں تاکہ جو اختیار میں نہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہو کیونکہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ ناکافی اسباب سے بھی دعا کی برکت سے کام کر دیتا ہے۔ پس اجابتِ دعا احوالِ رفیعہ میں سے ہے لیکن لوازمِ ولایت میں سے نہیں۔

2.2.1.2... الہام

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں عمر ہوں اور تم پر حکومت کرنے کی مجھے خواہش نہیں تھی لیکن مجھ کو متوفی (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اس کی وصیت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب میں اس کا القا فرمایا تھا۔

اگر بغیر کسی واسطہ کے دل میں کوئی بات حقائق میں سے آجائے یا تفسیر غیبی سے آواز آئے تو اس کو الہام کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا اثر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض اولیاء اللہ کا صاحب الہام ہونا منقول ہے۔ اس لیے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ صاحب الہام کو الہام کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی مخالفت گناہ تو نہیں لیکن بعض کیفیات کا اس سے زوال ہو سکتا ہے۔ جس سے بعض اعمال بھی متاثر ہو سکتے ہیں الا کہ صاحب الہام قوی الارادہ ہو اور شوق و ذوق کے بغیر بھی اعمال میں کوئی کمی نہ ہو۔ بعض دفعہ الہام کی مخالفت سے کوئی اور دنیاوی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک صاحب کو الہام ہوا کہ فلاں جگہ نہ جاؤ لیکن وہ چل پڑے تو وہ گرے اور پیر ٹوٹ گیا۔

2.2.1.3... رویائے صالحہ

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا: ”مَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ
الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6589]

ترجمہ: ”یا رسول اللہ ﷺ مبشرات کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صالح خواب اور یہی تفسیر ہے: ﴿لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [یونس: 64]

ترجمہ: ”ان کے لیے خوشخبری ہے دنیوی زندگی میں۔“ سچا خواب ایک حالت محمود ہے۔ حدیث شریف سے یہ ثابت ہے۔ محمد بن سیرین نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔

(1) حدیثِ نفس: یعنی اپنے خیالات۔

(2) وسوسہ شیطانی: یعنی شیطان خواب میں ڈرانے کے لیے مکروہ خواب دکھاتا ہے یا کسی جھوٹے زعم میں مبتلا کرتا ہے یا کسی خیر سے محروم کرنے کے لیے اہل خیر سے بدظن کرتا ہے یا اہل شرکی طرف متوجہ کرتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: “ إِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ الرُّؤْيَا يَكْرَهُهَا فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثًا وَلَا يَسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ثَلَاثًا وَلَا يَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِي كَانَ عَلَيْهِ۔” [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6041]

ترجمہ: ”تم میں کوئی برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین بار تھکڑا دے اور تین بار اعوذ باللہ پڑھے اور جس کروٹ پر تھا اس کو بدل دے۔“

(3) بشارت من اللہ یعنی مبشرات: جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی ملتی ہے کسی خیر کی خبر یا شر سے بچنے کے لیے کوئی خبر یا نظم دکھایا جاتا ہے۔

خواب کی تعبیر ہر ایک سے نہیں پوچھنی چاہیے کیونکہ خواب دو آدمیوں کے کشف پر مبنی ہے ایک خواب دیکھنے والے کا اور ایک تعبیر دینے والے کا پس جس کو خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں دیا گیا وہ کیسے خواب کی تعبیر دے سکتا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں کی خوابوں پر بہت نظر ہوتی ہے۔ جب اچھے خوابوں کی کمی ہو جاتی ہے تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دوری کی علامت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ یہ مقصود نہیں اگر اچھا خواب آئے تو وہ محمود ہو سکتا ہے لیکن مقصود تو نہیں۔ ہمیں فکر مقصود کی کرنی چاہیے۔ طریق میں جو چیز

اختیاری نہیں اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے لوگوں کو بیداری کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
من ہمہ ز آفتابم و ز آفتاب گویم

نہ میں رات نہ رات کا عاشق کہ کروں میں خواب کی باتیں
میں ہوں آفتاب کے ساتھ بس کروں آفتاب کی باتیں

یہ بھی جاننا چاہیے کہ خواب خود تو مؤثر نہیں البتہ کسی نیک اور بد عمل کا اثر ہو سکتا ہے اس لیے اعمال پر زیادہ توجہ دینا چاہیے خوابوں پر نہیں۔ بعض لوگوں کے لیے خواب البتہ تربیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی کا شیخ اس سے کام لے لے تو ٹھیک۔ خود سے اس کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھنا چاہیے۔

2.2.1.4... فراست صادقہ

رسول کریم ﷺ کے ارشاد مبارک ہے: ”اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3127]

ترجمہ: ”مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نورِ الہی سے دیکھتا ہے“ فراستِ صادقہ سچی انکل کو کہتے ہیں اور احوالِ رفیعہ میں سے ہے۔ یہ ایک قسم کا کشف ہے جو ذکر اللہ کی کثرت پر استقامت، حلال طعام اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے واقعات کے حقائق اور اشخاص کے حالات منکشف ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ کو ایک شخص کی زنا کی حالت ان کی آنکھوں سے معلوم ہوئی۔ حضرات صحابہ نے جہاں جہاں مسجدیں بنائی ہیں ان کا قبلہ بالکل درست نکلتا ہے حالانکہ نہ ان کے پاس قطب نما تھا نہ نقشہ وغیرہ۔ مشائخ کو بعض دفعہ اس فراستِ صادقہ کی برکت سے گفتگو اور خط وغیرہ سے مریدوں کا اندرونی حال معلوم ہو جاتا ہے۔

2.2.1.5... فنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات: 56]

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں“ اس کی تفسیر حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد تھے ”آئِ يَلِيْعِرْ فَوْنٌ“ لکھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت اور معرفت کے لیے جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیے بغیر یہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ ان تمام رکاوٹوں کا ختم ہونا تب ممکن ہے جب انسان اپنا سب کچھ محسوس غیر محسوس اللہ تعالیٰ پر قربان کرے یعنی اس کا نفس، عقل اور قلب کوئی ایسا کام جذبہ اور سوچ تحریک نہ کر سکے جو

اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے مقابلے میں آسکے اور یہ تب ممکن ہے کہ انسان کو صرف وہی یاد ہو اور کچھ یاد نہ رہے۔ اس حالت کو فنا کہتے ہیں۔ اس کا مکمل تعین محال ہے کیونکہ اس کا ادراک فنا کے خلاف ہے اور بغیر ادراک کے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ مقام حیرت و محویت محض ہے۔

جو ابتدائی جذب ہوتا ہے اس میں دل کی قدرے اصلاح ہو چکی ہوتی ہے اس میں انسان اپنے دل کے جذب کے زور پر سلوک کے بغیر بھی اپنی کچھ خواہشات کو دبانے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی قلبی طور پر اس قدر فنا اس کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس کے نفس کی اصلاح ابھی نہیں ہو چکی ہوتی تو واپس لوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے تو یہ جو ابتدائی جوش و جذبہ ہے اس کے ماند پڑتے ہی چونکہ ابھی نفس و روح آپس میں ملے ہوئے ہیں اس لیے وہ ارادہ جو اس کو جذب کے دوران حاصل ہوا ہے اپنے نفس کے ارادے کے مقابلے میں ختم ہو جاتا ہے تو سلوک کے ذریعے جو فنا حاصل ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کا نفس روح سے علیحدہ ہو جاتا ہے جس سے ارادے کی فنا حاصل ہو جاتی ہے جس میں پھر نفس واپس اس جگہ پر نہیں آسکتا ہی فنا کے کامل ہوتی ہے۔

ایک فنا جو شروع میں حاصل ہوتی ہے یعنی شروع کے جذب سے جو حاصل ہوتی ہے اور وہ ناقص ہوتی ہے اور عارضی ہوتی ہے اور اس پر بقا کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن

سلوک طے کرنے کی وجہ سے جب نفس اپنی جگہ یعنی عبدیت کے مقام پر آجاتا ہے تو پھر انسان کو اس کو دبانے کے لیے اپنے دل کے ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے عمل کے لیے جس فنا کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وقت کامل طور پر حاصل ہو جاتی ہے اس لیے واپس لوٹنے کا خطرہ بھی پھر نہیں ہوتا۔

2.2.1.6... بقا

اس حالت سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس کو واپس احساس لوٹا دے اور فنا کا اثر اتنا باقی رہے کہ اس کا ہر عمل فنا کے خط کشیدہ حصے سے مستفاد ہو تو یہ حالت بقا کہلاتی ہے۔ اس وقت سالک سب احکامات پر عمل کرتا ہے لیکن اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا۔ یعنی عبدیت محض اس کا خاصہ بن جاتی ہے۔

انسان کو دوام حاصل ہو جائے اللہ پاک کے احکام میں اور اطمینان حاصل ہو جائے اور تمکین حاصل ہو جائے تو یہ بھی ایک بقا ہے۔ یہ بھی اللہ پاک کا انعام ہی ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ پاک کی طرف سے قبولیت تامہ نصیب ہو جائے تو یہ بھی بقا کی ایک شکل ہے کیونکہ یہ اکثر فنا ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو بقا کہتے ہیں۔

2.2.1.7... وجد

بخاری اور مسلم کی روایت ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: ”اقْرَأْ عَلَى الْقُرْآنِ. قَالَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ اقْرَأْ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ أَنْزَلَ؟ قَالَ: إِنِّي أَشْتَهِي أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي. فَقَرَأْتُ النِّسَاءَ حَتَّى بَلَغْتُ ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ [النساء: 41]

قَالَ: أَمْسِكْ. فَإِذَا عَيْنَا تَذَرِ فَا نَ” [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4306]

ترجمہ: ”مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے قرآن مجید پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا میں آپ کو قرآن سناؤں آپ پر تو قرآن نازل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں قرآن مجید دوسرے سے سننا محبوب رکھتا ہوں۔ چنانچہ

میں نے آپ ﷺ کو سورہ نسا سنانی۔ جب میں ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ پر پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ ٹھہر جاؤ۔ میں نے دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ “حضرت اسماعیلؑ سے روایت ہے کہ سلف (صحابہؓ و تابعینؓ) میں سے تلاوت قرآن کے وقت نہ کسی پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی نہ کوئی چیختا تھا۔ صرف رویا کرتے تھے اور ان کے بدن پر روگئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھر خدا کی یاد کی طرف ان کے پوست اور قلوب نرم ہو جاتے تھے۔ جسم کا کسی کیفیت سے ایسا متاثر ہونا کہ اس کا اثر ظاہر ہو ”وجد“ کہلاتا ہے۔ حدیث شریف میں ”تَذْرِفَانِ“ کے الفاظ سے اس کی اصل ثابت ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ خواص کو اس درجے کا وجد نہیں ہوتا جتنا کہ عوام کو ہوتا ہے۔ وجہ اس کی قوت برداشت ہے۔ ایک تنکا تھوڑے سے پانی کے ساتھ بھی بہہ پڑتا ہے لیکن وہی پانی شہتیر کو نہیں بہا سکتا۔ اس کے برعکس آبشار شہتیروں کو بھی بہا کر لے جاتی ہے۔ اس لیے عوام تو معمولی وارد کا تحمل بھی نہیں کر پاتے اور چیخنا شروع کر لیتے ہیں۔ کالمین اتنے وارد کا تو تحمل کر لیتے ہیں لیکن وارد ہی اگر بہت تیز ہو تو پھر کالمین کو بھی تغیر ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ بیہوش ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؓ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے تھے، ایک شعر پر پوری مجلس کو وجد آگیا لیکن حضرت اسی طرح استقلال کے پہاڑ بنے بیٹھے رہے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ پر اثر نہیں ہوا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ میرے جسم کے کسی حصے کو ہاتھ لگاؤ۔ تو اس نے جب ہاتھ لگایا تو وہاں سے خون نکل پڑا۔ حضرتؓ نے فرمایا اندر تو تغیر ہوتا ہے لیکن اس کو باہر نہیں آنے دیتے۔ اگر سالک خود میں تغیر پیدا کر دے تو یہ تو اجد کہلاتا ہے جس سے اگر دنیا مقصود ہو تو گناہ ہو گا جیسے رومی رقص وغیرہ۔

اس میں پہلے مقصود (قصد کرنا) ہوتا ہے۔ پھر ورود (وارد کا طاری کرنا)، پھر شہود (مشاہدہ کرنا) پھر وجود (بے خود ہونا) اور پھر نمود (مستغرق ہو جانا)۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے دریا پر آنے کا قصد کیا پھر آپہنچا، پھر اس کو دیکھا، پھر اس میں کودا اور پھر ڈوب گیا۔

2.2.1.8... سُکَر کے بغیر وحدۃ الوجود

حدیث قدسی میں ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”يُؤَدِّيْنِي ابْنُ آدَمَ يَقُولُ: يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَلَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَإِنَّيَ أَنَا الدَّهْرُ أَقْلِبْ لَيْلَهُ وَنَهَارَهُ فَإِذَا اشْعَتْ قَبَضَتْهُمَا“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 6001]

ترجمہ: ”ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے وہ کہتا ہے: ہائے زمانے (وقت) کی نامرادی! تم میں سے کوئی ہائے زمانے کی نامرادی! (جیسا جملہ) نہ کہے۔ کیونکہ دہر (کامالک) میں ہوں۔ رات اور دن کو پلٹتا ہوں اور میں جب چاہوں گا ان کی بساط لپیٹ دوں گا“ زمانہ اگرچہ بالکل مختلف چیز ہے لیکن چونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا کامل تصرف ہے اس لیے اس کی نسبت اپنی طرف کر دی۔ پس سالک پر جب حق تعالیٰ کے وجود کی تجلی اتنی غالب ہو کہ ماسویٰ سے اس کو غافل کر دے تو وہ بزبان حال یہ کہتا ہے کہ صرف وہی موجود ہے۔ اسی کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ یہ ایک حال ہے جس کو بعض لوگوں نے فلسفہ بنا دیا ہے۔ نقصان اس سے یہ ہوا کہ لوگوں نے اس کی فلسفیانہ تشریحات شروع کیں حالانکہ یہ بالکل سادہ سی بات تھی کہ جب سورج موجود ہوتا ہے تو تارے ہرگز نظر نہیں آتے اس لیے اگر کوئی اپنا مشاہدہ یہ بتائے کہ صرف سورج موجود ہے تارے نہیں ہیں تو وہ اگرچہ حقیقت کے خلاف ہے لیکن کہنے والا بھی جھوٹا نہیں ہے وہ تو اس وقت یہی کہے گا۔ پس جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا ادراک ہی نہ ہو تو اس حالت کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ ایسا اگر سُکَر کی حالت میں ہو تو اس کو وحدت الوجود بالسُکَر کہتے ہیں۔ البتہ جو حقیقت سے واقف ہے وہ اس کی بات کی تاویل تو کرے گا لیکن اس کی بات سے تاروں کے وجود کا انکار نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ قرآن میں ان مخلوقات کا ذکر ہے۔ شریعت کا ایک مستقل نظام ہے جو انسانوں کے لیے ہے پس ان سارے حقائق سے کون ہوش و حواس میں انکار کر سکتا ہے۔ دل پر اثر تو ایک کار ہے۔ لیکن مخلوقات اور موجودات کی موجودگی ان کا باہمی تعلق اور متعلقہ احکامات کے ادراک کے ساتھ ہو تو اس کو وحدت الوجود بدون سُکَر کہتے

ہیں۔ اسی کا نام حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد میں وحدت الشہود رکھا (یعنی ایک کا مشہود ہونا) جو کہ اس کیفیت کی زیادہ بہتر تشریح ہے کیونکہ وحدت الوجود کی بعض غلط تشریحات اس کی فلسفیانہ انداز سے مروج ہو چکی تھیں جس سے سالکین کو غلط فہمی ہو سکتی تھی جو عقائد پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے کی اتنی تشریح پر عوام کو قناعت کرنی چاہیے۔ اس میں زیادہ خوض کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔

2.2.2... جن احوال میں نقصان کا اندیشہ ہے

2.2.2.1... استغراق

لوگوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا کہ یہ لڑکی جو آپ کے ساتھ جا رہی تھی آپ کی صاحبزادی ہے؟ آپ اس کو بہت غور سے دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ”ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ میری لڑکی ہے“ یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔ کیفیتِ استغراقیہ اصل میں فنا کی ہی ایک حالت ہے۔ اس میں انسان کو جن چیزوں کا علم ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر ہو جاتا ہے یا وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی کمال نہیں۔ اکثر یہ متوسطین کو ہوتا ہے ہاں اگر وارد بہت قوی ہو تو کالمیلن کو بھی ہو سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّقَ فِيهَا فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَّةٍ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّهِ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 675]

ترجمہ: ”میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اس میں طول دوں لیکن چونکہ بچے کے رونے کی آواز سن کر میں اپنی نماز میں اختصار کر دیتا ہوں اس امر کو برا سمجھ کر کہ میں اس کی ماں کی تکلیف کا باعث ہو جاؤں“ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق نہیں ہوتا تھا لیکن اگر اس استغراق سے اعمالِ شریعت میں کوئی کمی نہ آئے تو محمود ضرور ہے جیسا کہ حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خادم کے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ نماز کے وقت ان کو مطلع کر دیا کرے اور وہ آپ کے کان میں حق حق کی آواز لگا کر آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالتے۔ راستہ میں بھی حق حق کے نعرے سے مسجد کی طرف رہنمائی کرتے۔

2.2.2.2... تصرف و تاثیر المعروف بہ توجہ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے کہ:

”فَلَمَّا رَأَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قَدْ غَشِيَنِي ضَرَبَ فِي صَدْرِي فِضْفِضْتُ عَرَقًا
وَكَأَنَّمَا أَنْظَرُوا إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فَرَقًا.“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 21179]

ترجمہ: ”جب نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ گرانی مجھ پر غالب آگئی ہے۔ تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا، تو مجھے اتنا پسینہ آیا کہ میں بھیگ گیا اور مجھے ایسا لگا کہ میں ڈر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔“

یہ آپ ﷺ کا تصرف تھا۔ بعض لوگ فطرتاً صالح التصرف ہوتے ہیں گو صاحب نسبت نہ ہوں، اس کا طریق صرف ہمت کو صرف کرنا ہے دوسرے کی بھی ہمت اگر قوی ہو تو اس کو روک سکتا ہے۔ یہ مشق کے ذریعے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ توجہ متعارف اسی کو کہتے ہیں۔ اس سے بعض حضرات القانست کا کام لیتے ہیں۔ اس میں تمام طرف سے اپنے آپ کو یکسو کر کے مرید پر توجہ کی جاتی ہے۔

مسمریزم وغیرہ بھی یہی چیز ہے لیکن اس کا استعمال غلط جگہ پر ہے۔ ہمارے اکابر کو اس میں یہ اشکال ہے کہ گو اس کا استعمال صحیح بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی توجہ ہٹانا، چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی کیوں نہ ہو عجیب ہے کیونکہ یہ توجہ ہٹانا بالارادہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس کو متعارف توجہ دی جاتی ہے بعض اوقات وہ اسی پر ہی تکیہ کر لیتا ہے اور خود کام چھوڑ دیتا ہے حالانکہ یہ دیر پانہیں ہوتا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے گاڑی گڑھے میں پھنس گئی تو لوگوں کو ساتھ ملا کر دھکے سے گاڑی نکلائی۔ جب گاڑی نکلی تو اب تو اس کو خود چلانا چاہیے، نہ کہ گاڑی کو بند کر کے دھکا پر تکیہ کر کے بیٹھا رہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ لوگ اس کو بزرگی سمجھتے ہیں اس لیے شہرت ہو جاتی ہے جس کے کئی مفاسد ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس سے فاعل کے قلب کو جسمانی نقصان بھی ہو سکتا ہے جو آخر عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔

توجہ کا احسن طریقہ یہ ہے کہ مرید کے لیے دل سے دعائی جائے کہ اس کو نسبت القان

ہو جائے۔ یہ قلبی دعا توجہ کی طرح ہوتی ہے لیکن اس میں توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ ذکر بالجہر بیک آواز میں بھی توجہ کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ انفرادی طور پر ذکر میں نہیں چلتے اجتماعی ذکر میں چل پڑتے ہیں۔

جو توجہ ہے بس وہ قلبی دعا ہوتی ہے
جو کسی کے لیے کسی کی اک آہ ہوتی ہے

جو پھنسا ہو کسی حال میں، سے نکالنے کے لیے
کسی محسن کے دل کے لب سے ادا ہوتی ہے

اک توجہ ہے کہ لوٹ پوٹ کسی کو کر دے
یہ توجہ اس توجہ سے جدا ہوتی ہے

یہ توجہ کہاں مانگے سے ملا کرتی ہے
یہ توجہ اک تعلق سے پیدا ہوتی ہے

اسکو بازار کی دنیا میں نہیں لانا شبیر
یہ تو بس عشق کے میدان کی ندا ہوتی ہے

2.2.2.3... سُکّر

رسول کریم ﷺ سے جبرئیل علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”يَا مُحَمَّدُ! لَوْ رَأَيْتَنِي وَقَدْ أَخَذْتُ حَالًا مِّنْ حَالِ الْبَحْرِ فَدَسَّيْتُهِ فِي فِيهِ مَخَافَةٌ أَنْ تَسْأَلَهُ الرَّحْمَةَ“ [مسند احمد، حدیث نمبر: 2820]

ترجمہ: ”اے محمد ﷺ اگر آپ مجھے اس وقت دیکھتے تو تعجب فرماتے کہ میں دریا کے کپچڑ کو فرعون کے منہ میں ٹھونستا تھا اس اندیشہ سے کہ اس کو رحمت الہیہ نہ

پالیوے۔“ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا یہ عمل غلبہ سُکر سے تھا اور اس کی وجہ بغض فی اللہ تھا۔ واردِ غیبی کے ظاہری اور باطنی احکامات میں امتیاز کا اٹھ جانا سُکر کہلاتا ہے اور اس امتیاز کا موجود ہونا صحو کہلاتا ہے۔ اس کا غلبہ گو کہ اکثر ناقصین پر ہوتا ہے لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عبد اللہ بن ابی کے جنازہ کے بارے میں آپ ﷺ سے یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو تو اس کا جنازہ پڑھنے سے منع کیا گیا۔ بعد میں حالتِ صحو میں آنے پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی جرأت پر تعجب ہوا اور آپ ﷺ کا غزوہ بدر کے موقع پر یوں دعا فرمانا کہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہو گئی جو اس وقت میرے ساتھ ہے تو پھر آج کے بعد کوئی آپ کا نام نہیں لے گا۔

حالتِ صحو میں ضبط واجب ہے اور ایسی حالت میں اخفا کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اہل زمانہ فتنہ انگیز ہیں اور ایسے اُمور میں فتنہ بپا کر دیتے ہیں۔ خود فتنہ میں پڑنا یا دوسروں کو فتنہ میں ڈالنا درست نہیں اور غلبہ حال میں اگر کچھ ایسی باتیں ناکردنی سرزد ہو جائیں تو اشکِ ندامت سے اس کا تدارک کرنا چاہیے کیونکہ کامل سُکر کا یقین کرنا مشکل ہے اور استغفار ہر حالت میں مفید ہے۔ یہ اس لیے کہ مخلوق گمراہی سے بچ جائے جیسا کہ حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ کی زبان سے حالتِ سُکر میں جب یہ کلمہ ”سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَأْنِي“ نکلا اور صحو میں آنے کے بعد آپ کو جب بتایا گیا تو آپ نے نور فرمایا: اوہ! اس طرح کہنے سے تو میں مجوسی ہو گیا۔ میں زنار کو توڑتا ہوں اور کلمہ شہادت پڑھتا ہوں۔ حالتِ صحو میں اگر کسی نے اہل سُکر کے حالتِ سُکر کے کلمات کی نقل کی تو اگر وہ کلمہ گناہ کا ہے تو اس کو گناہ ہو گا اور اگر کلمہ کفر ہے تو اس سے کافر ہو جائے گا۔ اس لیے اس سے بہت احتیاط چاہیے۔

2.2.2.4... قبض و بسط

ابتدائے نبوت میں جب وحی میں توقف ہوا۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ

صدیقہ سے ایک طویل روایت میں مروی ہے کہ: ”فَتَرَا نَوْحِي فَتَرَةً حَتَّى حَزِنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا بَلَغْنَا حُرْنًا غَدًا مِنْهُ مَرَادًا لِيَكُنِي يَتَرَدَى مِنْ دُؤُوسٍ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ فَكَلَّمَا أَوْ فِي بَدْرٍ وَجَبَلٌ كَى يَلْقَى نَفْسَهُ مِنْهَا تَبَدَّى لَهُ جَدْرِيْلٌ فَقَالَ لَهُ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ حَقًّا، فَيَسْكُنُ لِيَذَلِكَ جَأْشُهُ وَتَقَرُّ نَفْسُهُ۔“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 6581]

ترجمہ: ”وحی کا سلسلہ کٹ گیا اور نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو اس کی وجہ سے اتنا غم تھا کہ آپ نے کئی مرتبہ پہاڑ کی بلند چوٹی سے اپنے آپ کو گرا دینا چاہا لیکن جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تاکہ اس پر سے اپنے آپ کو گرا دیں تو جبرائیل علیہ السلام آپ کے سامنے آگئے اور کہا کہ اے محمد! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو سکون ہوتا اور آپ واپس آجاتے“

دل پر خوش کن واردات کی کمی یا ختم ہونا جو کسی مصلحت سے ہو قبض کہلاتا ہے۔ حدیث شریف سے یہ ثابت ہے۔ محبوب کی جلالی تجلی یعنی اس کی عظمت اور استغنا کا ادراک دل پر غالب ہونے سے سالک کے دل پر جو بوجھ آجاتا ہے۔ اس کو قبض کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن کعب کے واقعہ تخلف عن التبوک میں اسے ضیق ارض اور ضیق النفس سے تعبیر کیا گیا۔ قبض کے مقابلے میں حالت بسط ہے جس میں آثارِ لطف و فضل سے دل مسرور ہوتا ہے۔

کبھی کبھی سوءِ اعمال سے بھی اعمال کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی فتور و ملال و کسل جس کو آج کل کے دور میں ڈپریشن کہتے ہیں یہ حالت پیش آتی ہے۔ اس لیے جب اس قسم کی حالت ہو تو سب کا حق ادا کیا جائے۔ یعنی توبہ اور استغفار کیا جائے۔ مفرحات کا استعمال کیا جائے اور اس حالت پر صبر کی نیت کی جائے۔ اپنے شیخ سے رابطہ رکھا جائے وہ جیسے تجویز فرمائیں اس پر عمل کیا جائے۔ اس دوران ”یُنَابِئِطُ“ کا ورد کثرت سے کرنا چاہیے۔ قبض میں منافع بسط سے زیادہ ہیں۔ اس سے کبر اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ تواضع اور عاجزی نصیب ہوتی ہے۔ گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب

ہوتی ہے۔ عبدیت کا کامل مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت جو اعمال کیے جاتے ہیں اس میں نفس کا ذرہ بھر حصہ نہیں ہوتا اس لیے اس کی قبولیت کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک شیخ پر قبض کی حالت طاری ہو گئی اور وہ سمجھنے لگا کہ میں شیطان ہوں۔ ایک اور شیخ کے پاس گئے، ان سے جب یہ کہا تو انہوں نے کہا کہ اگر شیطان ہو گئے ہو تو ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“ اس سے وہ اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ اپنے ایک مرید سے کہا کہ اب ایک شیخ نے بھی اس کی تصدیق کی اس لیے میں خود کشتی کرتا ہوں اور کر لی۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب فرمانے لگے جس شیخ کے پاس وہ گئے تھے میں سمجھتا تھا کہ وہ شیخ کامل ہے لیکن اس سے تو پتا چلا کہ کامل نہیں ناقص ہے۔ اگر میرے پاس آتا تو میں اس سے کہتا کہ کوئی بات نہیں شیطان بھی خدا کا بندہ ہے۔ اس سے اس کا قبض مائل بہ بسط ہو جاتا۔ اس لیے شیخ کامل کی رہنمائی اس موقع پر لازمی ہے۔

2.2.2.5... مشاہدہ

حضرت حنظلہ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے: ”نَمَكُونُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُدْكَرُونَ بِلَيْلٍ نَارٍ وَابْتِجَانَةٍ حَتَّى كَأَنَّ رَأْيَ عَيْنٍ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 7142]

ترجمہ: ”ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دوزخ و بہشت یاد دلاتے ہیں تو اس وقت ایسے ہوتے ہیں گویا کھلی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔“
مشاہدہ (حق) کی دو قسمیں ہیں:

- (1) ایک مشاہدہ تام جو کہ جنت میں ہو گا ان شاء اللہ۔
- (2) مشاہدہ ناقص یعنی استحضار تام یہ دنیا میں ہو سکتا ہے۔

اس سے مراد غلبہ استحضار ہے۔ اس کا مطلب وہ نہیں جو لغت میں عام طور پر لیا جاتا ہے یعنی تام سے مراد غلبہ ہے فقط۔ اگرچہ مشاہدہ تام کے سامنے یہ استحضار تام استتار کے زمرے میں آتا ہے لیکن اثر کے لحاظ سے یہ کافی ہے کیونکہ یہ دنیا دار الامتحان

ہے۔ اس میں اگر استحضارِ کامل بھی حاصل ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے۔ کیفیتِ احسان بھی تو اسی استحضار ہی کا نام ہے جس کا حدیث شریف میں حکم ہے۔ دنیا میں چونکہ انسان میں تحمل نہیں اس لیے اگر جتنی دائمی ہوتی تو استغراق کی حالت ہوتی۔ اس لیے جتنی کو استتار میں تبدیل کر لیتے ہیں تاکہ تحمل کر سکے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک محبوب نے عاشق کو دیکھا کہ یہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا ہے کہیں یہ شوق سے مر نہ جائے تو ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کو مشاہدے سے روکتے تو یہ صورت تو عاشق پر بہت سخت ہوتی اس لیے یہ تو نہیں کیا لیکن اس کو کسی کام سے بازار بھیج دیا پس عاشق خوش ہے کہ میں محبوب کے کام میں مشغول ہوں لیکن استتار کا مقصد بھی حل ہو گیا۔ پس یہاں بھی عاشق کو دوسرے کاموں کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس سے ایک گونہ استتار بھی ہو گیا تاکہ اس کا شوق معتدل رہے۔

2.2.2.6... کرامت

﴿قَالَ يَمْرَيْمُ أَنْ لَكَ هَذَا طَقَا لَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ [آل عمران: 37]

ترجمہ: ”زرکریا علیہ السلام نے پوچھا: مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ وہ بولیں: اللہ کے پاس سے۔“ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک طویل حدیث شریف میں روایت ہے کہ حارث بن عامر کی ایک دختر سے منقول ہے کہ: ”وَاللَّهِ لَقَدْ وَجَدْتُهَا يَوْمًا يَأْكُلُ قِطْفًا مِنْ عِنَبٍ فِي يَدِهَا وَانَّهُ لَمَوْثِقٌ بِالْحَدِيدِ وَمَا بِمَكَّةَ مِنْ تَمْرَةٍ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 3767]

ترجمہ ”اللہ کی قسم! میں نے ایک دن انگور کے ایک خوشہ سے انہیں انگور کھاتے دیکھا جو ان کے ہاتھ میں تھا حالانکہ وہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور مکہ میں اس وقت کوئی پھل بھی نہیں تھا۔“ کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو عاداتاً محال ہو اور نبی کے کسی تابعِ کامل کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ پس اگر وہ خرقِ عادت کام نہ ہو یا خرقِ عادت تو ہو لیکن نبی کے تابعِ کامل کے ہاتھ پر نہ ہو تو وہ استدراج ہے۔ استدراج ڈھیل دینے کو کہتے ہیں۔ جو گیوں وغیرہ کے کام اس زمرہ میں آتے ہیں۔ کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل

ہوتا ہے اس لیے اس کی کوئی حد نہیں۔ معجزہ اور کرامت میں صرف یہی فرق ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے ہاتھ پر ہوتا ہے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر۔ کرامت کی دو قسمیں ہیں۔

ایک حسّی یعنی عجیب کاموں کا واقع ہو جانا اور دوسرے معنوی یعنی توفیقاتِ عجیبہ کا نصیب ہو جانا۔ معنوی کرامت حسّی کرامت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

2.2.2.7... کشفِ الہی

ذات و صفاتِ الہی کے متعلق علوم و اسرارِ معارف کا کشف جس میں شیطان و وساوس کو شامل کر کے غلط سمت میں لے جاسکتا ہے یا ان کو فلسفیانہ رنگ میں لے جا کر سالک کو گمراہ کر کے تعلق میں مبتلا کر سکتا ہے۔ فلسفیانہ تصوف اسی سے بتا ہے۔

2.2.2.8... کشفِ کونی

جن چیزوں کو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے ان کا نظر آجانا، چاہے وہ گزشتہ یا آئندہ کے حالات و واقعات ہوں یا دور و نزدیک کی چیزیں۔ ان میں پڑ کر سالک اپنے مقصد سے دور جاسکتا ہے۔ احقر کو اپنے شیخ نے اس پر ڈانٹ دیا تھا کہ ”دور کرو دور کرو یہ راستے کے کھیل تماشے ہیں۔“ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال سے واضح کیا ہے کہ کوئی اپنی منزل پر ایسی گاڑی میں پہنچتا ہے جس میں کھڑکیاں سب بند ہیں اور سالک کورستے میں کچھ نظر نہیں آتا لیکن اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے دوسرا وہ کہ جس میں کھڑکیاں سب کھلی ہیں اور راستے میں دل کو لہانے والی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس میں بھی سالک اگر اپنی منزل پر پہنچ جائے تو پھر تو یہ بھی کامیاب ہو گا پہلے کی طرح لیکن اس میں احتمال ضرور ہے کہ سالک ان مناظر میں پڑ کر کہیں گاڑی سے اتر نہ جائے اور گاڑی چل کر اس کو چھوڑ نہ جائے تو ایسے سالک کو حرمان کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

2.2.2.9... وحدۃ الوجود سُکر کے ساتھ

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس کو وحدۃ الوجود کہا ہے وہ یہی ہے اس میں سالک کو ماسویٰ کا علم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے بعض ناگفتنی باتیں سالک کے منہ سے نکلتی ہیں جس میں وہ معذور ہوتا ہے۔

2.3... موانع

یوں تو جتنے بھی معاصی اور تعلقات ماسویٰ اللہ ہیں۔ سب اس راہ سلوک کے رہزن ہیں۔ مگر چند ضروری چیزوں کو بیان کیا جاتا ہے جن سے سالک کو بے حد پرہیز کرنا چاہیے۔ ورنہ ساری محنت بے کار و رائیگاں چلی جائے گی۔ یہ موانع مندرجہ ذیل ہیں۔ (1) تصنع (2) تعیل (3) حسن پرستی (4) مخالفت سنت (5) مخالفت شیخ

2.3.1... تصنع

”عَنْ أَسْمَاءَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلْمَتْشِعْ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبِي زُورٍ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4921]

ترجمہ: ”حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص ایسی چیز کا اظہار کرے جو اس کو نہیں ملی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے دونوں کپڑے جھوٹ کے پہنے ہوں۔“

چونکہ ”مَا لَمْ يُعْطَ“ ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نعمتوں کے لیے عام ہے۔ اس لیے جو شخص اپنا کوئی ایسا حال ظاہر کرنا چاہے جو اس کو حاصل نہیں۔ وہ بھی اسی زمرے میں آئے گا۔ تَصْنَعُ بَابِ تَفَعَّلَ سے ہے جس میں تکلف پایا جاتا ہے۔ لہذا ہر ایسا طریقہ جس میں تکلف کسی عادت یا خوبی کو اپنے میں ظاہر کیا جائے اسی زمرے میں آئے گا۔ پس جو تکلف بزرگوں کی طرح اپنے آپ کو ظاہر کرے گا وہ بھی اس وعید میں داخل ہو گا۔ اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ۔

تصوف تو محبت کا راستہ ہے

اس میں دعویٰ اور تصنع کا کہاں دخل! دوسری بات یہ ہے کہ تصنع مخلوق کی خوشنودی یا دنیاوی مفاد کے لیے کیا جاتا ہے جو کہ تصوف کے بنیادی مقاصد کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے ایسے لوگ بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس میں جھوٹے خواب، جھوٹے حال اور تمام ریائی افعال داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھ سمیت سب کو اس سے محفوظ فرمائے آمین۔ بعض لوگ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں کہ جیسے بزرگ کہتے تھے کہ ہم میں اصل کہاں، ہم تو نقل کرتے ہیں تاکہ مقررین کی نقل سے ہمارا بھی بھلا ہو جائے اور ہم قبول ہو جائیں۔ وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے اچھا عمل کرنے کی انتہائی کوشش کے بعد یہ بات محض دعویٰ کے رد میں ایک حال میں کہی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو اپنے اعمال اچھے نظر ہی نہیں آتے، چاہے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ پس وہ اپنے اعمال کو کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کو محض نقل قرار دیتے ہیں جو کہ ان کی غایت تواضع کی وجہ سے ہے۔ جب کہ یہاں پر عمل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ صرف دکھاوا ہے۔ کتنا فرق ہے ان میں اور ان میں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سالک بعض دفعہ بڑوں کی کتابوں سے ان کے احوال پڑھ کر ان سے متاثر ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو بھی یہ احوال حاصل ہو جائیں۔ پس وہ ان احوال کو مقصود خیال کر کے ان کی نقل شروع کر دیتا ہے۔ ان میں وہ اقوال و معارف جو ان حضرات کے احوال کے ثمرہ کے طور پر ان کی مبارک زبانوں پر جاری ہوئے، وہ یہ عوام سے بیان کرنے لگتا ہے۔ عوام کو چونکہ اصل اور نقل کی پہچان نہیں ہوتی، اس لیے وہ بھی ان کو اصل سمجھ کر اس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ جس سے اس کو بھی اپنے اوپر بزرگ ہونے کا خیال آنے لگتا ہے اور پھر اس کو نبھانے کے لیے بزرگوں کے احوال کی نقل اتار تار ہوتا ہے۔ جس سے وہ اس تصنع کی دلدل میں پھنستا رہتا ہے۔ اللہ بچائے شیطان کے اس جال سے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھ جاتا کہ احوال مقصود نہیں ہیں۔ مقامات مقصود ہیں اور سب سے اصل مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ تو یہ غلطی نہ کرتا۔ اس لیے مطالعہ بھی شیخ کے مشورے سے کرنا مناسب ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے بھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ فرمایا گیا ہے کہ دعا میں اگر رونانہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لے۔ چونکہ یہ بھی تصنع

ہے اور اس کا حکم ہے۔ لہذا تصنع ناجائز نہیں۔ یہاں بھی ان لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں رونے کی شکل بنانے سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے بتکلف عاجزی کا اظہار ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی مطلوب تو ہے۔ اس لیے یہ تکلف رونے کی شکل بنانا ایک ذریعہ ہو اللہ تعالیٰ کے رحم کو متوجہ کرنے کا۔ اس لیے یہ مستحسن ہے۔ لیکن اگر یہی تکلف رونا اس لیے ہو کہ لوگ میرا رونا دیکھ کر معتقد ہو جائیں۔ تو یہ گریہ ریائی بن جائے گا۔ جیسے شیعہ لوگ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ مذموم ہو گا۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ البتہ اس سے مشائخ کی ان باتوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے جو صحیح مشائخ اپنے مریدوں کی اصلاح کے لیے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مشیخت کا خیال رکھ کر بعض دفعہ بتکلف بعض امور انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو ہر طرح کے لوگوں کے مزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس سے مقصود اپنی بزرگی کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ عوام کو بدگمانی سے بچانا ہوتا ہے۔ تاکہ ان کو روحانی نقصان نہ ہو۔ یہ مدارات کے قبیل سے ہے اور مشائخ کے فرائض منصبی میں سے ہوتا ہے۔ لیکن بعض مشائخ ان سے بھی مبرا ہوتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے:

سوختن افروختن و جامہ دریدن
پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

2.3.2... تعمیل

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا

لَمْ يَعْجَلْ“ [سنن ترمذی، حدیث نمبر: 3387]

ترجمہ: ”رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک جلدی نہ کرے“

پس ایک مانع مجاہدات کے ثمرات میں عجلت اور تقاضا کرنا ہے کہ اتنے دن مجاہدہ کرتے ہو گئے اب تک کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو شیخ سے بد اعتقاد ہو جاتا ہے یا مجاہدہ ترک کر دیتا ہے۔ طالب کو سمجھنا چاہیے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو دفعتاً حاصل ہو جاتی ہو۔ مثلاً یہی شخص خود کسی وقت بچہ تھا۔ کتنے دنوں میں

جوان ہوا۔ پہلے جاہل تھا۔ کتنے دنوں میں عالم ہوا۔ غرض عجلت و تقاضا اپنے شیخ پر فرمائش ہے۔ جو بہت مضر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنے رہبر پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر کس و نا کس سے چارہ جوئی کرتا ہے اور پھر ہر جائی ہونے کی وجہ سے اس کے اوپر سے شیخ کی عنایت و لطف بھی جاتا رہتا ہے اور پھر مزید برآں یہ کہ جس چیز کو جلدی چاہتا ہے اس کا حصول اختیار سے خارج ہوتا ہے۔ جس سے اور بھی پریشانی بڑھتی ہے۔ غرض ظاہر اُو باطناً ہر طرح سے برائی ہی برائی ہاتھ آتی ہے۔

ہمہ کامی ز خود کامی بہ بدنای کشید آخر

نہاں کے ماند آں رازے کزد سازند مھظبا

(ترجمہ)

وصالِ یار کی چاہت میں جو تعجیل ہوئی مجھ سے

کیا الفت کا سامنے غیر کے اظہار اور ہوا رسوا

خود کامی سے مراد استعجال وصل ہے۔ یعنی محبوب کے وصال میں جلدی مچانے کا انجام یہ ہوا کہ ہر جگہ رسوائی ہوئی۔ کیونکہ مجھے اپنی محبت کا اظہار دوسروں سے کرنا پڑا، جس سے سب پر میری محبت کا راز فاش ہوا۔ راز اس کا یہ ہے کہ جب دوسروں سے اپنا حال کہے گا تو یہ ہر جائی بنے گا اور کوئی بھی اس کو خصوصیت کے ساتھ توجہ نہیں دے گا۔ اس لیے محروم ہو جائے گا۔ طریق میں سب سے مشکل کام اس چیز سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ کیونکہ اپنا مطلب ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے۔ لیکن دو باتیں سالک کے ذہن میں نہیں رہتیں جس سے وہ تعجیل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے اس لیے وقت سے پہلے اس کا حصول انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم ہے جو میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ ایک مطلوبہ کورس پورا کرے گا۔ اس کے امتحانات دے گا۔ جب کامیاب ہو گا تو ترقی کرتے کرتے ایک دن ڈاکٹر بن جائے گا۔ لیکن ایک طالب علم ڈاکٹروں کو دیکھ دیکھ کر چاہتا ہے کہ وہ بھی جلدی سے ڈاکٹر بن جائے اور اس کی تدبیریں کرنے لگے۔ وہ کبھی بھی ڈاکٹر نہیں بن سکے گا۔ کیونکہ وہ

پڑھائی پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ طریق میں طریقہ بتانا تو شیخ کے ذمہ ہے لیکن وصول شیخ کے اختیار میں نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ ہر سالک کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاملے پر موقوف ہے۔ پس اگر شیخ کی تعلیمات صحیح ہیں اور کسی سالک کو وصول نہیں ہو رہا تو گڑبڑ تو سالک میں ہوئی۔ یہ جس شیخ کے پاس بھی جائے گا۔ اپنے ساتھ یہ گڑبڑ لے کر جائے گا۔ لہذا وہاں بھی اس کو ناکامی ہوگی۔ دل میں یہ ہر شیخ سے بدگمان ہوتا جائے گا اور اصل برائی اس کے نفس میں ہوگی۔ پس اگر یہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست کر لے اور ایک شیخ کامل پر اعتماد رکھے تو کامیابی چند قدم پر ہے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

2.3.3... حسن پرستی

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے لیے بعض چیزوں کی محبت دل میں ڈال دی اور ان سے رکنے کا حکم دیا یہ جاننے کے لیے کہ کون حکم پر عمل کرتا ہے اور کون نہیں۔ ان میں سے ایک حسن بھی ہے۔ ہر شخص کو ہر حسین چیز اچھی لگتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں ہیں۔ ان حسینوں میں بعض کو دیکھنا جائز، بعض کو دیکھنا ناجائز ہے۔ پس جن کو دیکھنا ناجائز ہے۔ ان کی طرف دیکھنا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی ہے۔ جس کی وجہ سے سالک اپنی منزل سے بہت دور جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ بھی بڑے موانع میں سے ہے۔ ان میں عورتوں کی محبت اور امارد یعنی لڑکوں کی محبت آتی ہے۔ امارد کے ساتھ اختلاط زیادہ ہوتا ہے۔ نیز چونکہ یہ غیر فطری بھی ہے اس لیے ان کی محبت زیادہ بڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ ”جو اہر غیبی“ میں لکھا ہے کہ ایک شخص طواف کرتا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْكَ“

ترجمہ ”اے اللہ میں تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں“ کسی نے اس کا حال دریافت

کیا تو کہنے لگا کہ ایک بار کسی حسین امر د کو نظر شہوت سے دیکھا تو اسی وقت غیب سے ایک طمانچہ لگا جس سے آنکھ جاتی رہی۔

یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ ”رَأَيْتُ أَفَاتِ الصُّوفِيَّةِ فِي صُحْبَةِ الْأَحْدَاثِ وَمَعَانِشِرَةِ الْأَصْدَادِ وَرَفَقِ النَّسْوَانِ“ یعنی دیکھا میں نے آفاتِ صوفیا کو مردوں کے میل جول کرنے کو اور نا جنسوں سے ملنے کو اور عورتوں سے نرمی برتنے میں شہوت بالنسا سے زیادہ اشد مردوں (یعنی بے ریش) لڑکوں کی شہوت ہے۔ آج کل مردوں کے ساتھ ابتلا عام ہو رہا ہے۔ یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: بڑا ڈر مجھ کو اپنی امت پر قوم لوط کے فعل کا ہے۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: 2563]۔

دوسری حدیث میں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: سات قسم کے گنہگاروں پر ساتوں آسمانوں کے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ یہ لعنت بھی اس کثرت سے ہوتی ہے کہ ملعون کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ (ان میں سے اول) اغلام کرنے والا ملعون ہے آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ [الجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر: 8497]

عورتوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی بھی بعض اوقات بہت مہنگی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان ایسے مواقع کی تاک میں ہوتا ہے کہ کس طرح مرد اور عورت کے ہی باہم فطری میلان کو استعمال کر کے ان دونوں کو یا ان میں سے کسی کو گناہ میں مبتلا کرے۔ ایسے مواقع پر دل پر پتھر رکھنا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ مظفر قرینی فرماتے ہیں کہ نرمی اور مہربانی کرنے میں سب سے برا عورتوں سے نرمی اور مہربانی کرنا ہے۔ کسی نے شیخ نصیر آبادی سے کہا کہ لوگ عورتوں کے ساتھ ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو دیکھنے میں ہماری نیت پاک ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب تک جسم انسانی باقی ہے۔ امر و نہی بھی باقی ہیں اور تحلیل اور تحریم کے ساتھ مخاطب ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو شہوت سے پاک و صاف ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر نظر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ زنا آنکھوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں بھی بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں۔ حالانکہ نظر فعل کا مقدمہ ہے اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ حرام

فعل کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ میلان کے دو درجے ہیں۔ ایک تو مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف فطری میلان ہے۔ جو کہ طبعی امر ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ اسی پر تناسل کا سلسلہ قائم ہے۔ اس لیے اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی امید رکھنی چاہیے۔ الایہ کہ غلبہ حال ہو، جس کا انسان مکلف نہیں۔ دوسرا درجہ میلان کا اختیاری ہے کہ اپنے اختیار سے نامحرم کو دیکھنا یا نظر کو برقرار رکھنا وغیرہ۔ یہ چونکہ اختیاری ہے اس لیے اس سے رکنا بھی اختیاری ہے چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ البتہ مجاہدے سے آہستہ آہستہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کا انسان مکلف ہے اور اس پر اجر عظیم بھی ہے۔ ایک حدیث شریف ہے: ”الْتَّظْرَةُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ ابْلِيسَ مَسْمُومَةٌ، مَنْ تَرَكَهَا مِنْ خَوْفِ اللّٰهِ اَنَابَهُ اللّٰهُ جَلَّ وَعَزَّ اِنَّا نَجِدُ حَلَالَاتَهُ فِي قَلْبِهِ“ [المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر: 7875]

ترجمہ: ”نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔ جو اسے میرے خوف سے چھوڑ دے، تو میں اس کے عوض ایسا ایمان عطا کروں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا“

اصل بات یہ ہے کہ دنیا کی شہوت مذموم نہیں ہے۔ کیونکہ اسی سے تو تقویٰ کا حمام روشن ہے۔ لیکن اس کے تقاضے پر بالقصد عمل پیرا ہونا یا اس کا عزم کرنا مذموم ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”ہمارے ہاں رہبانیت نہیں۔ ہماری رہبانیت یہ ہے کہ شباب ہو، موقع ہو، دعوت ہو اور ہم کہیں کہ ہمیں اللہ کا ڈر مانع ہے“

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ایک بار اچھی طرح دیکھنے سے غبار نکل جائے گا۔ پھر طلب نہیں رہے گی۔ حالانکہ اس کی طرف جتنی توجہ کی جائے گی شہوت کی آگ مزید بھڑکے گی۔ حتیٰ کہ آخری مرحلہ پر ممکن ہے تھوڑی دیر کے لیے معاملہ سرد پڑ جائے، لیکن پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے اور طلب مزید بڑھ جاتی ہے اور اس میں شہوت بالنساء سے شہوت بالامارہ زیادہ اشد ہے۔ اول تو کوشش کرنی چاہیے کہ کسی ایسی جگہ جایا ہی نہ جائے جہاں پر اس قسم کا فتنہ ہو۔ اگر خدا نخواستہ بد نظری ہو جائے تو وہیں سے اس کا گلا گھونٹا جائے، یعنی اس سے توبہ کرنی چاہیے اور ذہن کو کسی اور چیز میں مشغول کیا جائے۔ ”اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ النِّسَاءِ“ اور ”اللّٰهُمَّ اِنِّیْ

أَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْأَمَارِدِ“ اس وقت کی دعا ہے۔ آج کل انٹرنیٹ وغیرہ پر یہ مصیبت عام ہے۔ اس کو کھولتے ہوئے بھی یہ دعا پڑھنی چاہیے اور ہمت کر کے اپنی نظر کی حفاظت کرنی چاہیے۔ چاہے کتنی ہی خطرناک صورت حال بن جائے، ہمت سے انسان چاہے تو بچ سکتا ہے۔ یہ دعا پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے اور ہمت کرنی چاہیے۔

یہی اصل علاج ہے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس عورت یا لڑکے کے وارثوں کو میری اس حرکت کا پتا چلے تو وہ کیا کہیں گے اور یہ کہ اگر میری بہن، بیٹی، بیوی، بیٹے وغیرہ کو کوئی اس نیت سے گھورے تو میں کیا کہوں گا۔ نیز اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز کا پتا ہے۔ اس کو میرے دل کے ارادے کا بھی پتا ہے۔ پس مجھے اپنے دل کی حفاظت کرنی چاہیے، جس کے لیے مجھے کان اور آنکھ پر پہرا بٹھانا چاہیے۔ اگر خدا نخواستہ کسی پر دل آجائے تو اس کا اصل علاج تو یہ ہے کہ اپنے شیخ کو فوراً اطلاع کی جائے تاکہ وہ اس کے لیے مناسب تدبیر کرے۔ اگر اس کے ساتھ شادی ممکن ہو تو اس کے ساتھ شادی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دل سے اس کا خیال نکال پھینکے۔ اس کی آسانی کے لیے اگر صحت اجازت دے تو ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا ذکر اس طرح کرے کہ ”لَا إِلَهَ“ میں یہ تصور کرے کہ اس کی محبت دل سے نکال پھینک رہا ہوں اور ”إِلَّا اللَّهُ“ میں یہ تصور کرے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں داخل کر رہا ہوں۔ یہ روزانہ ایک ہزار بار کرے۔ عفت پر ثابت قدم رہے۔ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس میں جان بھی چلی جائے تو اعلیٰ درجہ کی شہادت ہے۔

2.3.4... مخالفتِ سنت

تصوف کا ثمرہ وصول ہے اور وصول کا سب سے بڑا ذریعہ اتباعِ سنت ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ [آل عمران: 31] یعنی اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا چاہتا ہو تو وہ اتباعِ سنت کرے، اللہ تعالیٰ اس کو محبوب بنا لیں گے۔ پس اگر اتباعِ سنت وصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تو مخالفتِ سنت سب سے بڑا مانع ہو گا۔ افسوس! اس زمانے میں رسوم و بدعات کی بڑی کثرت ہے اور

تصوف بھی انہی رسوم و بدعات کا نام رہ گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے فرمایا حضور اکرم ﷺ نے: ”يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَتَّقِي مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمَهُ وَلَا يَتَّقِي مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمَهُ“ [شعب الایمان للبيهقي، حدیث نمبر: 1908] ترجمہ: ”معتزب لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ نہ باقی رہے گا اس میں اسلام سے مگر نام ہی نام اور نہ باقی رہے گا قرآن سے مگر صرف خطوط و نقوش (الفاظ اور حروف)“

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مخلوق پر سب راستے بند ہیں سوائے اس کے جو رسول کریم ﷺ کے راستہ پر قدم بہ قدم چلے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب ہم واصل ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں نماز روزہ کی حاجت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ واقعی واصل تو ہو گئے ہیں لیکن سقر کے ساتھ یعنی جہنمی ہو گئے۔ حضرت ابو العباس دینوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لوگوں نے ارکانِ تصوف کو توڑ دیا اور اس کے طریقوں کو تباہ کر دیا اور اس کے معنوں کو بدل دیا ایسے ناموں سے جو خود گھڑ لیے ہیں۔ طمع کا نام زیادت رکھا، بے ادبی کا اخلاص اور دینِ حق سے نکل جانے کو شطحیات اور بری چیزوں سے لذت لینے کو خوش طبعی اور خواہش کی پیروی کا امتحان اور دنیا کی طرف لوٹ آنے کو وصل اور بد خلقی کا رعب اور بخل کا جو انمردی اور سوال کا عمل اور بد زبانی اور بے ہودگی کا ملامت اور قوم کا یہ طریقہ نہیں تھا“

افسوس ہے کہ بعض لوگ صوفیوں کا لباس تو زیب تن کر لیتے ہیں۔ لیکن شاہی وردی کو اتار دیتے ہیں یعنی داڑھی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ جو اپنے آپ کو صوفی کہتے ہیں، ان کو شرم آنی چاہیے۔ آپ ﷺ نے زندگی میں ایک پارسی قاصد (جو بغیر داڑھی کے تھا) کو دیکھنا گوارا نہ فرمایا۔ تو جو اپنے آپ کو حضور ﷺ کا امتی کہتا ہے اور طریقت کا مدعی ہے۔ جو کہ تکمیل شریعت کا نام ہے۔ کیسے یہ سمجھتا ہے کہ بغیر اس اتباع سنت کے طریقت میں ترقی کر سکتا ہے۔ کاش! یہ بات سب کو سمجھ آ جائے۔ جس کو جتنا جلدی سمجھ آ جائے، بہتر ہے۔ اہل کشف کا کہنا ہے کہ اب بھی آپ ﷺ اس کے سلام کا جواب نہیں دیتے جس نے داڑھی نہ رکھی ہو یا اس نے داڑھی چھوٹی کی ہو۔

ایک مرید اگر ایسا کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی نقصان ہے۔ لیکن جو بزرگم خود شیخ ہو اور تابع سنت نہ ہو، اس کو ہر گز شیخ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ طریقت کے ڈاکو ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”اگر تم ایسا آدمی دیکھو جس کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہو امیں اڑتا ہے۔ اس سے دھوکے میں نہ آنا، جب تک یہ نہ دیکھو کہ وہ امر و نہی، حفظ حدود اور اتباع شریعت میں کیسا ہے؟“

تصوف اصل میں شریعت کے ظاہر پر عمل پیرا ہو کر اعمالِ قلب کو درست کرنے کا نام ہے۔ پس جہاں اصل مقصد فوت ہو رہا ہو اور صرف رسومات باقی رہیں۔ تو اس وقت اس کو چھوڑ کر حق کی تلاش لازمی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ”صوفیا کی نسبت تو بڑی بھاری نعمت ہے۔ لیکن ان کی رسومات کا کچھ بھی وزن نہیں“

مخالفتِ شیخ

تصوف میں اصلاحِ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ اتباعِ شیخِ کامل ہے۔ جیسا کہ اعمالِ ظاہر میں کسی امام کی تقلید سے نفس کے شر سے انسان بچ سکتا ہے اس طرح اعمالِ قلب میں نفس کے شر سے انسان اتباعِ شیخ سے ہی بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جس کو جس چیز کا ذریعہ بنایا ہے اس چیز کا حصول اس کی قدر دانی پر رکھا گیا ہے۔ مثلاً والدین ظاہری وجود کا ذریعہ ہیں اس لیے جو والدین کی قدر نہیں کرتے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ استاد علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جو استاد کی قدر نہیں کرتے ان کے علم میں برکت نہیں ہوتی۔ شیخ روحانی ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے تو جو شیخ کی قدر نہیں کرتے ان کی روحانی ترقی رک جاتی ہے۔

حضرت ابن منصور نے اپنے شیخ کے دل کو مگدّر کیا تھا۔ کیونکہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ ان کو اظہارِ حال سے روکتے تھے اور ان کو اس پر قادر سمجھتے تھے، لیکن ابن منصور اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتے تھے اور اپنا حال ظاہر کر دیتے تھے، اسی لیے انہوں نے کبھی چین نہیں پایا۔ یہاں تک کہ ان پر علمائے کرام نے کفر کا فتویٰ لگایا اور انجام کار سولی پر چڑھ گئے۔ چونکہ ابن منصور معذور تھے اس لیے آخرت میں تو معتب نہیں ہوں گے، لیکن زندگی میں تو مزید ترقی سے رک گئے۔ بعض دفعہ کوئی شیخ کی مخالفت تو

نہیں کرتا لیکن شیخ کی تعلیم کے علاوہ از خود مجاہدہ کرتا ہے۔ اس سے چند روز میں گھبرا کر وہ تھوڑا تعلیم کیا ہوا بھی چھوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو ایسا اتفاق ہوا۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ خُذُوا مِنَ الْأَعْمَالِ مَا تُطِيقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا وَإِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ مَا دَامَ وَإِنْ قَلَّ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 5523]

ترجمہ: ”لوگو! عمل اتنے ہی کیا کرو جتنی کہ تم میں طاقت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ (اجر دینے سے) نہیں تھکتا مگر تم (عمل سے) تھک جاتے ہو اور اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ پسندوہ عمل ہے جسے پابندی سے ہمیشہ کیا جائے، خواہ وہ کم ہی ہو۔“

شیخ سے محبت و عقیدت میں فتور ڈالنا یا اس سے بھی بڑھ کر شیخ کو رنجیدہ کرنا اور اس کو ایذا پہنچانا انتہائی نقصان دہ امر ہے۔ اس سے مناسبت باقی نہیں رہتی اور بدو ان مناسبت کے طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبت شیخ کے یہ معنی ہیں کہ شیخ سے مرید کو اس قدر موانست و عقیدت ہو جائے کہ شیخ کے کسی قول و فعل و حال سے مرید کے دل میں طبعی نکیر نہ پیدا ہو۔ گویہ عقیدت عقلی ہی ہو یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور یہی مناسبت بیعت کی شرط ہے۔ لہذا اس کا بہت اہتمام چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک یہ نہ ہو مجاہدات، ریاضات، مراقبات و مکاشفات سب بیکار ہیں۔ کوئی نفع نہ ہو گا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی مناسبت پیدا کر لی جائے، اس پر نفع موقوف ہے۔ اسی لیے جب تک پوری طرح مناسبت نہ ہو بیعت نہ کرنا چاہیے۔ جب پوری طرح محبت و مناسبت ہو جائے اس وقت پیر سے بیعت زیادہ نافع ہے۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ مخالفت اور چیز ہے اور اختلاف اور چیز ہے۔ کبھی اگر کسی فقہی جزیہ میں شیخ سے اختلاف ہو جائے اور دل میں شیخ کا ادب ہو اور ظاہر میں بھی کسی بے ادبی کا مرتکب نہ ہو، اگر شیخ کے ہاں اس قسم کے اختلاف کی وسعت موجود ہو تو اس سے نقصان نہیں ہوتا۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ طبعاً بعض مشائخ ادب اور اخلاص کے ساتھ اختلاف سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے اس وقت اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب

ایک دفعہ یہ خیال ہوا کہ مخالفتِ شیخ سے بہت نقصان ہوتا ہے اور ان کی طبعی سادگی اور اخلاص کی وجہ سے بعض دفعہ شیخ کے ساتھ اختلاف کا موقع بھی آجاتا تھا۔ اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، جو ان کے شیخ تھے، ان کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔ حضرت کو اطلاع ہوئی تو بلایا اور پوچھا کیوں نہیں آتے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت مخالفتِ شیخ سے عاقبت خراب ہو جاتی ہے اور میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا، اس لیے نہیں آتا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر شیخ ایسا ہی چاہتا ہو تو؟ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ پھر تو میں کروں گا تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پھر آیا کرو۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بہت محبت تھی، لیکن بعض مسائل میں ان کا مسلک وہ نہیں تھا جو حضرت کا تھا۔ انہوں نے نہ تو اپنا مسلک چھوڑا اور نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں بھی کبھی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی وقعت کم نہ ہوئی بلکہ بڑھ گئی۔ خود راقم کو اپنے شیخ مولانا اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رویتِ ہلال کے ایک مسئلے میں اختلاف تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے راقم کو کبھی اپنے نکتہ نظر سے رجوع کرنے کا نہیں فرمایا، بلکہ ایک دفعہ صراحت کے ساتھ اس عاجز نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھ بھی لیا کہ حضرت اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اس مسئلے میں اپنا نکتہ نظر چھوڑ دوں؟ حضرت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

2.4... خواطر (خیالات)

کسی بندے کے دل میں جو خیال آتا ہے اسے خاطر کہتے ہیں۔ وہ کبھی خیر ہوتا ہے کبھی شر ہوتا ہے۔ خیر کا خیال کبھی منِ جانب اللہ ہوتا ہے۔ کبھی فرشتے کی جانب سے، جس کا نام ملہم ہے اور کبھی شیطان کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور شر کا خیال شیطان کی طرف سے یا نفس کی طرف سے ہوتا اور کبھی کبھی حکمتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خیر وارد ہوتا ہے وہ اکراماً ہوتا ہے یا اتمامِ حجت کے لیے ہوتا ہے اور جو شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے وہ امتحاناً ہوتا ہے اور محنت میں ڈالنے

کے لیے ہوتا ہے۔ ملہم کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی دل پر وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا کام ہی یہی ہے۔ یہ مرشدِ ناصح کی طرح ہوتا ہے اور جس طرح شیطان انسان کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اسی طرح ملہم بھی انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ شیطان کی طرف سے جو خیر کا خیال ہوتا ہے وہ مکروہ و استدراج ہوتا ہے۔ یہ صورتاً تو خیر نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر شر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی اعلیٰ خیر سے روکنے کے لیے کسی جھوٹی خیر یا چھوٹی خیر میں مبتلا کرنا اور جو شر ہوتا ہے وہ انگوٹے کے لیے یا ذلیل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ نفس کی طرف سے جو شر ہوتا ہے وہ بے راہ روی کے لیے یا راہِ حق کے مجاہدات سے بچنے کے لیے ہوتا ہے۔ شیطان کی طرف سے آنے والے خیالِ خیر کی طرح اس میں بھی بہت کم خیر ہوتا ہے جیسے اخلاص کے بغیر شریعت۔

◆ شیطان اور نفس کے شر کے درمیان فرق

نفس کے اندر حکمتاً کچھ رذائل رکھے گئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ تقاضے اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان رذائل کو دباننا اصلاحِ نفس کہلاتا ہے۔ جب تک نفس کے کسی رذیلے کی اصلاح نہیں ہو چکی ہوتی ہے شیطان اس رذیلے کے مطابق وساوس ڈال کر انسان کو گناہوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کسی رذیلے کی اصلاح ہو جائے تو پھر شیطان کے لیے چونکہ میدان کھلا ہے تو کسی اور رذیلے کی بنیاد پر وساوس ڈالنے کا انتظام کرتا رہتا ہے۔ جس کی اصلاح سے ابھی تک سالک غافل ہوتا ہے اور اس میں وہ بہت مشتاق ہے۔ وہ سالک کے حالات اور احوال کے مطابق وسوسہ ڈالنے کی سعی کرتا ہے۔ اس وسوسے کے شر کو دفع کرنے کا ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور مباح کام میں مشغول کر دے جس کی طرف طبیعت جلدی مائل ہو سکتی ہو۔ پس اگر اس سے دھیان ہٹ جائے یا وسوسہ اتنا کمزور ہو جائے کہ گناہ نہ کر اسکے تو یہ نفس کے اس رذیلے کا اثر تھا۔ پھر اگر کسی اور صورت میں اس گناہ کا تقاضا دوبارہ ابھر آئے تو

یہ شیطان ہے جو گناہ کروانے پر تلا ہوا ہے اور اس کے لیے وہ اسی رذیلے کا پلیٹ فارم دوبارہ ایک مختلف شکل میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک مثال عرض ہے کہ احقر وضو ہونے یا قائم نہ رہنے کے شک میں مبتلا تھا۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے میرا علاج کیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک قسم نہ کھا سکو کہ میرا وضو نہیں ہے۔ اس وقت تک آپ کا پرانا وضو بحال ہے۔ کیونکہ شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا۔ اس میں کافی افادہ ہوا۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میں اتنا بے فکر ہو گیا ہوں کہ ممکن ہے اب اس کی وجہ سے واقعی بے وضو ہونے کی حالت میں وضو کے قائم ہونے پر کہیں یقین نہ کر بیٹھوں۔ حضرت نے فرمایا: خبردار! اس کی طرف توجہ نہ کرنا، کیونکہ شیطان اب دوسرے رخ سے وہی حملہ کر رہا ہے۔

◆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمتاً جو شر وارد ہوتا ہے اور شیطان کی طرف سے وارد شر کے درمیان فرق

جو شر اس طرح وارد ہو کہ نہایت مضبوط ہو اور ایک حالت پر رہے۔ نفس نہایت شدت سے اس کے کرنے کو بے قرار ہو، دفع کی تدبیریں کرتا ہو، مگر کسی طرح دفع نہیں ہوتا، وہ شرمناک ہے۔ اس کا علاج بغیر اس کے کچھ نہیں کہ حق تعالیٰ کے دربار میں اعانت اور توفیق طلب کرے اور تضرع اور گریہ و زاری رکھے اور اگر اس قدر شدت نہ ہو مگر ایک ہی حالت پر رہے۔ تو وہ نفس کی جانب سے ہوتا ہے اور اگر کسی گناہ کے بعد خطرہ شر قوت کے ساتھ پیدا ہو، تو وہ من جانب اللہ عاصی کی اہانت اور اس گناہ کی ظلمت کی سزا کے طور پر ہے اور اگر گناہ کے بعد شر کا خطرہ قوت کے ساتھ پیدا نہ ہو، اول ہی اول ہو، تو وہ شیطان کی جانب سے ہے۔ بشرطیکہ ذکر کرنے کی وجہ سے دفع ہو جائے یا کمزور ہو جائے۔ جیسا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”الْوَسْوَسُ الْخَنَّاسُ“ کی تفسیر میں فرمایا:

”الشَّيْطَانُ جَائِعٌ عَلَى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ، فَإِنْ سَهَا وَغَفَلَ وَسَوَسَ، وَإِذَا ذَكَرَ اللَّهُ حَنَسَ“ [الدر المنثور: 8/694]

ترجمہ: ”شیطان آدم کی اولاد کے قلب پر ٹیک جما کر بیٹھتا ہے۔ جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے اور اگر وہ شکر کی وجہ سے دفع نہ ہو، کمزور ہو تو نفس کی طرف سے ہے۔ جس طرح کہ شیطان نے خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۱۲﴾ [اعراف: 12] کہ ”آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا“ سے جس خطرے کا اظہار کیا، وہ نفس کی جانب سے ہی تھا۔ جس کا دفعیہ نہ اس کا ذکر کر سکا اور نہ حق تعالیٰ کی تلقین و تذکیر سے ہوا۔ اس کا سبب عبدیت اور عجز کا نہ ہونا تھا۔ نیز مشاہدہ سے محرومی تھی، وہ طاعت و عبادت محض جسمانی تعب تھا۔ قلبی مشاہدہ نہ تھا۔ کیونکہ مشاہدہ کے بعد حجت کا پیش کرنا نہیں ہوتا، بلکہ تعمیل میں تسلیم و رضا ہوتی ہے۔ یہ ”كَيْفَ وَلِمَا“ جیسے سوالات مشاہدے سے قبل ہی ہوا کرتے ہیں۔

◆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور ملہم کی طرف سے خیر کے خطرہ کے وارد ہونے میں فرق

جو خیر، قوت اور صمیم قلب کے ساتھ وارد ہو کہ اس پر بلا عمل کیے چین نہیں آتا یا وہ خیر مجاہدہ اور طاعت کے بعد ہو یا وہ خیر اصول اور اعمال باطنہ میں سے ہو تو وہ من جانب اللہ ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: 69)

ترجمہ: ”اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے۔ ہم ان کو ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے“ یہ آیت کریمہ اس پر دلیل ہے اور اگر ایسی قوت و حالت نہ ہو یا مجاہدہ ابتدائیہ کے بغیر ہو یا اعمال ظاہرہ کی کسی شاخ کے متعلق ہو تو وہ خیر ملہم کی جانب سے ہے۔

◆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور شیطان کی طرف سے خیر کے خطرہ کے وارد ہونے میں فرق

جو خیر کا خطرہ اس طرح وارد ہو کہ اس سے خوف کے بغیر ایسا نشاط محسوس ہو اور رکاوٹ کے بغیر عجلت ہو اور عمل میں انجام پر نظر نہ ہو، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ”الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ“ [شعب الایمان للسیبکی، حدیث نمبر: 4367]

ترجمہ: ”جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے“

حضرت حاتم الاصم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ اِلَّا فِي خَمْسَةٍ فَاِنَّهَا مِنْ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِطْعَامِ الضَّيْفِ وَتَجْهِيزِ الْمَيِّتِ وَتَزْوِيجِ الْبِكْرِ وَقَضَاءِ الدَّيْنِ وَالتَّوْبَةِ مِنَ الذَّنْبِ“ [احیاء علوم الدین، ج 2، ص 16]

ترجمہ: ”عجلت من جانب الشیطان ہے مگر پانچ مواقع میں، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہیں اطعام مہمان، تجہیز میت، نکاح باکرہ، ادائے قرض اور توبہ از گناہ“

اور اگر خیر کا خطرہ اس طرح وارد نہ ہو بلکہ خوف کے ساتھ نشاط ہو اور انجام پر نظر ہونے کے ساتھ ہو، تو وہ من جانب اللہ تعالیٰ ہے اور من جانب ملک بھی کہا جاتا ہے۔

◆ غور طلب

خوف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس خیر کے پورے طور پر ادانہ ہونے اور اس کو اس کے حق کے طریق پر ادانہ ہونے کا خوف ہو، نیز قبول ہونے نہ ہونے کا احتمال ہو کر خوف ہو۔ انجام پر نظر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے متعلق رشد و خیر اور ثواب آخرت میں دیکھنے اور امید رکھنے پر نظر ہو، کوئی دوسرا مطلب اور غرض نہ ہو۔

ملہم ایک فرشتے کا نام ہے جو آدمی کے دائیں جانب قلب پر جما بیٹھا ہوتا ہے اور وسوساں ایک شیطان کا نام ہے جو آدمی کے بائیں جانب قلب پر جما بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ”إِذَا وُلِدَ لِابْنِ آدَمَ مَوْوَدُّ قَرَنَ اللّٰهُ مَلَكًا وَقَرَنَ بِهِ شَيْطَانًا فَالشَّيْطَانُ جَائِمٌ عَلَى أُذُنِ قَلْبِ ابْنِ آدَمَ الْاَيْسَرِ وَالْمَلَكُ جَائِمٌ عَلَى أُذُنِ قَلْبِهِ الْاَيْمَنِ فَهُمَا يَدْعُوَانِهِ“ [تفسیر رازی: ج 5 صفحہ نمبر 5]

ترجمہ: ”جب بھی انسان کے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ پیدا فرماتے ہیں اور ایک شیطان بھی۔ شیطان تو اس کے قلب کے بائیں جانب بیٹھا جاتا ہے اور فرشتہ اس کے قلب کی داہنی جانب پر اور وہ دونوں اس کو اپنی اپنی طرف بلاتے ہیں“

شیطان کے خطرے اور شر کو دفع کرنے کے لیے معمولی توجہ، ذکر اور ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ کا ورد کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿۷۶﴾ [النساء: 76]

ترجمہ: ”(یاد رکھو کہ) شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔“

شیطانی وسوسوں کا اصل علاج یہ ہے کہ قطعاً اس طرف التفات نہ ہو۔ التفات نہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ ان وسوسوں پر مغموم و متفکر نہ ہو، بلکہ وسوسے سے پہلے جو حال تھا اسی طرح رہے۔ بلکہ وسوسے کا آنا اپنے مؤمن ہونے پر دلیل سمجھ کر مسرور ہو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے جب وسوسوں کے آنے پر اپنا حال ذکر کیا کہ یا رسول اللہ! اب تو ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اس سے تو ہمارا جل کر کوئلہ ہو جانا اچھا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”ذَلِكَ صَرِيحُ الْاِيْمَانِ“ [صحیح مسلم، حدیث نمبر: 357] کہ یہ کھلی ہوئی ایمان کی دلیل ہے۔ چور وہیں آتا ہے جہاں کچھ ہوتا ہے۔ البتہ ہوائے نفس کے دفع کے واسطے بہت ہی جدوجہد اور اس پر غیظ و قہر کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہوائے نفس کے دفع کے تین طریق ہیں۔

◆ شہوات سے روکنا

اس کی خواہشات بمقاومتِ نفس پوری نہ کی جائیں، جیسے کہ چوپایہ شہ زور کا جب چارہ روک دیا جاتا ہے یا کم کر دیا جاتا ہے تو نرم پڑ جاتا ہے۔ اس طرح خواہشِ نفس بھی آہستہ آہستہ مضحل ہو کر منقطع ہو جاتی ہے۔

◆ عبادت کا بوجھ اس پر لادنا

جس طرح گدھے پر جب چارے کی کمی کے ساتھ بوجھ زیادہ لاداجاتا ہے تو وہ پست و تابع اور منقاد ہو جاتا ہے۔ دولتی نہیں پھینکتا۔ اسی طرح نفس پر عبادتِ نافعہ کا بوجھ ڈالا جائے تو وہ رام ہو جاتا ہے۔ کشاکش سے نکل جاتا ہے۔

◆ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا اور اس کے سامنے عاجزی

جیسا کہ فرمایا ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي﴾ [یوسف: 53]

ترجمہ: ”واقعہ یہ ہے کہ نفس تو برائی کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے۔ ہاں میرا رب رحم فرمادے تو بات اور ہے (کہ اس صورت میں نفس کا کوئی داؤ نہیں چلتا“

جب ان تینوں امور کی پابندی کی جائے گی تو ان شاء اللہ تعالیٰ شریر نفس اطاعت گزار ہو جائے گا اور اس کے شر سے مامون و محفوظ رہے گا۔ مگر پھر بھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے، کہیں غفلت میں غلبہ نہ پالے۔

◆ حقیقتِ نفس

◆ انسان کے اندر ایک ہی قوت ہے جس سے کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کا نام نفس ہے۔ خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر۔ یہ نفس تین طرح پر ہے۔

(1) نفسِ اتارہ: یہ اکثر شر کی خواہش کرتا ہے اور نادم بھی نہیں ہوتا۔ اسی درجے کا نام ہوائے نفس ہے۔

(2) نفس لوّامہ: جو شر کی خواہش بھی کرے اور نادم بھی ہو۔

(3) نفس مطمئنہ: اکثر خیر کی خواہش کرے۔ اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

◆ خیال کی قسمیں اور ان کا حکم

ایک حدیث شریف میں ہے کہ: ”إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي

مَا حَدَّثَتْ بِهِنَّ أَنْفُسَهُنَّ مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ“ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4968]

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ان کے خیالات سے تجاوز فرما دیا ہے۔ جن کی وہ اپنے جی سے باتیں کرتے ہیں۔ جب تک کہ ان کو عمل میں نہ لائیں یا منہ سے نہ نکالیں“

دوسری روایت میں ہے: ”إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا وَسَّوَسَتْ

بِهِ صُدُورُهُنَّ، مَا لَمْ تَعْمَلْ، أَوْ تَتَكَلَّمْ“ [مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 63]

ترجمہ: ”بے شک اللہ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے درگزر فرمایا ہے جب تک وہ ان کے مطابق عمل نہ کر لیں یا بات نہ کر لیں۔“

◆ خیال کے مراتب پانچ ہیں۔

2.4.1... ہاجس

جب کوئی بات قلب میں ابتداً واقع ہوئی اور نفس نے اس کو ابھی لیا نہیں۔ اس کو ہاجس کہتے ہیں۔

2.4.2... خاطر

اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور اول ہی سے اس کو دفع کر دیا تو اس کے بعد والے حالات سے بچ گیا اور اگر نفس اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے فی الحال نہیں باندھا، اس کو خاطر کہتے ہیں۔

2.4.3... حدیثِ نفس

جب نفس کرنے یا نہ کرنے کے برابر درجہ میں منصوبہ باندھنے لگے اور ان سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو تو اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

تینوں کا حکم: یہ تین درجے ایسے ہیں کہ اگر یہ شر میں ہے تو اس پر عتاب نہیں ہے اور اگر یہ خیر میں ہے تو اس پر ثواب نہیں ہے۔ پھر جب اس فعل کو کر لیا تب اس فعل پر عتاب یا ثواب ہو گا۔ صرف ہاجس، خاطر اور حدیثِ نفس پر عتاب نہ ہو گا۔

2.4.4... ہم

جب نفس میں فعل یا عدمِ فعل کا منصوبہ ترجیحِ فعل کے ساتھ ہونے لگا۔ لیکن وہ ترجیح قوی نہیں ہے بلکہ مرجوح ہے۔ جیسا کہ وہم ہوتا ہے۔ اس کو ہم کہتے ہیں۔ اس پر ثواب بھی ہوتا ہے اگر وہ خیر میں ہے اور عتاب بھی ہوتا ہے اگر وہ شر میں ہے۔ البتہ اس مرتبے میں آدمی کے واپس ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

2.4.5... عزم

پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا۔ یہاں تک کہ جازمِ مصمم بن گیا تو اس کو عزم کہتے ہیں۔ اس پر بھی اس کے مطابق ثواب ہوتا ہے اگر خیر میں ہے اور عتاب ہوتا ہے اگر شر میں ہے۔



اجازت

◆ شرائطِ اجازت

شیخ طالب کو جب مجالست و مکاتبت وغیرہ سے مسلسل اصلاح کی طرف باستقلال و استقامت متوجہ پاتا ہے اور وہ اس راہِ سلوک کو طے کرتا ہو اسیر الی اللہ تک پہنچ جائے تو اس وقت شیخ اس مرید طالب کو خلافت بیعت سے نوازتا ہے۔ سیر سلوک دو قسم پر ہے سیر الی اللہ و سیر فی اللہ۔ جب دل کو ایک خاص حد تک پاکی حاصل ہو جائے اور ایک خاص حد تک رذائل دب جائیں جتنے کہ شریعت پر چلنے کے لیے ضروری ہیں۔ تو شیخ اس کو افادۂ عام کی اجازت دے سکتا ہے۔

مرید کی جتنی جتنی اصلاح ہوتی جاتی ہے اتنا اتنا اس کو اپنے اوپر خشیت کے طاری ہونے کی وجہ سے خطرہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس اثنا میں شیخ جب مرید کو اجازت دیتا ہے اور مرید کو خلافت کے شوق کی بیماری نہ ہو تو اس کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور وہ صرف امتثالِ امر کے طور پر اس کو قبول کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں اپنے آپ کو اس کا قابل نہیں پاتا۔

◆ غور طلب

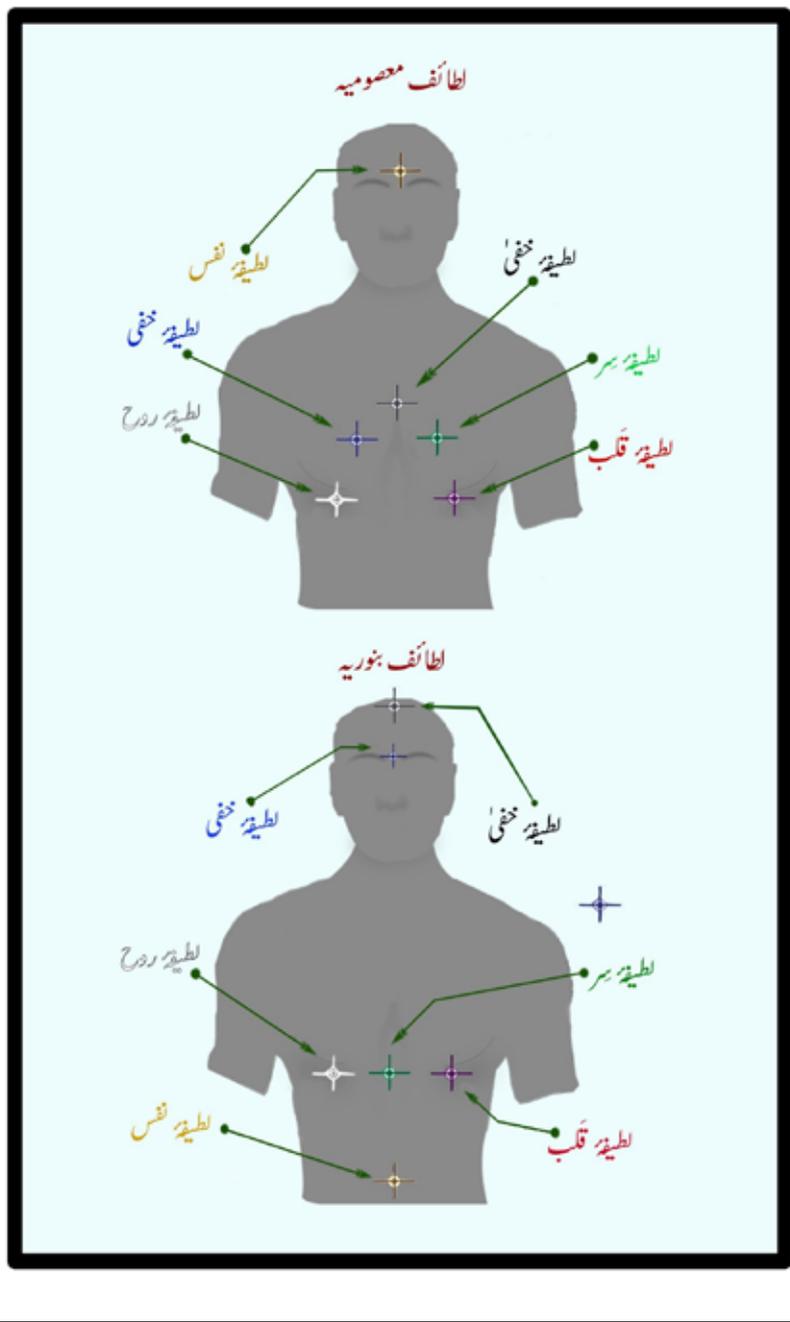
شیخ مرید کو سیر الی اللہ کے مرتبے پر پہنچنے کے بعد ہی مجاز بیعت کر دیتا ہے اور کبھی سیر فی اللہ کے حصول کا انتظار کرتا ہے۔ یہ مرید کے حال اور شیخ کے ذوق پر منحصر ہے۔

◆ خلافت کا شوق ایک خطرناک گڑھا

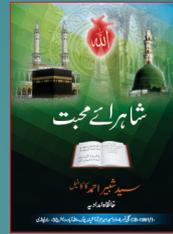
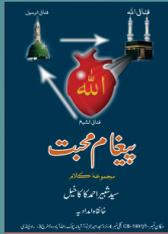
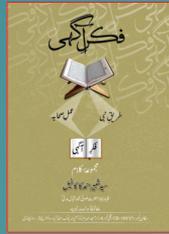
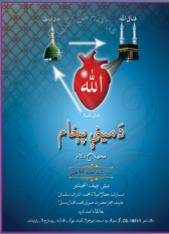
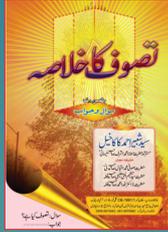
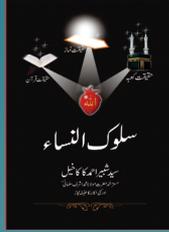
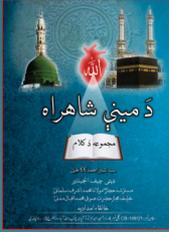
شیخ کو جب بھی شرح صدر ہو، وہ خلافت دے سکتا ہے جس کے لیے ہر شیخ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اپنا معاملہ ہے۔ البتہ مرید کے دل میں اگر خلافت کا خیال ہے تو یہ اس راستے کی بہت بڑی گھاٹی ہے جس سے جو بھی بچ جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ ایک دفعہ ایک بزرگ سے کوئی مرید بیعت ہوا اور خانقاہ میں رہنے لگا۔ حضرت

نے بڑی کوشش کی کہ اس کا کام چل پڑے، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس بزرگ کو فکر ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ میں اس کو آگے بڑھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں، لیکن اس کو فائدہ نہیں ہو رہا۔ بالآخر انہوں نے اس مرید سے پوچھا کہ آپ کی میرے پاس آنے کی کون سی نیت تھی؟ اس نے کہا کہ حضرت ماشاء اللہ آپ کا فیض چار دانگ پھیل رہا ہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ اگر یہ نعمت مجھے بھی میسر ہو جائے تو اس کو پورے عالم میں پھیلانے کی سعی کروں۔ حضرت نے فرمایا اوہ! (بڑا بننے کی خواہش کا) کتنا یہاں لیٹا ہوا ہے۔ نکالو اس خیال کو دل سے، ابھی سے تو نے پیر بننے کی ٹھانی ہے۔ اس سے توبہ کر آئی، پھر اس کو فائدہ ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ جب بھی کوئی کسی سے بیعت ہو تو محض اپنی اصلاح کے لیے ہو، کسی اور کی اصلاح کے لیے نہ ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہسپتال میں جو بیمار ہوتا ہے وہ ڈاکٹر کے پاس آیا ہو تو اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں کے علاج کی فکر میں ہو۔ روحانی رذائل تو جسمانی بیماریوں کے مقابلے میں زیادہ شدید ہیں۔ اس میں دوسروں کی فکر اپنی فکر سے کسی کو کیونکر غافل کرے۔

* ♦ * ● *



حضرت اقدس شیخ سید شبیر احمد کا کاخیل صاحب دامت برکاتہم کی دیگر تصوف کی کتب



ویب سائٹ : w.w.w.tazkia.org

اردو، انگریزی، پشتو اور عربی میں عقائد، فقہ اور تصوف سے متعلق بہت سی معلومات کا خزانہ

(ہفتہ) سلوک سلیمانی و تربیت السالک (پیر) اصلاح و تربیت سے متعلق ہواوں کے جوابات (مکمل) درسِ شنوی (بدھ) درسِ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (جمعت) درسِ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مجلس درود شریف مندرجہ بالا بیانات بعد از نماز مغرب منعقد ہوتے ہیں
(پیر) پشتو بیان بعد از نماز عصر (اتوار 1 بجے دن) خواتین کیلئے اصلاحی بیان (اتوار بعد از نماز مغرب) فرضِ علم (اتوار بعد از نماز عشاء) انگلش لیکچر (جمعۃ المبارک) کو مجلس درود شریف، ختم قرآن و دعا (بعد از نماز عصر) اصلاحی جوڑ (ہفتہ عصر سے اتوار کی اشراق تک) ہوتا ہے۔

فون کا وقت دن 2 تا 3 بجے روزانہ، جمعہ کے علاوہ
تمام بیانات ویب سائٹ tazkia.org پر بھی براہ راست سنے اور ڈاؤن لوڈ کیے جاسکتے ہیں

فون نمبر: 051-5470582 / 03325289274